نذرِ حکیم

[ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی شخصیت اور افکار پر تحریروں کا مجموعہ]

مرتب: ڈاکٹر رفیعہ حسن

Institute of Islamic Culture
ادارہ ثقافت اسلامیہ
Lahore - Pakistan

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نذرِ حکیم

نذرِ حکیم

(ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی شخصیت اور افکار پر مضامین کا مجموعہ)

پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ حسن

(مرتب)

ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ

۲۔ کلب روڈ، لاہور

فون: 042-36305920، ای میل: iic-lhr@hotmail.com

جملہ حقوق محفوظ ہیں

عنوان:	نذرِ حکیم
مرتبہ:	ڈاکٹر رفیعہ حسن
ناشر:	قاضی جاوید ناظم ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ
اشاعتِ اوّل:	2016ء
مطبع:	مکتبہ جدید پریس، لاہور
تعداد:	500
قیمت:	-/500 روپے

یہ کتاب اکادمی ادبیات پاکستان اور حکومتِ پنجاب کے محکمہ اطلاعات و ثقافت کے تعاون سے شائع کی گئی ہے۔

ترتیب

○ پیش لفظ از ڈاکٹر رفیعہ حسن 13

1۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم — ڈاکٹر آفتاب احمد 17

2۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم — محمد عبداللہ قریشی 27

3۔ بزرگ خوش گفتار — محمد باقر 34

4۔ خلیفہ صاحب کی ممتاز شخصیت — قاضی ایم۔ اسلم 42

5۔ رفیقِ زندگی کی یاد میں — بیگم خدیجہ حکیم 51

6۔ والد محترم کی یاد میں — ڈاکٹر رفیعہ حسن 57

7۔ خلیفہ صاحب — بیگم جہاں آرا شاہنواز 63

8۔ خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا حیدر آباد دکن میں قیام — پروفیسر ہارون خاں شیروانی 69

9۔ خلیفہ عبدالحکیم اور عثمانیہ یونیورسٹی — محمد حبیب اللہ رشدی 75

10۔ خلیفہ عبدالحکیم ایران میں — ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی 89

11۔ خلیفہ عبدالحکیم کی یاد میں — مولانا محمد حنیف ندوی 98

12۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم — پروفیسر ایم ایم شریف 105

13۔ مرد درویش — پروفیسر شیخ محمود احمد — 109

14۔ اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو — ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — 115

15۔ خلیفہ مرحوم کی زندگی کا یادگار دور — ڈاکٹر انور اقبال قریشی — 120

16۔ خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کا آخری دن — ممتاز حسین — 126

17۔ پاکستان کا ایک ممتاز فاضل — ڈاکٹر ایرک بتھ من — 131

18۔ پاکستان کا ایک عظیم ترین فرزند — ڈاکٹر کچکینہ کاظمی — 133

19۔ ایک باکمال شخصیت — شیخ علی کاشف الغطاء — 138

20۔ ایک بلند پایہ مفکر — ڈاکٹر فان گرون بام — 140

21۔ یادگار ملاقاتیں — ڈاکٹر جوزف شاخت — 142

22۔ خلیفہ عبدالحکیم کی صداقت شعاری — ڈاکٹر لوئی مارسینو — 143

23۔ ایک روشن خیال مفکر اسلام — ڈاکٹر صادق رضا زادہ شفق — 145

24۔ خلیفہ عبدالحکیم کے مذہبی خیالات — فری لینڈ کے۔ ایبٹ — 147

25۔ ڈاکٹر خلیفہ کے حکیمانہ تصورات — ڈاکٹر عزیز ایس۔ عطیہ — 149

26۔ خلیفہ صاحب کی علمی زندگی — پروفیسر حمید احمد خان — 151

27۔ خلیفہ صاحب کی علمی خدمات — بشیر احمد ڈار — 156

28۔ مرحوم ڈاکٹر خلیفہ کا حکیمانہ ادب — ڈاکٹر سیّد عبداللہ — 163

29۔ خلیفہ عبدالحکیم: ایک مفکرِ اسلام — محمد عثمان — 169

30۔ خلیفہ صاحب کا فلسفۂ مذہب — محمد انور خلیل — 180

31۔ خلیفہ عبدالحکیم کے مذہبی عقائد — محمد مظہر الدین صدیقی — 204

32۔ خلیفہ صاحب کی نظر میں
اسلام اور ارتقاء کا توافق — کمال محمد حبیب — 211

-33	روشن خیال مفکر	محمد جعفر پھلواروی	226
-34	فکرِ حکیم پر ایک نظر	قاضی جاوید	231
-35	مذہب کا پیرایۂ بیان اور خلیفہ عبدالحکیم کا نظریہ	زاہد حسین	245
-36	خلیفہ عبدالحکیم کا فلسفۂ عمومی	عبدالحمید کمالی	266
-37	خلیفہ عبدالحکیم: ایک محترم اور ہر دلعزیز استاد	پروفیسر محمد رضی الدین صدیقی	289
-38	خلیفہ عبدالحکیم مرحوم	خواجہ بدر	292

ہمارے مضمون نگار

1۔	ڈاکٹر آفتاب احمد	مصنف اور بیوروکریٹ
2۔	محمد عبداللہ قریشی	لاہور کے ادبی جریدہ 'ادبی دُنیا' کے مدیر اور مصنف رہے۔
3۔	محمد باقر	یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے پرنسپل رہے۔
4۔	قاضی ایم۔ اسلم	گورنمنٹ کالج لاہور اور پنجاب یونیورسٹی میں فلسفے کے استاد رہے۔
5۔	بیگم خدیجہ حکیم	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی شریک حیات
6۔	ڈاکٹر رفیعہ حسن	ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی صاحب زادی، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اطلاقی نفسیات کی چیئرپرسن رہیں۔
7۔	بیگم جہاں آرا شاہنواز	لاہور سے تعلق رکھنے والی سیاسی اور سماجی کارکن
8۔	پروفیسر ہارون خاں شیروانی	مورخ، مصنف اور محقق ہیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبہ تاریخ کے صُدر رہے۔
9۔	محمد حبیب اللہ رشدی	عثمانیہ یونیورسٹی، حیدرآباد دکن میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے ایک شاگرد

10- ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی — تہران کے پاکستانی سفارت خانہ میں پریس کاؤنسلر رہے۔

11- مولانا محمد حنیف ندوی — عالم، مصنف، ادارہ ثقافت اسلامیہ کے رفیق رہے۔

12- پروفیسر ایم ایم شریف — علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر، آل انڈیا فلاسفیکل کانگریس کے صدر، پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے صدر اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر رہے۔

13- پروفیسر شیخ محمود احمد — ماہر معاشیات، آزاد کشمیر، گورنمنٹ کالج، راولاکوٹ کے پرنسپل رہے۔

14- ڈاکٹر عبدالسلام خورشید — پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ صحافت کے چیئرمین رہے۔

15- ڈاکٹر انور اقبال قریشی — ماہر معاشیات، حیدر آباد دکن کی جامعہ عثمانیہ میں استاد رہے۔

16- ممتاز حسین — بیوروکریٹ، نیشنل بنک آف پاکستان کے مینیجنگ ڈائریکٹر اور اقبال اکادمی پاکستان کے نائب صدر رہے۔

17- ڈاکٹر ایرک بتھ من — سکالر، واشنگٹن کی مسلم مسیحی تعاون کی کمیٹی کے رکن رہے۔

18- ڈاکٹر کچکینہ کاظمی — ایران کی ایک علم دوست خاتون

19- شیخ علی کاشف الغطاء — عراق کے ایک نامور عالم اور مجتہد

20- ڈاکٹر فان گرون بام — کیلی فورنیا یونیورسٹی، امریکہ میں تاریخ کے پروفیسر اور ایسٹ سنٹر کے ڈائریکٹر رہے۔

21- ڈاکٹر جوزف شاخت — ہالینڈ کی لائیڈن یونیورسٹی سے تعلق رکھنے والے معروف مستشرق

22- ڈاکٹر لوئی ماسینو — پیرس یونیورسٹی کے استاد اور مستشرق ہیں، مسلم مسیحی تعاون کمیٹی کے رکن رہے۔

23- ڈاکٹر صادق رضا زادہ شفق — ایران کی تہران یونیورسٹی میں فلسفے کے استاد رہے، کئی کتب کے مصنف ہیں۔

24- فری لینڈ کے۔ ایبٹ — امریکی مصنف اور مستشرق، جنوبی ایشیا میں اسلامی تحریکوں کے محقق ہیں۔

25- ڈاکٹر عزیز ایس۔ عطیہ — علومِ شرقیہ کے سکالر، امریکہ کی یوٹا یونیورسٹی میں استاد رہے۔

26- پروفیسر حمید احمد خان — پنجاب یونیورسٹی، لاہور کے وائس چانسلر رہے۔

27- بشیر احمد ڈار — علمی و فکری موضوعات پر کئی کتب کے مصنف ہیں، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ میں رفیق رہے۔

28- ڈاکٹر سیّد عبداللہ — ادبی اسکالر، یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور کے پرنسپل اور پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ دائرہ المعارف اسلامیہ کے سربراہ رہے۔

29- محمد عثمان — دانش ور، مصنف، پنجاب یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے سربراہ رہے۔

30- محمد انور خلیل — کراچی کے نیشنل سٹی کالج میں فلسفے کے استاد رہے۔

31- محمد مظہر الدین صدیقی — سندھ یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ اور ادارہ ثقافت اسلامیہ سے منسلک رہے۔

32- کمال محمد حبیب — فلسفہ اور سماجی علوم میں دلچسپی رکھنے والے دانشور، پی سی ایس آر، کراچی سے منسلک رہے۔

33- محمد جعفر پھلواروی — کئی کتب کے مصنف، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ سے منسلک رہے۔

34- قاضی جاوید — کئی کتب کے مصنف، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے ڈائریکٹر ہیں۔

35- زاہد حسین — اسلامیہ آرٹس کالج، کراچی میں انگریزی ادب کے استاد رہے۔

36- عبدالحمید کمالی — اقبال اکادمی پاکستان کے ڈپٹی ڈائریکٹر رہے۔

37- رضی الدین صدیقی — ریاضی دان اور فلسفی، سابق وائس چانسلر، عثمانیہ یونیورسٹی، قائداعظم یونیورسٹی، اسلام آباد کے وائس چانسلر رہے۔

38- خواجہ بدر — لاہور کے ایک اسکالر

پیش لفظ

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کی رحلت کے بعد اُن لوگوں کے مضامین اور تاثرات شائع ہوئے جو خلیفہ صاحب سے ذاتی طور پر خوب واقف تھے۔ ان میں مرحوم کے قریبی رشتہ دار۔ دوست، طالب علم اور دیگر مفکرین بھی شامل ہیں۔ نیز ان غیر ملکی صاحبِ علم خواتین و حضرات کے تاثرات جن سے خلیفہ صاحب کی ملاقاتیں بین الاقوامی مجالس میں ہوئیں۔ وہ بھی مختلف علمی جریدوں سے ماخوذ ہیں مثلاً ''ثقافت'' اور ''اقبال ریویو''۔ ''ارمغان جشنِ الماس جامعہ عثمانیہ''۔

خلیفہ صاحب مرحوم کی زندگی کو تین اہم حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا دور طالب علمی ہائی سکول سے شروع ہو کر ایم۔ اے۔ او کالج علیگڑھ اور سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں اعلیٰ تعلیم کی تکمیل پر ختم ہوا۔ اس زمانہ میں وہ ایک ذہین طالب علم، سحر بیان مقرر اور خوش گو شاعر کی حیثیت سے دوسرے تمام طلباء سے ممتاز رہے جیسا کہ پرانے دوستوں کے مضامین سے ظاہر ہوتا ہے۔

خلیفہ صاحب کا دوسرا دورِ جامعہ عثمانیہ (حیدر آباد دکن) میں فلسفہ کی پروفیسری سے شروع ہو کر تیس سال تک جاری رہا۔ اس دوران انہوں نے جرمنی کی ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ انہیں یہ دور اپنی زندگی کا خوشگوار ترین دور لگتا ہے جیسا کہ ان کے معاصرین کے تاثرات سے اخذ کیا جا سکتا ہے۔

بعد انہوں نے لاہور میں سکونت اختیار کرنے کو ترجیح دی جب کہ کشمیر کے پُر فضا مقام پر انہوں نے گھر تعمیر کیا تھا جہاں وہ ریٹائرمنٹ کے بعد کی زندگی گزارنا چاہتے تھے۔ اس فیصلے سے انہیں تسلی تھی کہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ اور دیگر بامقصد مصروفیات میں وقت گزارنے سے وہ ملک وملت کی بہتر خدمت کر سکتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک اعلیٰ مقصد کی جستجو باعثِ تسکین تھی اور جس کے لیے وہ پوری طرح سے مسلح تھے۔ جدید اور قدیم علوم سے آشنا، اسلام کے محرم، مغرب کے رمز شناس۔ سوچنے کی صلاحیت کو بروئے کار لانے کا ماحول ان کے لیے نہایت سازگار ثابت ہوا۔ سرسیّد احمد خان اور علامہ اقبال کے خوابوں کی سرزمین میں وہ اپنا حصہ ڈالنے کے خواہشمند تھے۔ اس میں شک نہیں کہ سرسیّد احمد خان نے اعتدال، بصیرت اور جدت پسندی کی روایت کو فروغ دیا اور پھر علامہ اقبال نے نہایت بصیرت اور کامیابی کے ساتھ اُس کو ترقی دی۔ البتہ اس کام کو عملی شکل میں فروغ دینا نوزائیدہ مملکت کا تقاضا تھا۔ خلیفہ صاحب ان دونوں شخصیتوں سے بے حد متاثر تھے۔ علامہ سے ذہنی قربت کے حوالے سے ان کے بہترین شارع اور مفسر ہونے کا اعزاز بھی انہیں حاصل ہے۔ ہمیں یقین ہے کہ اس وقت ہماری سب سے بڑی علمی اور اسلامی ضرورت یہ ہے کہ سرسیّد اور اقبال کے مدرسہ فکر کو جو قائداعظم کی خواہشات سے مطابقت رکھتا ہے، اسے عملی اقدامات سے بڑھاوا دیں۔

خلیفہ عبدالحکیم کی کاوشیں اس ہی تحریک کا ایک اہم حصہ رہی ہیں۔ بقول کسے خلیفہ صاحب کا اصول آفاقی اقدار کی تاسیس ہے جن کی ضیاپاشیوں میں وہ انسانوں کے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل کرنے کا راستہ دکھاتے ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ ان کی گرانقدر کاوشیں مشعلِ راہ ثابت ہوں گی اور اُن کو حکومتی سطح پر بھی وہی پذیرائی ملے گی جو وقت کا اہم تقاضا ہے۔ اور جو تحقیقی کام خلیفہ صاحب ادھورے چھوڑ گئے ہیں وہ لائقِ توجہ ہوں گے۔

پروفیسر ڈاکٹر رفیعہ حسن

1

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

ڈاکٹر آفتاب احمد

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میرا غائبانہ تعارف میری طالب علمی کے زمانے میں پروفیسر حمید احمد خاں کے واسطے ہوا جو عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن میں ان کے شاگرد رہے تھے اور ان کا ذکر نہایت عزت واحترام سے کیا کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب رہنے والے تو لاہور کے تھے مگر تعلیم اور ملازمت کے سلسلے میں عمر کا بیشتر حصہ انہوں نے لاہور سے باہر گزارا۔ علی گڑھ سے ایف اے کرنے کے بعد بی اے اور ایم اے فلسفہ کے لیے وہ سینٹ کالج دہلی چلے گے، پھر لاہور آئے اور لاء کالج سے ایل ایل بی کا امتحان پاس تو کرلیا مگر وکالت نہیں کی بلکہ عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ میں اسسٹنٹ پروفیسر ہوگئے۔ وہاں سے جرمنی گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے فلسفے میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔

وطن واپسی پر عثمانیہ یونیورسٹی ہی میں فلسفہ کے پروفیسر اور پھر صدر شعبہ ہوئے۔

۱۹۴۴ء کے لگ بھگ انہیں ریاست جموں و کشمیر کے محکمہ تعلیم کے سربراہ کے عہدے کی پیشکش ہوئی تو گویا ان کی دلی مراد بر آئی۔ انہوں نے اس پیشکش کو بڑی خوشی سے قبول کیا۔ خطۂ کشمیر سے ان کو عشق تھا۔ وہ حیدر آباد سے بھی ہر سال گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے کشمیر جایا کرتے تھے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ خلیفہ صاحب کشمیری نژاد تھے اور اس پر انہیں ناز بھی تھا۔ لہذا کشمیر میں ملازمت اور مستقل قیام کی صورت پیدا ہوئی تو انہوں نے اسے مراجعت وطن کے مترادف سمجھا اور اس خیال سے کہ اب زندگی کے باقی دن وہیں بسر کریں گے، سری نگر میں ایک پُرفضا مقام پر گھر بھی بنالیا مگر تین چار سال بعد حالات نے جو کروٹ لی اس کی وجہ سے انہیں ملازمت اور اور جما جمایا گھر چھوڑنا پڑا۔ وہ اپنے گھر کا کہ جسے انہوں نے بڑے شوق اور اہتمام سے بنوایا تھا ذکر تو اکثر کیا کرتے تھے مگر ان میں چونکہ راضی برضا رہنے کی صلاحیت بھی تھی لہذا انہوں اس انتہائی ناخوش گوار نقل مکانی کو بھی زندگی کی ایک حقیقت سمجھ کر قبول کرلیا اور اسے اپنے دِل کا روگ نہیں بنایا۔ یوں بھی ان کی طبیعت میں کچھ ایسی رجائیت پسندی تھی کہ وہ چیزوں کے تاریک پہلوؤں کو نظر انداز کر کے ان کے روشن پہلوؤں پر نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی زندگی میں اُن کامیابیوں کو جو پاکستان بننے کے بعد ان کے حصے میں آئیں کشمیر سے واپسی پر محمول کیا کرتے تھے۔

پاکستان میں وہ ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے پہلے سربراہ مقرر کیے گئے بلکہ یہ ادارہ پاکستان کی پہلی مرکزی حکومت کے زمانے میں جس کے وزیر خزانہ غلام محمد صاحب خلیفہ صاحب کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے خلیفہ صاحب ہی کی تحریک پر لاہور میں قائم کیا گیا تھا۔ اپنے اثر و رسوخ کی وجہ سے خلیفہ صاحب نے اس کے لیے مال روڈ کے ایک حسین گوشے کلب روڈ پر سبزہ و گل کے تختوں کے درمیان ایک کوٹھی حاصل کی اور پھر وہ تصنیف و تالیف کے اس کام میں ہمہ تن مصروف ہوگئے جو اُن کے علمی و فکری کارناموں کی قیمتی یادگار سمجھا جاتا ہے۔ کشمیر چھوڑنے کا غم ان کا بھول گیا کہ یہی دور اُن کی اپنی دانست میں بھی تخلیقی لحاظ سے ان کی زندگی کا بہترین دَور تھا۔

خلیفہ صاحب سے میرا رسمی تعارف تو ۴۸-۱۹۴۹ء کے موسم سرما میں ہوا تھا کہ جب پروفیسر احمد شاہ بخاری (پطرس) گورنمنٹ کالج کے پرنسپل تھے اور میں وہاں شعبۂ انگریزی میں لیکچرار تھا۔ ایک دن بخاری صاحب سٹاف روم میں آئے اور باتوں باتوں میں

اقبال نے دورِ جدید میں اسلامی فلسفہ اور ثقافت کو سمجھنے پرکھنے اور ان کی قدر و قیمت اجاگر کرنے کے جس کام کی ابتدا کی تھی خلیفہ صاحب نے اس کو بڑی خوبی اور خوش اسلوبی سے آگے بڑھایا ہے اور اس سلسلے میں ان کی جملہ تصنیفات، جن میں میٹافزکس آف رومی اور اس کا اردو ترجمہ الٰہیات رومی، تشبیہات رومی، حکمت رومی، اسلامک آئیڈیولوجی اور اس کا اردو ترجمہ اسلام کا نظریۂ حیات، افکارِ غالب اور فکرِ اقبال شامل ہیں، اپنی اپنی جگہ ایک روشن سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ باقی رہی شاعری تو مشرق میں پڑھے لکھے لوگوں کے طبقے میں شعر تو سبھی کہہ لیتے ہیں ہاں اقبال جیسے عظیم شاعر البتہ صدیوں میں پیدا ہوتے ہیں۔

اس ملاقات کے بعد بھی خلیفہ صاحب سے بعض محفلوں میں سرسری ملاقاتیں ہوتی رہیں مگر میرے ذاتی تعلقات کا سلسلہ اس وقت استوار ہوا جب جنوری ۱۹۵۳ء میں مجید ملک صاحب اور ان کی بیگم آمنہ باجی لاہور آئے۔ مجید صاحب تو ہفتہ دس دِن ٹھہر کر واپس کراچی چلے گئے مگر آمنہ باجی نے بچوں سمیت لاہور میں دو چار مہینے گزارے۔ وہ مجید صاحب کے بڑے بھائی حمید ملک صاحب کے ہاں ٹھہری ہوئی تھیں۔ خلیفہ صاحب آمنہ باجی کے حقیقی ماموں تھے اور مجید ملک صاحب اور حمید ملک صاحب کے پرانے دوست۔ یہ سب لوگ اکثر خلیفہ صاحب سے ملنے ان کے گھر جاتے تھے، کئی بار مجھے بھی اپنے ساتھ لے گئے۔ آمنہ باجی کی کراچی واپسی کے بعد بھی حمید ملک صاحب اور میں خلیفہ صاحب کے ہاں جانے لگے اور ایک زمانے میں تو یہ دستور بن گیا کہ ہم دونوں رات کے کھانے کے بعد اکثر خلیفہ صاحب کے ہاں کشمیری گھرانوں کی مشہور معروف نمکین پیازی چائے پینے جایا کرتے تھے۔ اس مضمون کی ابتدا میں ان کی زندگی کے بارے میں جو تفصیلات لکھی گئی ہیں وہ اسی زمانے میں دوران گفتگو جستہ جستہ خود ان کی زبانی مجھے معلوم ہوئیں۔ خلیفہ صاحب کی گفتگو بڑی دلچسپ ہوتی تھی۔ اس میں بذلہ سنجی، لطیفہ گوئی کے علاوہ علمی و ادبی نکتے، رومی و حافظ اور غالب و اقبال کے اشعار پر ان کے تبصرے بھی شامل ہوتے تھے۔ اب میری ملاقات ان سے اتنی بڑھ چکی تھی کہ میں ان کی اپنی خواہش کے مطابق آمنہ باجی کے تتبع میں خلیفہ صاحب کی بجائے حکیم ماموں کہنے لگا تھا۔ اگلے چھ سال کے عرصے میں یعنی ان کی وفات تک وہ میرے لیے حکیم ماموں ہی رہے اور ان کی شفقت برابر مجھے حاصل رہی اور کچھ تکلف کے پردے بھی اُٹھ گئے۔

یہ بتانے کے بعد کہ آج خلیفہ عبدالحکیم صاحب ان سے ملنے آ رہے ہیں انہوں نے ایسے غیر معمولی الفاظ میں ان کا ذکر کیا جو بخاری صاحب کی زبان سے کسی کے بارے میں کم ہی سنے گئے تھے۔ ان کا انگریزی کا یہ جملہ مجھے اب تک یاد ہے:

''He Has a very incisive mind.''

اور پھر فلسفہ، تصوف اور دیگر متعلقہ علوم میں ان کی دسترس اور رومی و اقبال کے فکر کو سمجھنے میں ان کے فہم و فراست کی تعریف کرتے رہے۔ بخاری صاحب کی گفتگو جاری تھی کہ خلیفہ صاحب خود ہی بخاری صاحب کے سیکرٹری کے ساتھ سٹاف روم کی طرف آ نکلے۔ بخاری صاحب نے ان کا استقبال کیا، اسٹاف روم میں موجود اساتذہ سے ان کا تعارف کرایا اور پھر ان کو اپنے کمرے میں لے گئے۔ خلیفہ صاحب کے بارے میں میرا پہلا تاثر اُن کے سرخ و سفید رنگ، ان کے چہرے کی بشاشت اور ان کی شخصی وجاہت کا تھا۔

کچھ عرصے کے بعد خلیفہ صاحب تاثیر صاحب سے ملنے ان کے گھر آئے تو میں اتفاق سے وہاں پہلے سے موجود تھا۔ اس دن میں نے ان کی گفتگو بھی سنی جس میں لطیفے، اشعار، حالات حاضرہ پر تبصرہ، ہلکی پھلکی گپ شپ، سبھی کچھ شامل تھا۔ خلیفہ صاحب بڑے کھلے ڈھلے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔ کچھ دیر بیٹھے اور پھر جب جانے کو اُٹھے تو تاثیر انہیں رخصت کرنے باہر تک گئے۔ جونہی واپس آئے تو میں نے دیکھا کہ تاثیر صاحب کی طبعی شرارت جو دبائے نہیں دبتی تھی ان کے چہرے پر کھیل رہی ہے۔ کہنے لگے کہ اصل میں تو خلیفہ صاحب بخاری کے یار ہیں۔ اگرچہ بخاری ان سے عمر میں کچھ چھوٹے ہیں اور ہم بخاری سے چھوٹے۔ مگر تمہیں معلوم ہے کہ خلیفہ صاحب اپنے آپ کو اقبال سے کم تر نہیں سمجھتے۔ ان کے خیال میں اقبال بھی کشمیری تھے۔ یہ بھی کشمیری ہیں۔ اقبال نے جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی تھی۔ انہوں نے جرمنی ہی سے وہی ڈگری حاسل کی ہے۔ اقبال رومی کے عاشق تھے۔ یہ بھی ہیں اور انہوں نے تو رومی پر کتاب بھی لکھی ہے۔ اقبال فلسفی اور شاعر تھے۔ یہ بھی ہیں۔ غرض یہ کسی بات میں اقبال سے گھٹ کے نہیں ہیں۔ بس یہ ہے کہ اقبال کی بات ذرا چل نکلی ہے!...... تاثیر صاحب نے یہ بات جس انداز سے کہی تھی میں اس سے کچھ محظوظ ہوا اور ظاہر ہے کہ وہ خود بھی۔ مگر اسے تاثیر صاحب کی شوخ گفتاری کا نمونہ ہی سمجھنا چاہیے ورنہ خلیفہ صاحب کی قابلیت کے وہ بھی قائل تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ

میں نے ابھی عرض کیا تھا کہ خلیفہ صاحب کشمیری نژاد تھے اور اس پر انہیں بڑا ناز بھی تھا۔ یہاں تک کہ وہ اپنی ذاتی صلاحیتوں کو بھی اپنے کشمیری ہونے کا فیضان سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ ذرا ترنگ میں آکر کہنے لگے کہ دیکھو لیڈروں میں جواہر لال نہرو، شاعروں میں اقبال، وکیلوں میں سر تیج بہادر سپرو، پہلوانوں میں رستم زماں گاماں سب کے سب کشمیری ہیں۔ میں نے ذرا شرارت آمیز لہجے میں گرہ لگائی کہ یہ سب حضرات کشمیری ہیں تو کیا وہاں کی زبان تک تو جانتے نہیں تھے۔ ان کی ذہنی نشوونما اور تربیت تو یوپی اور پنجاب کی سرزمینوں میں ہوئی تھی اور یہیں کی آب و ہوا اور علمی و ثقافتی فضا میں ان کا جوہر چمکا تھا۔ اس پر خلیفہ صاحب نے اپنے خاص انداز میں نسلی خصوصیات کے اثرات کا قصہ چھیڑ دیا اور ایران توران کی حکایات سنانے لگے۔ میں نے جواب میں ان کو یاد دلایا کہ آپ اپنی تقریروں میں تو اسلامی ثقافتی اقدار کی توضیح و تشریح کرتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں کا یہ شعر پڑھا کرتے ہیں:

اسلام امتیازِ نسب کا حریف ہے
کل آریہ تھے آج ملے سامیوں میں ہم

اس پر یہ بحث شروع ہوگئی کہ کشمیری آریائی نسل سے تعلق رکھتے ہیں یا سامی نسل سے۔ اس کے بارے میں مورخین میں دو رائیں پائی جاتی ہیں۔ بہرحال خلیفہ صاحب اہلِ کشمیر کی حد تک دماغ سے نہیں تو دل سے رنگ و نسل کے امتیاز کے قائل تھے اور اس کے بھی کہ انسانی معاملات میں رنگ و نسل کے اشتراک و عدم اشتراک کا بڑا عمل دخل ہے۔

اس سلسلے میں وہ علامہ اقبال سے منسوب یہ واقعہ بھی سنایا کرتے تھے کہ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے بعد جب پنجاب اسمبلی کے سپیکر کے انتخاب کا وقت آیا تو اس میں دو حریف تھے۔ سر سکندر کی یونینسٹ پارٹی کی طرف سے سر شہاب الدین اور کانگریس پارٹی کی طرف سے ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سر شہاب الدین پنجاب کی جاٹ برادری سے تعلق رکھتے تھے اور کچلو امرتسر کی کشمیری برادری سے۔ سر شہاب الدین اگرچہ علامہ اقبال کے بہت پرانے اور بے تکلف دوست تھے مگر انہوں نے اس انتخاب میں اپنا اثر و رسوخ کچلو کی حمایت میں استعمال کیا حالانکہ وہ کانگریس کے امیدوار تھے۔ یہاں تک کہ خلیفہ صاحب کی ایک عزیزہ باجی رشیدہ لطیف کو جو لاہور سے خواتین کی طرف سے اسمبلی کی ممبر منتخب ہوئیں تھیں خلیفہ صاحب کے

ہندوستانیوں کے ذکر میں کہ جنہوں نے کیمبرج میں تعلیم پائی تھی اقبال کا نام لیا اور یہ کہا کہ وہ بہت بڑے شاعر تھے اور بعد میں انہوں نے مجھے اور میرے والد کو اپنی ایک نظم کے ذریعے زندہ جاوید کر دیا۔ عاشق صاحب نے کہا کہ تقریر کے بعد چائے کے دوران میں نے پنڈت جی سے پوچھا کہ اقبال کی وہ نظم کون سی ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ ''جاوید نامہ'' میں غنی کاشمیری والا باب دیکھیے۔ عاشق صاحب نے جب اس میں اشعار دیکھے تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

کشمیر میں خلیفہ صاحب کے آباد ہونے اور پھر وہاں سے نکلنے کا ذکر میں کر چکا ہوں۔ اس سے ایک دلچسپ داستان بھی وابستہ ہے جسے وہ بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے۔ شاعروں میں خلیفہ صاحب رومی کے مرید تھے اور حافظ کے گرویدہ۔ دیوانِ حافظ سے فال نکالنا بھی ان کا ایک محبوب مشغلہ تھا۔ اکثر موقعوں پر حافظ سے رجوع کیا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کے بیان کے مطابق ۱۹۴۳ء میں جب کشمیر جانے کا امکان پیدا ہوا تو شیراز کے لسان الغیب کی طرف سے جو آواز آئی اس نے خلیفہ صاحب کے لیے فیصلے کا راستہ صاف کر دیا:

مند بباغ بر کہ بخدمت چو بندگان
استادہ است سرو و کمربستہ است نے

اور جب وہ وہاں سے واپسی کے بارے میں سوچنے لگے تو لسان الغیب نے آنے والے زمانے کی دہشت سے خبردار کرتے ہوئے نکل بھاگنے کا مشورہ دیا:

آتش رزق و ریا خرمنِ دیں خواہد سوخت
حافظ ایں خرقۂ پشمینہ بر انداز و برد

خلیفہ صاحب روشن خیال اور وسیع المشرب آدمی تھے۔ اسلامی فلسفہ و تصوف کے ماہر تھے مگر اس کے ساتھ مغربی فلسفہ اور ثقافت کا گہرا اثر بھی قبول کیے ہوئے تھے۔ آزادیٔ نسواں کے حامی تھے اور ان کے خاندان اور قریبی عزیزوں کی خواتین سب پڑھی لکھی تھیں اور پردے کی رسم سے آزاد۔ یوں تو خلیفہ صاحب اقبال کے بہت قائل تھے لیکن آزادیٔ نسواں، پردہ اور اسی قسم کے چند اور معاملات میں وہ اقبال کے خیالات سے متفق نہیں تھے اور اس کا برملا اظہار ہی نہیں بلکہ اس کے بارے میں فقرہ بازی سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ مثلاً مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے مجھ سے خود ہی ذکر کیا کہ مری کے مال روڈ پر انہیں اقبال کی بیٹی

چھوٹے بھائی خلیفہ عبدالغنی کی معرفت یہ پیغام بھجوایا کہ وہ اپنا ووٹ اپنے کشمیری بھائی کے حق میں دیں۔ میں نے یہ قصہ سن کر کہا کہ اقبال نے باجی رشیدہ لطیف کا ووٹ لینے کے لفظ تو یہی استعمال کیے ہوں گے مگر شاید انہیں ایک انگریز نواز پارٹی کے مقابلے میں حریت پسند پارٹی کے امیدوار کی خصوصاً جب وہ کچلو جیسا مرد مجاہد ہو حمایت مقصود ہوگی اس واقعے کی تفسیر اس طرح کیوں نہیں کرتے؟

اس پر خلیفہ صاحب نے اقبال کی کشمیر نوازی کے سلسلے میں ایک ایسا حتمی حوالہ جو میرے لیے ایک انکشاف سے کم نہ تھا۔ وہ کرسی سے اُٹھے۔ الماری سے اقبال کی ''جاوید نامہ'' نکالی اور اس میں سے غنی کاشمیری کے باب میں ذیل کے اشعار سنائے:

ہند را ایں ذوقِ آزادی کہ داد؟
صید را سودائے صیادی کہ داد؟
آں برہمن زادگانِ زندہ دل
لالۂ احمر زروئے شاں خجل
تیز بین و پختہ کار و سخت کوش
از نگاہِ شاں فرنگ اندر خروش
اصلِ شاں از خاکِ دامن گیرِ ماست
مطلعِ ایں اختراں کشمیرِ ماست

شعر سنانے کے بعد کہنے لگے تمہیں معلوم ہے کہ یہ برہمن زادگان زندہ دل کون تھے؟ موتی لال نہرو اور جواہر لال نہرو۔ میں نے کہا کہ اس سے تو میرے موقف ہی کی تائید ہوتی ہے کہ اقبال حریت پسندوں کے طرف دار تھے۔ خلیفہ صاحب نے یہ کہہ کے مجھے لاجواب کر دیا کہ ذوقِ آزادی دینے والے تو کئی اور بھی تھے، اقبال نے صرف ان دو کشمیری برہمنوں ہی کی طرف کیوں اشارہ کیا؟

میں نے جب یہ واقعہ ۱۹۵۵ء میں اپنے قیامِ لندن کے دوران عاشق حسین بٹالوی صاحب کو سنایا تو انہوں نے مجھے بتایا کہ انہیں تو ان اشعار کا علم خود پنڈت جواہر لال نہرو کے ذریعے ہوا تھا۔ کہنے لگے کہ ایک دفعہ جب نہرو لندن آئے تو انہوں نے انڈیا ہاؤس کے ایک استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے اپنے کیمبرج کے ایام کو یاد کیا اور پھر ایسے سربرآوردہ

منیرہ اور ان کے ساتھ یا الگ سے اکبر الٰہ آبادی کے خاندان کی کوئی خاتون سیر کرتے ہو
نظر آئیں۔ انہوں نے خلیفہ صاحب کو آداب سلام کیا تو خلیفہ صاحب نے بغیر کسی رو رعای
کے انہیں اکبر کے مشہور اشعار سنا دیے:

بے پردہ آج آئیں نظر چند بیبیاں
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو اُن سے آپ کے پردے کو کیا ہوا
کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مجھے چونکہ خلیفہ صاحب کے ان خیالات کا علم تھا لہٰذا جب انہوں نے مجھ سے اپنے مقالے ''اقبال اور ملا'' کے بارے میں پوچھا جو پنجاب یونیورسٹی کے سینٹ ہال میں ایک خصوصی جلسے میں پڑھا گیا تھا جہاں میں بھی موجود تھا تو میں نے کہا کہ مقالہ تو آپ کا بہت اچھا تھا لیکن ایک اور مقالے کا امکان ابھی باقی ہے اور وہ بھی صرف آپ ہی لکھ سکتے ہیں۔ کہنے لگے وہ کون سا؟ میں نے کہا ''دی ملا اِن اقبال'' یہ سن کر خلیفہ صاحب محظوظ ہوئے ہنس دیے اور بات ہنسی ہنسی میں ٹال دی۔

میری ان ملاقاتوں کے دوران خلیفہ صاحب کی بیگم اور ان کی بیٹی رفیعہ اور خاندان کے دوسرے افراد سے بھی میرے اور میری دونوں چھوٹی بہنوں جمیلہ اور رشیدہ کے بھی جو میرے ساتھ رہتی تھیں میل جول کے مراسم پیدا ہو گئے۔ دسمبر ۱۹۵۸ء میں جب جمیلہ کی شادی کا موقع آیا تو میں نے سوچا کہ بجائے کسی ملائے مسجد کو بلانے کے کیوں نہ خلیفہ صاحب سے نکاح پڑھانے کی درخواست کی جائے۔ خلیفہ صاحب ہم لوگوں سے بڑی شفقت کرتے تھے لہٰذا فوراً مان گئے۔ نکاح کے ساتھ ہی شام کے کھانے کا انتظام بھی تھا۔ ہم لوگ اس زمانے میں میسن روڈ پر تاثیر صاحب کے مکان کے اوپر کے حصے میں رہتے تھے۔ چنانچہ نکاح کی رسم تاثیر صاحب کے ڈرائنگ روم میں ادا ہوئی۔ دسمبر کے آخری دن تھے۔ اس شام اتفاق سے بارش بھی ہو گئی۔ کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ خلیفہ صاحب نے نکاح کا خطبہ شروع کیا تو سب سے پہلے انہوں نے دولہا میاں کو مخاطب کر کے یہ مزے کی بات کہی کہ آپ کی ہونے والی بیوی کو تو میں جانتا ہوں۔ بڑی سعید بچی ہے۔ آپ کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں۔ خدا کرے کہ آپ اس کے قابل ثابت ہوں۔ اس کے بعد وہ داستان در داستان ایسے رواں

ہوئے کہ خاتمہ کلام کے کوئی آثار نظر نہیں آتے تھے۔ آخر میں پروفیسر حمید احمد خاں سے کہ محفل میں میرے عزیزوں میں وہی ایک بزرگ تھے اور خلیفہ صاحب کے چہیتے شاگرد بھی، عرض کیا کہ خلیفہ صاحب کو کسی طرح اشارہ کریں کہ وقت کم ہے اور موسم بہت سرد، ہم یہ تقریب جلد ختم کرنا چاہتے ہیں۔ حمید احمد خاں صاحب نے کسی قدر شرارت آمیز لہجے میں بہ آواز بلند کہا کہ خلیفہ صاحب قبلہ آپ کے علم وفضل کے خزانے تو لاتمناہی ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ کھانا ٹھنڈا ہو رہا ہے، اس پر مجلس میں قہقہہ پڑا، مگر اس فقرے کا سب سے زیادہ لطف خود خلیفہ صاحب نے لیا۔ اس لیے کہ یہ فقرہ تھا ہی ان کا۔ بعد میں انہوں نے خود بتایا کہ مجید ملک صاحب اور آمنہ باجی کے نکاح کے موقع پر جب خلیفہ صاحب ہی کے ایک دوست مولانا صدرالدین صاحب اس قسم کا طویل خطبہ ارشاد فرما رہے تھے تو خلیفہ صاحب نے دلہن کے ماموں کی حیثیت سے انہیں اس طرح مخاطب کیا تھا۔ حمید احمد خاں صاحب نے خلیفہ صاحب سے یہ قصہ سن رکھا تھا۔

اس واقعے کے کوئی ایک مہینے بعد یعنی جنوری ۱۹۵۹ء کے آخر میں خلیفہ صاحب کا کراچی میں انتقال ہو گیا۔ میں اتفاق سے کراچی کے سرکاری دورے پر تھا۔ خلیفہ صاحب بھی کسی کام کے سلسلے میں وہاں پہنچے۔ وفات سے ایک دن پہلے خلیفہ صاحب مجید ملک کے ہاں آئے اور ہم سب نے مل کر دوپہر کا کھانا کھایا، دوسرے دن صبح خلیفہ صاحب، ممتاز حسن صاحب سیکرٹری فنانس حکومت پاکستان سے ملنے گئے، ممتاز صاحب کسی ضروری کام میں مصروف تھے۔ خلیفہ صاحب صوفے پر بیٹھے ہوئے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کر رہے تھے کہ انہیں دل کا شدید دورہ پڑا اور انہوں نے ڈاکٹر کے پہنچنے سے پہلے ہی جان جان آفرین کے سپرد کر دی۔

خلیفہ صاحب پہلے بھی ایک دفعہ دل کے دورے کا شکار ہوئے تھے مگر انہوں نے اس کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ انہوں نے اپنے اس عارضے کے متعلق یہ رائے قائم کر لی تھی کہ دل کا زخم ایک دفعہ ٹھیک ہو جائے تو پھر وہ ٹھیک ہی رہتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے غذا اور دیگر معمولات میں بھی کبھی کوئی پرہیز ملحوظ نہیں رکھا۔ اپنے قینچی مارکہ سگریٹ بھی مستقل پیتے رہے، کبھی کسی قسم کی ورزش بھی نہیں کی بلکہ جب انہیں اس زمانے کے مشہور امریکی ماہر قلب پال ڈیڈلے وہائٹ کا یہ قول سنایا گیا کہ دل کے مریضوں کو پیدل چلنا چاہیے یا سائیکل چلانا

چاہیے تو خلیفہ صاحب نے کہ پیدل چلنے سے ہمیشہ گریزاں رہتے تھے یہ کہہ کر ٹال دیا کر
''ٹریاں ڈھکیاں دا کی پتہ اے، کدی کج کہندے نیں کدی کج۔'' اس پنجابی فقرے کے
بنیادی لفظ ڈھکیاں کی اردو تو مجھے آتی نہیں باقی مطلب یہ ہے کہ ان کا کیا پتہ کبھی کچھ کہتے
ہیں کبھی کچھ۔

میں نے عرض کیا تھا کہ خلیفہ صاحب وسیع المشرب اور روشن خیال آدمی تھے۔ ان کے حلقہ احباب میں ایک طرف تو پطرس بخاری، مجید ملک، تاثیر، نیاز علی تاج، جسٹس ایس اے رحمان جیسے حضرات شامل تھے ان کے علاوہ بھی ان کا ملنا جلنا زیادہ تر اسی قسم کے انگریزی پڑھے لکھے مگر اردو فارسی سے ربط رکھنے والے جدید خیالات کے لوگوں سے تھا اور دوسری طرف ان کے ادارے میں روایتی دینی مدرسوں کے پڑھے ہوئے مولوی تھے جن سے ان کا روزانہ کا رابطہ تھا اور جن کی معلومات اور ریسرچ سے وہ استفادہ بھی کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب ان دونوں دنیاؤں کے شہری تھے اور دونوں میں آسودہ رہتے تھے۔ وہ سنجیدہ فکری مسائل سے اپنی گہری دلچسپی اور لگاؤ اور اپنے علم و فضل کے باوجود ٹھس آدمی نہیں تھے۔ اپنی فطری شگفتہ مزاجی اور خوش دلی کے باعث وہ ہر محفل کے آدمی تھے اور کبھی کبھی تو وہ اپنے موچی دروازے کے یارانِ قدیم سے ملنے بھی چلے جایا کرتے تھے۔ وہ اپنے ہم عمروں کے علاوہ چھوٹی عمر کے لوگوں اور نوجوانوں سے بھی انتہائی شفقت کا برتاؤ کرتے تھے۔ ان کی گفتگو میں حکایتوں اور داستانوں کی چاشنی بھی تھی اور لطائف و ظرافت کی پھلجھڑیاں بھی۔ میں نے انہیں کبھی کسی قسم کے شکوک و شبہات میں گرفتار نہیں دیکھا۔ دراصل وہ اپنے آپ میں اور اپنے آپ سے بہت مطمئن اور خوش تھے اور دوسروں کو بھی اسی طرح مطمئن اور خوش دیکھنا چاہتے تھے۔

2

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم

محمد عبداللہ قریشی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ہمارے قرب و جوار کے رہنے والے تھے۔ ان کا نام تو بچپن ہی سے کانوں میں پڑ رہا تھا، ان کو دور دور سے دیکھنے کے مواقع بھی اکثر ملتے رہتے تھے، کبھی مشاعروں میں، کبھی ادبی مجلسوں میں، مگر ان سے براہ راست تعارف کی سعادت اسی وقت میسر آئی جب ۱۹۴۳ء میں حکومت کشمیر نے ان کی خدمت حضور نظام دکن سے سرامر سنگھ ڈگری کالج کے پرنسپل کے عہدے کے لیے مستعار لے لیں۔ میں چونکہ ہر سال کشمیر جایا کرتا اور وہاں کی علمی و ادبی سرگرمیوں میں حصہ لیا کرتا تھا، اس لئے یہ ممکن نہ تھا کہ خلیفہ صاحب سے ملاقات نہ ہو۔ ملاقات ہوئی اور پہلے دن جس خلوص اور خندہ پیشانی سے پیش آئے آخر دم تک اسی طرح ملتے رہے۔ میری کم علمی اور اپنی فضیلت کا احساس انہوں نے کبھی نہیں ہونے دیا۔ میں نے ان کی صدارت میں کئی مقالے سرینگر میں پڑھے اور ان کے وسیع ذخیرہ

معلومات سے ہمیشہ فائدہ اٹھایا۔

۱۹۴۶ء کی سردیوں میں جموں میں خلیفہ صاحب سے سب سے طویل ملاقات ہوئی جب وہ ترقی کر کے سررشتہ تعلیمات کے ڈائریکٹر ہو چکے تھے۔ تقریب یوں پیدا ہوئی کہ منشی محمد الدین فوق مدیر اخبار کشمیری لاہور، جو کشمیر کے متعلق متعدد کتابیں لکھ چکے تھے (جن میں تاریخ کشمیر، مشاہیر کشمیر، رہنمائے کشمیر، خواتین کشمیر، شباب کشمیر، حکایات کشمیر، کشمیر کی رانیاں، تاریخ بڈ شاہی، تاریخ اقوام پونچھ اور تاریخ اقوام کشمیر بہت مشہور ہیں) اپنی تصنیف تاریخ اقوام کشمیر کی تیسری جلد مرتب کر رہے تھے کہ ۱۴ ستمبر ۱۹۴۵ء کو انہیں بلاوا آ گیا اور وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اس نامکمل جلد کی تکمیل میرے سپرد ہوئی اور میں نے ایک سال کی لگاتار محنت سے یہ کتاب مکمل کر کے مرحوم کی پہلی برسی کے موقعہ پر ۱۴ ستمبر ۱۹۴۶ء کو شائع کر دی۔

اس کتاب میں کشمیری مسلمانوں، کشمیری پنڈتوں اور دوسرے خاندانوں کے علاوہ جو کشمیر میں رہتے تھے، ان کشمیری خاندانوں کا ذکر بھی ہے جو کشمیر سے نقل مکانی کر کے دوسری جگہ آباد ہو گئے تھے۔ مقصد یہ دکھانا تھا کہ کشمیر کی مختلف قوموں نے ملک کی سیاسی، مذہبی، تمدنی، معاشری، علمی اور اقتصادی زندگی میں کیا انقلابات پیدا کئے اور اس میں ہر نسل اور قوم کا کتنا حصہ ہے۔

اس سلسلے میں مجھے ڈار خاندان کی شاخ لاہور اور سرینگر کا ذکر بھی کرنا تھا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم چونکہ اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کے حالات معلوم کرنے کے لیے میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان سے ضروری معلومات حاصل کیں۔ باتوں باتوں میں کئی دیگر مسائل بھی زیر بحث آئے۔ لطیفے بھی ہوئے اور میں نے محسوس کیا کہ وہ بہت ہی وسیع المعلومات شخصیت تھے، ذہن رسا تھا اور علم متحضر، بہت جلد بات کی تہہ تک پہنچ جاتے اور کوئی نہ کوئی نیا نکتہ نکال لاتے تھے۔ ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ باتوں میں گلوں کی خوشبو تھی۔ مشکل سے مشکل مسئلے پر بھی سادہ الفاظ میں اس شان سے گفتگو کرتے تھے کہ مخاطب قائل ہو جاتا تھا۔

ذیل کی سطور اسی ملاقات کی یادگار ہیں۔ میں نے سیدھے سبھاؤ ان کے حالات لکھنے پر ہی اکتفا کیا ہے، ان پھول جھڑیوں کو چھوڑ دیا ہے جو قدم قدم پر چھوٹتی رہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم ۱۱ جولائی ۱۸۹۴ء کو لاہور میں پیدا ہوئی۔ طبیعت بچپن ہی سے شعرو شاعری کی طرف مائل تھی۔ اس کے باوجود اپنے ہم جماعتوں میں ہمیشہ اول رہتے تھے۔ ۱۹۱۰ء میں اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازہ سے انٹرنس کا امتحان درجہ اول میں پاس کیا۔ اسی زمانے میں آپ کی پہلی نظم کشمیری میگزین لاہور میں شائع ہوئی۔

اعلیٰ تعلیم کے لیے آپ علی گڑھ کالج میں داخل ہوئے جہاں ایف، اے کا امتحان اعزاز کے ساتھ پاس کیا اور فی البدیہ تقریری مقابلوں میں اول آ کر انعام بھی حاصل کیا۔

۱۹۱۲ء کے وسط میں آپ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں داخل ہوئے جہاں سے ۱۹۱۵ء میں بی۔ اے کی ڈگری حاصل کی اور پنجاب یونیورسٹی میں اول آ کر فلسفہ کا ریکارڈ قائم کیا۔ (سر) میاں فضل حسین مرحوم ان دنوں اسلامیہ کالج کمیٹی لاہور کے سیکرٹری اور خواجہ جمال الدین بی۔ اے انسپکٹر مدارس کشمیر تھے۔ اول الذکر نے آپ کو کالج میں پروفیسر کا عہدہ پیش کیا اور موخر الذکر نے کہا کہ شیخ مقبول حسین صاحب ریونیو منسٹر کشمیر آپ کو اپنے دفتر کا سپرنٹنڈنٹ بنانا چاہتے ہیں مگر آپ نے علمی زندگی کو ترجیح دی اور دوسرا عہدہ قبول نہ کیا۔

انہی دنوں گلمرگ میں عید کا چاند دیکھ کر آپ نے ''ہلال عید'' ایک نظم لکھی۔ جو روزنامہ زمیندار میں چھپی۔ مولانا محمد علی جوہر مرحوم اس وقت چھندواڑہ میں نظر بند تھے۔ نظم دیکھ کر پھڑک اٹھے اور یہ شعر تو وردِ زباں کر لیا:

دل کی جمعیت سے لطف از بھی اور سوز بھی
آبرو ملت کی ہو تو عید بھی نوروز بھی

بی۔ اے میں اول آنے پر تعلیمی وظیفہ کے علاوہ مہاراجہ قاسم بازار کا تمغہ بھی ملا۔ ۱۹۱۷ء میں ایم۔ اے پاس کیا اور یونیورسٹی بھر میں اول آئے۔ اسی سال لاہور کے لاء کالج میں داخل ہوئے اور ساتھ ہی ساتھ خواجہ احد شاہ کے انگریزی اخبار ''پنجاب آبزرور'' کی ادارت بھی کرتے رہے۔ اس اخبار کی بے لاگ تنقیدوں سے متاثر ہو کر حکومت کے محکمہ احتساب نے سر مائیکل اوڈواٹر کے اشارہ پر اس اخبار کی ضمانت ضبط کر لی۔

وکالت کا امتحان پاس کیا ہی تھا کہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن نے آپ کو فلسفہ کی پروفیسری پیش کی۔ چنانچہ ۱۹۱۹ء میں آپ حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خاں نے آپ کی خدمت سے خوش ہو کر آپ کو ولایت جانے کا ارشاد فرمایا۔ ۱۹۲۲ء

اپنے چھوٹے بھائی عبدالغنی، اپنی اہلیہ اور خورد سال بچہ عارف اور اپنے بہنوئی ڈاکٹر میں آپ اپنے چھوٹے بھائی عبدالغنی، اپنی اہلیہ اور خورد سال بچہ عارف اور اپنے بہنوئی ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ ایم بی بی ایس۔ ایم۔ ڈی (برلن) کے ہمراہ یورپ روانہ ہوئے۔ وہاں تین سال رہے۔ جرمنی اور انگلستان کی نامور یونیورسٹیوں فرائی برگ، ہائیڈل برگ اور کیمبرج میں آپ نے فلسفہ کی تکمیل کی اور ۱۹۲۵ء میں ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری لے کر واپس آئے۔

۱۹۴۳ء میں جب سرامر سنگھ ڈگری کالج سرینگ کے پرنسپل کی آسامی خالی ہوئی تو حکومت کشمیر نے حضور نظام سے آپ کی خدمت مستعار لے کر آپ کو موقعہ دیا کہ آپ اپنے آبائی وطن کی تعلیمی خدمات انجام دیں۔ اس کے بعد آپ ڈائریکٹر سررشتہ تعلیمات جموں و کشمیر کے جلیل القدر عہدے پر فائز ہوئے۔

کشمیر میں آپ درجہ اول کے اسٹیٹ سبجکٹ بھی قرار دیئے گئے اور زمیندار بھی۔ آبائی زمینداری تو آپ کے دادا رمضان ڈار (وفات ۱۸۸۱ء) کے دیگر اقارب کے پاس رہی لیکن آپ نے نسیم باغ میں ذاتی جائیداد پیدا کر کے باغ کے کنارے ایک بنگلہ تعمیر کرایا تاکہ باقی ماندہ زندگی کے لیے اسی مقام کو مستقر بنائیں۔ یہ وہی نسیم باغ ہے جس کے متعلق جسٹس میاں محمد شاہدین مرحوم نے یہ شعر کہا ہے:

جی چاہتا ہے ہو مرا مسکن نسیم باغ
مر جایئے تو ڈل کے کنارے مزار ہو

مگر ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور آپ کو وہاں رہنا نصیب نہ ہو سکا۔ سب کچھ وہیں چھوڑ کر بادل ناخواستہ لاہور آنا پڑا۔

آپ انگریزی اور اُردو کی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ آپ کا فلسفیانہ اُردو کلام بھی ملک میں بے حد مقبول رہا ہے۔ اُردو نظم میں گیتا کا ترجمہ بھی کیا ہے جو زیور طبع سے آراستہ ہو کر اہل علم کے ہاتھوں میں پہنچ چکا ہے۔

چند نظمیں نمونے کے طور پر یہاں پیش کی جاتی ہیں۔ ان سے آپ کے تخیل کی بلندی اور قادر الکلامی کا کچھ کچھ اندازہ ہو سکے گا۔ ابتداء میں آپ اپنا کلام اقبال کو دکھاتے اور ان سے مشورہ لیتے تھے۔

زمانہ طالب علمی کی ایک غزل دیکھئے جس پر اقبال نے لکھا: ''برخوردار! تخیل کو بے عنان ہونے سے بچانا چاہیے۔'' دیکھئے کس مشکل زمین میں کیا گلریزیاں کی ہیں:

سب برگ و بار سبز ہیں اور شاخسار سبز
یعنی کہ نغمہ سبز ہے اور ساز و تاز سبز
مانند سایہ نقش قدم کے نشان ہیں
جادہ کے خط کو دیکھ سر راہ گزار سبز
ہر چیز زیب تن ہے کئے حلہ بہشت
میدان و کوہسار یمین و یسار سبز
ہر نخل سبز، سبز زمین پر ہے جھومتا
گویا ہے اسپ سبزہ کے اوپر سوار سبز
ممکن ہے پڑ گئی ہو تن مردہ میں بھی جان
جوش نمو میں ہے رگ سنگ مزار سبز
سبزے سے ہے جو خاک کا عنصر بدل گیا
ہے توسن نسیم سے اٹھتا غبار سبز
اس میں ہے حسن شاہد قدرت چھپا ہوا
گویا کہ ہے نقاب رخ پردہ دار سبز
دنیا کا ذرہ ذرہ شہیدوں کی خاک ہے
شاید قبا انہیں کی ہے یہ یادگار سبز
جس جا پہ دخل آب ہے سبزہ کی ہے نمود
کیونکر ہر ایک شعر نہ ہو آبدار سبز
خامہ تھا چوب خشک جو محو بیان ہوا
ذکر بہار سے ہوا پھر ایک بار سبز

(۲)

وہی دیدہ ور اور اہل نظر ہے
جو پتھر کے اندر شرر دیکھتا ہے
ملے ہیں جو مٹی میں ناچیز دانے
وہ ان میں شجر اور ثمر دیکھتا ہے

تو پھولوں میں بس رنگ و بو ہی کا طالب
وہ کلیوں کا زخم جگر دیکھتا ہے
اشارے سمجھتا ہے ہر برگ گل کے
رموز آشنا کچھ ادھر دیکھتا ہے
نگاہوں کو جس تک نہیں ہے رسائی
وہ ہر شے میں اس کا اثر دیکھتا ہے
تجھے چشم بے نم سے دکھتا نہیں ہے
وہ جو حسن با چشم تر دیکھتا ہے
سمجھتا ہے تو جس کو شبنم کا قطرہ
وہ اس میں ضیائے گہر دیکھتا ہے
ہنر میں بھی کرتا ہے تو عیب چینی
وہ عیبوں کے اندر ہنر دیکھتا ہے

(۳)

اس نظم کو اقبال نے بہت پسند کیا اور جب آغا حشر کاشمیری تک اس کی گونج پہنچی تو آپ نے خلیفہ صاحب سے فرمایا: ''یہ اشعار میرے دماغ میں گونجتے رہتے ہیں۔ میں نے ایک دفعہ اس زمین میں کچھ کہنے کی کوشش کی تھی لیکن افسوس کہ اس پایہ کے اشعار نہ نکل سکے۔ اس سے بڑھ کر تمہیں اور کیا داد دوں؟''

کون کہتا ہے تجھے دیدہ تر پیدا کر
بارش تیر حوادث میں جگر پیدا کر
گرم رو ہو کر جہاں نقش قدم ہو تیرا
اس کف خاک میں بھی برق کے پر پیدا کر
تو اگر چاہے کہ گم ہو شب تاریک تری
سینہ چاک بہ انداز سحر پیدا کر
قطرہ آغوش تلاطم میں گہر بنتا ہے
آبرو چاہے تو طوفان میں گہر پیدا کر

3

بزرگ خوش گفتار

محمد باقر

''آئیے ایئر فورس تو ہوتی ہی رہے گی۔ اب دفتر میں چلیں۔ وہاں فرصت سے باتیں ہوں گی۔'' ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے کہا......

یہ ۱۹۴۵ء کا واقعہ ہے، میں رائل انڈین ایئر فورس کے نمائندہ کی حیثیت سے کشمیر کا دورہ کرتے ہوئے سری نگر پہنچا تھا۔ ایک دن میں نے ریاست کے کالج میں طلبا سے خطاب کیا تو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے پرنسپل کی حیثیت سے اس جلسہ کی صدارت کی۔ میں نے اس سے پہلے ان کا نام سن رکھا تھا اور کبھی کبھی ان کی نظمیں بھی پڑھی تھیں لیکن ملاقات کا فخر صرف آج حاصل ہوا تھا۔ جلسے سے فارغ ہوئے تو خلیفہ صاحب مجھے اپنے دفتر میں لے گئے اور چائے اور شیرینی منگوائی۔ میرا خیال تھا وہ ایئر فورس کے متعلق مجھ سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں لیکن بات اقبال سے چلی اور رومی پر آ کر ختم ہوئی اور میں ان کی خوش گفتاری کا گہرا تاثر لے

خواہش تیغ کو ہے قوت بازو کی بھی شرط
آرزو تاج کی ہے تجھ کو تو سر پیدا کر
تیغ ہستی کے لیے سنگ فساں ہے پیکار
راہ ایمن ہے تو خود اس میں خطر پیدا کر

زندگی اور وقت

طرز زیست سے اس کو ماپ
اس کو نہ ماہ وسال سے گن
خضر کی عمر سے ہے بہتر
ہمت و خوبی کا اک دن
کانٹے کی ہے عمر دراز
پھول حسین ہے پر کم سن
صدی پہ بھاری اک ساعت
یہ اعجاز بھی ہے ممکن دل تخلیق سے ہے زندہ
کام ہے ہستی کا ضامن
وقت ہے دولت بیش بہا
انسان ہے اس کا خازن
کرے حفاظت تو ہے امیں
اور گنوا دے تو خائن
جینا ان کا جینا ہے
جو انسان کے ہیں محسن
وقت کا دشمن ہے کافر
وقت کا عاشق ہے مومن
جس کا وقت ابد پیوند
کہتے ہی اس کو مومن

کر رخصت ہوا۔

تاسیس پاکستان کے بعد خلیفہ صاحب مستقل طور پر لاہور آ گئے اور ادارہ ثقافت اسلامیہ کے مدیر و موسس کی حیثیت سے انہوں نے ایک وسیع دائرہ فکر و عمل قائم کیا۔ ان کی عملی زندگی کا ثبوت وہ گرانمایہ کتابیں ہیں جو ادارہ ثقافت اسلامیہ نے چند سالوں میں کثیر تعداد میں شائع کی ہیں۔ میں نے ایک دفعہ ان کے اس کام کی تعریف کی تو انہوں نے بڑی صدقدلی سے فرمایا:

''تنہا خود کام کرنا اتنی اہمیت نہیں رکھتا جتنا اپنے گرد ان آدمیوں کو جمع کرنا جو آپ کے ساتھ مل کر آپ کے کام کو آگے بڑھائیں......'' پھر انہوں نے دارالمصنفین اعظم گڑھ کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

''شبلی نے بہت کام کیا۔ اس کے کام کی وجہ سے میرے دل میں اس کا بے حد احترام ہے۔ لیکن دارالمصنفین کی تاسیس شبلی کا ایسا کارنامہ ہے جو اس کی اپنی تالیفات کے مقابلے میں بہت وقیع ہے۔ یہی وہ ادارہ ہے جہاں شبلی نے اپنے اردگرد ایسے آدمی جمع کر لئے تھے جو اس کے تالیف و تصنیف کے منصوبوں کو عملی جامہ پہناتے تھے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں!''

پھر دیر تک ایسے اداروں کا تجزیہ کرتے رہے جو استقلال پاکستان کے بعد قائم ہوئے تھے لیکن ان کی باگ ڈور ایسے آدمیوں کے ہاتھ میں دے دی گئی تھی جو خود کام کرتے نہ کسی سے کام لینا جانتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ لاکھوں روپے خرچ کرنے کے باوجود ان کی سرگرمیوں کا کوئی عملی ثبوت دنیا کے سامنے نہیں آ رہا تھا۔

جن دنوں خلیفہ صاحب سے میرے رشتہ موانست میں وسعت پیدا ہوئی وہ لاہور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی تاسیس کر چکے تھے۔ ایک دن ادارے کا نام زیر بحث آ گیا۔ فرمانے لگے:

''آپ نے کبھی سوچا کہ میں نے اس کا نام اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کیوں نہیں رکھا، اسلامک کلچر انسٹیٹیوٹ کیوں رکھا ہے؟'' میں نے عرض کیا بظاہر کوئی خاص وجہ تو معلوم نہیں ہوتی سوائے اس کے کہ آپ نے ادارہ ثقافت اسلامیہ نام رکھ کر ادارے کا دائرہ عمل وسیع تر کر لیا ہے۔ کہنے لگے: ''آپ ٹھیک سمجھے۔ اگر میں اس کے نام کو صرف اسلامی تحقیق

تک محدود کر دیتا تو ہم مذہب کے دائرے سے باہر نہ نکل سکتے۔ اسلامی ثقافت Islamic Culture کے نام نے ادارے کے لیے کام کی بہت سی راہیں سجھائی ہیں، ان میں مذہب بھی شامل ہے!''

شبلی کے تتبع میں خلیفہ صاحب مرحوم نے بھی شروع شروع میں جب ادارے میں موزوں آدمی جمع کرنے شروع کیے تو انہیں کئی دفعہ مایوس ہونا پڑا۔ ان کی ابتدائی جمع آوری تھوڑی ہی دیر کے بعد انتشار کی شکل اختیار کر جاتی اور چند حضرات کسی نہ کسی عذر پر ادارے سے کنارہ کش ہو جاتے۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا: آپ انتخاب کے وقت احتیاط کیوں نہیں کرتے؟ کہنے لگے:

''یہ محض آپ کا خیال ہے کہ میں اپنی کوشش میں ناکام رہتا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ میں شروع ہی سے سمجھ لیتا ہوں کہ جس آدمی کو میں کام پر لگا رہا ہوں جب یہ تھوڑی سی آسودگی حاصل کر لے گا تو ادارے کو خیر باد کہہ دے گا۔ ایسے اداروں سے مستقل طور پر منسلک رہنے کی تربیت نہ ہمارا ماحول دیتا ہے نہ ہماری یونیورسٹیاں۔ اس لئے ایسے اداروں کے لیے زندگیاں وقف کر دینے والے لوگ پیدا کرنے میں ابھی وقت لگے گا۔'' پھر ہنستے ہوئے کہا: ''لیکن آپ نے یہ نہیں دیکھا کہ جو آدمی اس ادارے میں دلچسپی سے کام نہیں کرتا میں اسے اس سے بہتر جگہ پر بھجوا دیتا ہوں تا کہ مزید مالی منفعت حاصل کر کے وہ زیادہ مطمئن ہو کر کام کر سکے!''

خلیفہ صاحب کو قدرت نے حسن کلام کا عجیب ملکہ عطا کیا تھا۔ موضوع خواہ کوئی ہو ان کے پاس اس کے متعلق اس قدر بھرپور مواد ہوتا تھا کہ نہ لوگ سنتے تھکتے تھے اور نہ وہ سناتے۔ ان کا حافظہ بے حد قوی تھا۔ ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ گفتگو کا اسلوب انہوں نے مسلسل تجربے اور غور و فکر سے تراشا تھا۔ کئی دفعہ میں غیر ملکی سیاحوں کے ہمراہ ان سے ملا تو مجھے محسوس ہوا کہ ان کی گفتگو کا انداز مختلف اوقات میں مختلف ہوتا ہے۔ ایک دن میں نے ان کی گفتگو کی مختلف سطحوں پر بات شروع کر دی۔ کہنے لگے: ''میں اپنے مخاطب کو ہمیشہ اپنی سطح پر کھینچ لاتا ہوں۔ اگر اس کی ذہنی سطح مجھ سے بلند ہو تو میں اسے نیچی سطح پر لے آتا ہوں۔ بڑے آدمی میری اس کوشش کے ساتھ نہایت خندہ پیشانی سے تعاون کرتے تھے لیکن اب اس عمر میں مجھے اکثر ان لوگوں سے سابقہ پڑتا ہے جن کی ذہنی سطح مجھ سے فروتر ہوتی ہے۔ ایسی

صورت میں میں ہمیشہ اپنے آپ کو نیچی سطح پر لے آتا ہوں اور اس طرح میری گفتگو دوسرے آدمی کے لیے خوشگوار بن جاتی ہے۔"

پھر گفتگو کا سلسلہ دراز ہوا تو انہوں نے اپنے بچپن کا ایک واقعہ سنایا کہ میری بڑی بہن مجھے بچپن ہی میں کہا کرتی تھیں "حکیم! تو باتوں کی کمائی کھائے گا۔" دیکھئے! ان کی پیشینگوئی کس طرح پوری ہوئی۔ قدرت نے مجھے اس پیشے کے راستے پر ڈالا جہاں میں باتیں کر کے ہی کسب معاش کرتا رہا۔ (اس سے ان کی مراد یہ تھی کہ انہوں نے معلمی کا پیشہ اختیار کر لیا)۔

دانشگاہ پنجاب میں ایک مرتبہ "روز رومی" منایا گیا۔ چونکہ آپ مولوی کے متخصصین میں سے تھے میں نے آپ سے صدارت کی درخواست کی۔ کہنے لگے "اس شرط پر قبول کرتا ہوں کہ آپ مقالہ پڑھنے پر مجبور نہ کریں۔" میں نے یہ شرط مان لی۔ ہم نے دوسرے حضرات سے مختصر مقالات لکھنے کی استدعا کی جو انہوں نے قبول فرمائی۔ چنانچہ مقالات کا سارا پروگرام تقریباً آدھ گھنٹے میں ختم ہو گیا۔ آخر میں صاحب صدر کی باری تھی۔ خیال تھا کہ پانچ دس منٹ میں آپ صدارتی تقریر ختم کر دیں گے۔ لیکن جب آپ کھڑے ہوئے تو مسلسل ایک گھنٹے تک گل افشانئ گفتار سے سامعین کو نوازتے رہے۔ سحر تکلم کا یہ عالم تھا کہ سینیٹ ہال کے سکوت میں سانسوں کی سرسراہٹ بھی سنائی دیتی تھی۔

خلیفہ صاحب کو اُردو سے والہانہ عشق تھا۔ چند سال پیشتر جب میں نے سابقہ پنجاب میں اُردو کی ترویج و اشاعت پر انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں ایک مقالہ پڑھا تو بعض حضرات کے دل میں بدگمانی پیدا ہو گئی۔ یار لوگوں نے بہت لے دے کی۔ ایک دن خلیفہ صاحب اورینٹل کالج کے ایک جلسہ میں شرکت کے بعد رخصت ہونے لگے تو میرے ایک ہمکار نے ان سے سرگوشی میں میری شکایت کی۔ میں نے زندگی میں پہلی مرتبہ ان کے ہونٹوں سے معاً مسکراہٹ غائب ہوتے دیکھی۔ وہ پلٹ کر غصے سے میری جانب لپکے اور کہا: "کیا یہ صحیح ہے؟" میں نے وضاحت چاہی تو تفصیل بیان کرنے کی بجائے مجھ پر برس پڑے اور جب میں نے صورتحال کی تفصیل پیش کی اور کہا: "آپ کا مخبر بڑا عیار ہے۔ آپ اس کے داؤ میں مت آئیں۔" تو آپ ہنستے ہوئے مجھ سے بغلگیر ہو گئے اور کہنے لگے: "میں خود بھی باور کرنے کے لیے تیار نہ تھا لیکن اُردو کی بات سن کر مجھ سے رہا نہ گیا۔"

خلیفہ صاحب نے اپنی عمر کا بہت سا حصہ مرحوم احمد شاہ بخاری، حضرت علامہ اقبال، مولانا صدر الدین اور اپنے زمانے کی دیگر عظیم شخصیتوں کی صحبت میں گزارا تھا۔ وہ ان صحبتوں اور محفلوں کے قصے بڑے مزے لے کر سنایا کرتے تھے۔ میں نے ان سے یہ طے کر رکھا تھا کہ چند نشستوں میں یہ لذیذ حکایتیں ان کی زبان سے ٹیپ ریکارڈ پر منتقل کروں گا۔ لیکن:

ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال

تیس جنوری سنہ ۱۹۵۹ء کی دوپہر کو کراچی میں جب کنگرہ نویسندگان (رائٹرز گلڈ) کی کمیٹیوں کا کام ختم ہو گیا تو ہمیں کچھ دیر کے لیے فرصت نصیب ہوئی۔ طے یہ پایا کہ دوسرا اجلاس ڈھائی بجے شروع ہو۔ رائٹرز گلڈ کے یہ افتتاحی جلسے کے جی۔ ہال کراچی میں ہو رہے تھے۔ صبح کا اجلاس ختم ہونے پر ہم ہال سے باہر نکل آئے۔ میں نے سوچا کہ فراغت کا کچھ وقت میسر آیا۔ اورینٹیل کالج کے متعلق لاہور سے آنے والی متوحش خبروں کے بارے میں لاہور کے ان دوستوں سے استفسار کروں جو یہاں بین الاقوامی مذاکرہ میں شمولیت کے لیے ہوٹل میٹرو پول میں مقیم ہیں۔ ان میں ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم بھی شامل تھے۔ ایک خیال یہ تھا کہ کھانا کھا کر محبِ گرامی ممتاز حسن صاحب سے بھی ملاقات کی جائے۔ چنانچہ میں گاڑی لے کر سیدھا وزارت دارائی میں پہنچا۔ دربان سے اطلاع دینے کو کہا تو جواب ملا: ''صاحب! آج جمعہ ہے۔ بارہ بج چکے ہیں اور دفتر بند ہو گیا ہے۔ ممتاز صاحب شاید جا چکے ہوں گے۔'' میں نے کہا: ''اجازت ہو تو ٹیلیفون کر لوں؟'' ٹیلیفون کیا تو ممتاز صاحب کی سیکرٹری نے کہا ''تھوڑی دیر ٹھہر کر ٹیلیفون کر لیں۔ ممتاز صاحب ابھی کام سے فارغ ہو جائیں گے۔'' میں نے سوچا ڈاکٹر رفیع سے مل لوں۔ یہ اقبال اکیڈمی کے ڈائریکٹر تھے۔ ان کا دفتر وزارت دارائی کے بالمقابل تھا۔ چنانچہ میں ان کے کمرے میں جا گھسا۔ آپ وضو کر رہے تھے۔ علیک سلیک کے بعد میں نے فوراً ہوٹل میٹرو پول ٹیلیفون کیا۔ مقصد محض خلیفہ عبد الحکیم سے ملاقات کر کے لاہور کی صورتحال معلوم کرنا تھا۔ ہوٹل سے جواب ملا کہ خلیفہ صاحب سیمینار (مذاکرہ) کا صبح کا جلسہ بھگتا کر وزارت دارائی میں کسی دوست سے ملنے چلے گئے ہیں۔ اس وقت ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ میں نے ٹیلیفون پر ممتاز حسن صاحب کا نمبر گھمایا۔ رائٹرز گلڈ کنونشن کی مصروفیتوں کے پیش نظر میں چاہ رہا تھا کہ ممتاز صاحب کی خدمت میں حاضری کے لیے

ان سے اتوار کا دن مقرر کروالوں۔ اس حاضری کے لیے معمولی بے قراری کچھ اس بناء پر بھی تھی کہ چند ہی روز پیشتر ممتاز صاحب بعض نادر مخطوطات جمع کر کے لائے تھے جو انہیں اپنے اسلاف سے نسلاً بعد نسلاً ورثہ میں ملے تھے۔

ریسیو اٹھایا تو سیکرٹری کی مرتعش آواز سنائی دی۔ میں نے اس آواز پر کان دھرے بغیر اپنا عندیہ بیان کیا تو وہ اصرار کرنے لگی کہ آپ خود ممتاز صاحب سے بات کیجئے۔ ایک لمحہ بعد ممتاز صاحب کی آواز سنائی دی ''آپ کہاں ہیں؟'' میں نے کہا ''ڈاکٹر رفیع کے کمرے میں!'' بلا توقف کہا ''آپ فوراً میرے کمرے میں چلے آیئے، خلیفہ عبد الحکیم صاحب کو غش آ گیا ہے۔''

میں ریسیور رکھ کر بھاگا۔ وزارت دارائی کی سیڑھیاں پھاندتا ہوا سیدھا ممتاز حسن صاحب کے کمرے میں پہنچ گیا۔ ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صوفے پر لیٹے پڑے تھے۔ ایک ڈاکٹر انہیں انجکشن دے رہا تھا۔ ٹیکا لگا کر ڈاکٹر نے نبض پر ہاتھ رکھا۔ پھر دل کی دھڑکن سنی اور یاس و اضطراب سے بھرپور چہرہ میری جانب کر کے سر کو منفی انداز میں جنبش دی۔ میرے سینے سے بے اختیار ایک کراہ نکلی: ''فوت ہو گئے؟''

''ہاں!''

ڈاکٹر نے پاس ہی پڑا ہوا ایک تولیہ خلیفہ صاحب کے چہرے پر ڈال دیا۔ کسی نے مجھ سے کہا ''ممتاز صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔'' میں غم والم کا پہاڑ سینے پر رکھے متصلہ کمرے میں آیا۔ ممتاز صاحب بے حس و حرکت سر جھکائے بیٹھے تھے۔ ماحول پر ایک سکتہ سا طاری تھا، ایک سناٹا جو ہم سب کو جذب کیے ہوئے تھا۔ بالآخر میں نے عرض کیا: ''آخر ہوا کیا؟''

ممتاز صاحب نے بتایا ''ابھی تھوڑی دیر ہوئی خلیفہ صاحب میرے کمرے میں آئے اور کہنے لگے ''میں حافظ مجید صاحب سے مل کر آ رہا ہوں۔ آپ کا باتھ روم کس طرف ہے؟'' میں انہیں باتھ روم کی طرف لے گیا۔ وہ وہاں سے غیر معمولی دیر سے لوٹے اور میری میز کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ میں کاغذات سنبھال رہا تھا۔ میں نے کہا: ''خلیفہ صاحب آپ تشریف رکھیں ذرا کام ختم کر لوں تو فراغت سے باتیں کریں گے۔'' جب ان کی طرف سے اس بات کا کوئی جواب نہ ملا تو میں نے کاغذات سے نظریں اٹھا کر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ ان کی سانس پھولی ہوئی ہے۔ انہوں نے دایاں ہاتھ دل پر

رکھ کر کہا:
"My heart! This has never happened before"
(میرا دل۔ پہلے کبھی یوں نہیں ہوا۔)
میں نے کہا آپ جلدی سے لیٹ جائیے۔ وہ صوفے پر دراز ہو گئے۔ میں نے کرنل جعفر کو ٹیلیفون کیا۔ انہوں نے یہ ڈاکٹر بھیج دیا اور بس!"

سوا ایک بج چکا تھا۔ خلیفہ صاحب کے چھوٹے بھائی ممتاز صاحب خاموش ہو گئے۔ خلیفہ عبد الغنی اور ان کے عزیز حمید غنی صاحب کو ٹیلیفون کیا گیا۔ حمید غنی صاحب نے آتے ہی پی۔ آئی۔ اے کو ٹیلیفون کیا۔ تھوڑی دیر بعد خلیفہ عبد الغنی بھی پہنچ گئے۔ ایمبولینس کار منگائی گئی۔ پہلے اس میں لاش لے جانے کا صندوق لایا گیا۔ اس صندوق کو صوفے کے قریب رکھ کر میں نے اور حمید غنی صاحب نے لاش کو اس میں رکھنا چاہا۔ لیکن اس میں کامیابی نہ ہوئی۔ چلتا پھرتا اور ہنستا بولتا انسان ابھی ابھی اس کمرے میں داخل ہوا تھا، اب صوفے پر ریت کے ذروں کی مانند بکھرا پڑا تھا۔ حمید غنی اور میں لاش کو اٹھاتے اور وہ صوفے پر پھسل پھسل جاتی۔ اللہ اللہ! عبرت و نصیحت کا کیا سماں تھا!

کراچی آنے سے چند روز پیشتر ہم دونوں لاء کالج کے ایک مباحثے میں منصف تھے۔ رات بھیگ گئی تو میں نے کہا: "خلیفہ صاحب اجازت دیں میں گھر ٹیلیفون کر دوں تا کہ بیوی کھانے کے لیے انتظار نہ کرے" فرمانے لگے! "ٹیلیفون ضرور کرو، لیکن بھوک تو نہیں لگ رہی۔ آج اس کافی اور کیک پر گزر کرو۔" پھر بڑے مزے سے وہ کیک کھانے لگے جو منتظمین نے پیش کیا تھا۔

اور پھر اس سے چند روز پیشتر ہم دونوں ریڈیو پاکستان لاہور سے "مثالی تعلیم میں اسلامی تعلیم کا حصہ" پر بحث کر رہے تھے۔ بحث سچ مچ کی بحث تھی۔ یعنی ہم دونوں کچھ لکھ کر نہیں لے گئے تھے اور نہ ہی کسی قسم کا ریہرسل کیا تھا۔ طے یہ پایا کہ پہلے میں کچھ سوال کروں گا اور خلیفہ صاحب جواب دیں گے۔ پھر خلیفہ صاحب سوال کریں گے تو میں جواب دوں گا۔ لیکن ہوا یہ کہ جب میں نے ایک دو سوال کیئے تو خلیفہ صاحب یوں محو گفتار ہوئے کہ مجھے سوال سننے یا جواب دینے کی مہلت ہی نہ ملی اور تقریر کا وقت ختم ہو گیا۔ سٹوڈیو سے باہر نکلے تو کہنے لگے: "آپ نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ ساری میری تقریر ہی ریکارڈ ہو گئی۔" میں نے

عرض کیا یہ بھی اچھا ہوا۔ آپ کی تقریر سننے میں جو لذت حاصل ہوتی ہے وہ آپ کے سامنے تقریر کرنے سے حاصل نہیں ہوتی اور پھر جب آپ تقریر کرنا شروع کرتے ہیں تو آپ کو سنبھالنا بھی تو دشوار ہو جاتا ہے۔ اس پر خلیفہ صاحب نے ایک قہقہہ لگایا۔

اور آج یہ جسد بے جان مرنے کے بعد بھی ہم سے نہیں سنبھالا جا رہا تھا۔ مایوسی کے عالم میں میں ان کی کلائی سے گھڑی اتار کر لاش سے الگ ہو گیا۔ گھڑی ٹک ٹک کر رہی تھی۔ ٹھیک ڈھائی بجے تھے۔ گھڑی پہننے والے کے دل کی ٹک ٹک بند ہو چکی تھی۔ وزارت دارائی کے ملازموں نے ہماری بے بسی دیکھ کر اب آگے بڑھ کر لاش کو سنبھالا اور صندوق میں ڈال دیا۔ اسلامی مذاکرہ کا نشان کوٹ پر چمک رہا تھا۔ صوفے کے ساتھ آپ کا بستہ Briefcase پڑا ہوا تھا جس پر مذاکرہ کا لیبل لگا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ایک فائل پڑی تھی۔ صوفے کے ایک طرف آپ کے جوتے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے گھڑی خلیفہ عبد الغنی کو دے دی۔ بوٹ اور بستہ خود اٹھا لیا۔ صندوق کے ساتھ چلتے ہوئے ہم زیرین منزل تک پہنچے۔ صندوق ایمبولینس کار میں رکھا گیا۔ میں نے بوٹ ساتھ رکھ دیئے۔ فائل بستر میں رکھ دی اور لیبل بستہ میں ڈال کر بند کر دیا۔ میں یہ سوچ رہا تھا کہ یہ بستہ اب اس کا مالک کبھی نہ کھول سکے گا۔ ایمبولینس کار چل دی اور میں ممتاز صاحب کے ساتھ ان کے مکان تک پہنچا۔ ان کو خلیفہ صاحب کی موت کا بے انتہا صدمہ تھا اور وہ ایک سکتہ کے عالم میں تھے۔ میں نے ان سے درخواست کی کہ آپ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر تمام واقعات سنائیں تا کہ آپ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو اور خود کنونشن میں شرکت کے لیے چلا گیا۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

4

خلیفہ صاحب کی ممتاز شخصیت

قاضی ایم۔ اسلم

خلیفہ عبدالحکیم میرے ذہن کے افق پر پہلے پہل اس وقت ابھرے جب وہ لاہور کے ایف۔ سی کالج میں تعلیم پاتے تھے۔ میں اس وقت امرتسر میں اسکول کے مدارج طے کر رہا تھا اور خلیفہ صاحب کا ذکر اپنے بھائیوں اور عزیزوں سے سنتا جو لاہور کے کالجوں میں پڑھتے تھے۔ ایک قابل نوجوان جس کی ملاقات بڑے بڑے آدمیوں سے ہے، جو خوداعتمادی میں، گفتگو میں، تحریر میں، تقریر میں اپنے ہم عمروں میں یکتا ہے اور پبلک جلسوں میں کھڑے ہو کر برملا اظہار خیال سے نہیں چوکتا۔ لیکن سائنس کے مضامین سے اسے کچھ کد ہے۔ شاید بزرگوں کے کہنے سننے پر سائنس کے مضامین لے رکھے ہیں لیکن دل کا ذوق کچھ اور قسم کا ہے۔ اس کے بعد یہ بھی کان میں پڑتا رہا کہ وہ یکتا نوجوان سائنس چھوڑ کر آرٹس کے مضامین لے کر علی گڑھ سے ایف۔ اے، بی۔ اے اور انجام کار مشہور سینٹ اسٹیفنز کالج دہلی سے

فلسفہ کا ایم۔اے بڑے امتیاز سے پاس کر چکا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب میں علی گڑھ کالج میں پڑھتا تھا۔ ایک روز ہماری سائنس ایسوی ایشن کا خاص اجلاس تھا۔ سائنس کے استاد تقریباً سب کے سب اس میں شریک تھے: ڈاکٹر ولی محمد، فیروز الدین مراد، مسٹر ایچ کرال وغیرہم، فیروز الدین مراد نے ایک بلیغ خطبہ پڑھا اور ایک جگہ رک کر ایک نوجوان کی طرف اشارہ کر کے اس کی تعریف کرنی شروع کی کہ ہماری قوم میں قابلیت کی کمی نہیں۔ اس پر ایک نہایت خوش لباس، خوش شکل گورا چٹا نوجوان اپنی کرسی میں اپنے آپ کو ذرا درست کرنے لگا۔ منہ پر حجاب کے آثار تھے گویا تعریف سے پانی پانی ہوا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا یہی خلیفہ عبد الحکیم ہیں جن کا ذکر کئی سال پہلے سے سن رہے تھے۔ بعد میں ان کو یونیورسٹی یونین میں تقریریں کرتے سنا اور مقابلے میں غصہ اور جوش دکھاتے دیکھا۔ واقعی شخصیت اور اچھی زبردست شخصیت۔ قدرت نے لیاقت اور ظاہری جاذبیت بھی دے رکھی تھی اور کردار کی طاقت اور تیزی بھی۔ وہ میرے بزرگ دوست اور کالج کے زمانے کے معالج ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ کے رشتہ میں بھائی تھے لیکن ان کو قریب سے دیکھنے کا ابھی موقع نہ ملا تھا۔ میں نے علی گڑھ میں تعلیم کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم۔اے کیا اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کے اسٹاف میں ایک سال رہ کر پنجاب گورنمنٹ کی سروس میں آ گیا اور انجام کار گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور نفسیات کے شعبہ میں پڑھانے لگا۔ اس عرصہ میں کیمبرج یونیورسٹی میں بھی دو سال رہ کر تعلیم حاصل کی۔ خلیفہ عبد الحکیم بھی اپنے طبعی مذاق یعنی فلسفہ کی تعلیم جرمنی میں مکمل کر کے عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر بن چکے تھے۔ لاہور اکثر آنا جانا رہتا۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ فلسفہ کے صدر پروفیسر جی۔ سی چٹرجی تھے جو ۱۹۲۱ء سے ۱۹۳۹ء تک اس عہدے پر سرفراز رہے اور گویا شمالی ہند میں فلسفہ و نفسیات کے بے شمار ہندو، سکھ مسلمان شاگردوں کے استاد اور علمی ذوق شوق، مطالعہ اور سوچ بچار میں ان کے لیے نمونہ تھے۔ چٹرجی غیر معمولی قابلیت کے اسکالر اور بڑی کشش رکھنے والے استاد تھے۔ ان کے لیکچر میں ایک سحر کا سا اثر ہوتا اور پڑھائی کا یہ گھنٹہ ایک سکوت اور کامل استغراق کا گھنٹہ ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں معلوم ہوا کہ چٹرجی سینٹ اسٹیفنز کے اس زمانے کے ایم۔اے ہیں جس زمانے کے اور بھی کئی ایم اے ہیں جن میں سے سب نے اپنے اپنے حلقے میں اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق نام پیدا کیا ہے۔

پروفیسر ایم۔ ایم شریف جو برسوں علی گڑھ کے شعبہ فلسفہ کے صدر رہے اور پاکستان بننے کے بعد اسلامیہ کالج لاہور کے پرنسپل اور اس وقت انسٹیٹیوٹ آف اسلامک کلچر کے ڈائریکٹر (گویا اس زمرہ میں خلیفہ عبدالحکیم کے جانشین) اور پاکستان فلاسفیکل کانگریس کے بانی اور مستقل صدر اور پاکستان کے متعدد علمی اور تعلیمی کاموں اور منصوبوں کے سربراہ۔ وہ بھی اس زمانے کے سینٹ سٹیفنز کالج دہلی کے ایم۔ اے ہیں۔ میرے دوست اور استاد اور گورنمنٹ کالج لاہور میں برسوں کے ساتھی ملک احمد حسین حال پرنسپل اسلامیہ کالج گوجرانوالہ بھی اسی زمانے کے ہیں۔ اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر عبدالرحیم نیازی بھی جن کے بے شمار شاگردان سے والہانہ تعلق رکھتے ہیں اسی زمانے کے ہیں۔ کچھ اور بھی مثلاً پروفیسر برکت اللہ جو کچھ زمانہ تعلیم و تدریس میں رہ کر بعد میں پادری بن گئے۔ پروفیسر اسرائیل لطیف بھی جو بڑے زمانے تک ایف۔ سی کالج لاہور کے شعبہ فلسفہ و نفسیات کے کرتا دھرتا رہے اور نفسیاتی معالج کے طور پر کام کرتے تھے اسی زمانے کے تھے۔ یہ سب اور ان کے آگے پیچھے کئی اور فلسفہ کی تعلیم پانے والے شمالی ہند کے ایک مشہور اور یاد رہنے والے استاد مسٹر این کے سین کے شاگرد اور ان کی علمی عظمت اور مشفقانہ کردار کا گویا ثبوت ہیں۔ اس تعلق کی وجہ سے خلیفہ عبدالحکیم بھی لاہور آتے تو چٹرجی سے ملتے اور ہمیں بھی خلیفہ صاحب کی گفتگو اور ان کے لطائف اور نوک جھوک سننے کا قریب سے موقعہ ملتا۔ ایک تقریب اس وقت کی پنجاب لٹریری لیگ نے منعقد کی۔ (اس لیگ کے ذکر پر اس کے ان سیکرٹری مسٹر دیوراج چودھری کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس شخص نے برسوں ایک معیار اور ایک رفتار پر اس نہایت ہی دلچسپ اور مفید ادارے کو چلایا۔ اس میں بڑے سے بڑے ہندو سکھ مسلمان اہل علم، ہر فن اور ہر میدان کے دھنی شامل ہوتے اور اپنے افکار اور اظہار خیال سے دوسروں کو مستفید کرتے)۔ اس تقریب میں خلیفہ عبدالحکیم اپنی فلسفیانہ پوزیشن کو پیش کر رہے تھے۔ غالباً دو تین لیکچروں کا سلسلہ تھا۔ عنوان ''خدا اور انسان'' یا اس سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی خالق مخلوق میں جو صفاتی مشابہت اور صفاتی امتیاز پایا جاتا ہے اس کے پردے میں ایک مستقل فلسفہ حاضرین کے لیے پیش کیا جا رہا تھا۔ ہمارے لئے (یعنی لاہور کے نسبتاً کم عمر استادوں کے لیے) یہ تقریب خاص دلچسپی کا باعث تھی۔ ہم سب پر چٹرجی کے علم، فصاحت و بلاغت، انگریزی زبان پر قدرت اور تخیل اور فکر کی چمک دمک کا اثر تھا۔ چٹرجی آزاد خیال سہی لیکن ہندو نام کے عیسائی تھے۔ ان کی

لیاقت کے اعتراف کے ساتھ ہمیں کچھ رشک اور مقابلے کا احساس بھی ہوتا تھا۔ کیا کوئی مسلمان استاد فلسفہ بھی ان کی ٹکر کا ہے؟ خلیفہ عبد الحکیم کو دیکھ کر اور ان کی تقریر سن کر ہم کو یہ محسوس ہوا کہ کیوں نہیں ہے اور واقعی ہے بلکہ خود اعتماد اور مذاکرے میں ڈٹ کر لڑنے والا اور نہ ہارنے والا ہے جو لاہور میں پیدا ہوا اور لاہور ہی سے ابھر کر دکن کی ایک مشہور یونیورسٹی میں شعبہ فلسفہ کا صدر ہے۔ چٹرجی کیمبرج کے ایک استاد پروفیسر مور سے پڑھ کر اس جدید (اس وقت کے جدید) فلسفہ کے شارح بنے تھے جو اپنا سارا رنگ ڈھنگ طبعی سائنس سے لیتا ہے۔ گویا سائنس جب بالکل نظری اور نظریاتی ہو جاتی ہے اور اپنے تمام مشاہدات اور معروضات کو ایک جامع اور مانع بیان میں اتار کر پیش کرنے لگتی ہے۔ چٹرجی اس قسم کی سائنس کے ملتے جلتے فلسفہ کے داعی تھے۔ ان کو انگریزی زبان پر خاص قدرت حاصل تھی۔ تھوڑا پڑھاتے لیکن خوب اچھی طرح سے۔ نچوڑ ان کی شرح و بسط کا دہریت ہی ہوتا۔ مجھے یاد ہے کہ کئی موقعوں پر جب مذہب کے متعلق بحث چھڑ گئی تو وہ مذہب کے خلاف تھے اور باقی سب لوگ ان کے خلاف تھے۔ بعد میں مجھے محسوس ہونے لگا کہ وہ غالی دہریے نہ تھے بلکہ شاید دہریہ تھے ہی نہیں۔ صرف ماحول کا مقابلہ کرتے کرتے وہ دہریت کا دم بھرنے لگتے تھے۔ واللہ اعلم۔

بہر حال پنجاب لٹریری لیگ کے ان دو تین اجلاسوں میں خوب گہما گہمی رہی۔ خلیفہ عبد الحکیم مقرر اور چٹرجی صدر۔ ہر تقریر کے بعد سوال و جواب کا سلسلہ اور وہ بھی زیادہ تر مقرر اور صدر کے درمیان۔ خوب مزہ آتا تھا۔ دونوں کا نقطہ نظر کافی مختلف، جذباتی میلان بھی مختلف، کلچرل پس منظر بھی مختلف، انگریزی بولنے کا طرز بھی مختلف، چٹرجی نہایت لطیف انگریزی لہجے اور انگریزی اسٹائل کی انگریزی بولتے اور خلیفہ عبد الحکیم پنجابی طرز اور پنجابی سٹائل کی انگریزی بولتے لیکن ٹھوس اور نہایت صحیح۔ دونوں ایک دوسرے کی ٹکر کے تھے لیکن ایک فرق نمایاں تھا۔ چٹرجی باوجود ہر کمال کے بحث میں دب جاتے لیکن خلیفہ عبد الحکیم دبنے کا نام نہ لیتے۔ خلیفہ عبد الحکیم کا علمی مذاکروں اور علمی مجالس میں ہمیشہ یہی کمال نمایاں رہا (کم از کم میرے نزدیک) کہ وہ کسی سے دبنا نہ جانتے تھے۔ اس کی اور مثالیں بھی شاید آگے آئیں۔

پاکستان کی تحریک تیز ہونے پر خلیفہ عبد الحکیم عثمانیہ یونیورسٹی سے فارغ ہو کر اس

سے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک اپنے درجہ اور ایک خاص قسم کی عظمت کا مالک ہے۔ خلیفہ صاحب کا بھی ایک خاص درجہ اور جداگانہ مرتبہ ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ ان سب میں ایک بات مشترک ہے اور وہ تقلید اور مروجہ خیالات سے آزادی ہے۔ خلیفہ صاحب نے ان جیسا مقام تو حاصل نہیں کیا لیکن ان سے بہت کچھ لے کر اپنا ایک خاص مقام بنا لیا۔

خلیفہ صاحب کی کتاب اسلامک آئیڈیالوجی لبرل اسلام کی نمائندہ اور موثر تشریح ہے۔ کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے (میں خود بھی اس تشریح سے پورا متفق نہیں) لیکن لبرل اسلام ہمارے زمانے میں ایک خاص مکتب فکر ہے جس نے اسلام سے تعلق اور اس سے محبت اور اس کا احترام قائم رکھنے کے ساتھ ساتھ جدید دنیا کے خیالات اور اس کے پیش کردہ چیلنج کو سمجھتے اور قبول کرتے ہوئے اسلامی تاریخ، اسلامی تعلیمات اور اسلامی ثقافت کی وضاحت کی ہے۔ اس طرز فکر کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ اس سے مسلمانوں کا نو تعلیم یافتہ طبقہ اسلام سے واقف ہو گیا اور اس طبقے کا جذباتی اور علمی تعلق اسلام سے قائم رہا۔ دوسرا فائدہ اس طرز فکر کا یہ ہوا کہ مغربی مولفین اور مفکرین کو بھی اسلام کے متعلق مسلمانوں کا نقطہ نظر بڑی حد تک معلوم ہو گیا۔ یہ دو فائدے ہمارے زمانے کے کسی اور مکتب خیال سے اس طرح حاصل نہیں ہو سکے۔ جس طرح لبرل اسلام کے لٹریچر سے حاصل ہوئے۔

لبرل اسلام کیا ہے؟ لبرل اسلام دراصل اسلام کی ایک نرم قسم کی تشریح ہے جو اسلام کو مغرب کے لیے اور مغربی تعلیم اور مغربی افکار سے متاثر مسلمانوں کے لیے زیادہ قابل فہم بنا دیتی ہے اور یہ تشریح قابل قدر ہے کیونکہ اس کا فائدہ اسلام اور مسلمانوں اور مغرب اور مغربی افکار دونوں کو ہوا ہے۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ لبرل اسلام بعض مسائل میں بہت زیادہ نرمی سے کام لیتا ہے یا جدید خیالات اور جذبات سے زیادہ متاثر معلوم ہوتا ہے اور خلیفہ عبدالحکیم کے طرز فکر میں بھی اس کی کچھ مثالیں ملتی ہیں۔ اس کے باوجود خلیفہ عبدالحکیم کی تحریروں میں لبرل اسلام کے بہترین نقوش ملتے ہیں۔ جس کسی کو ان نقوش سے واقفیت پیدا کرنے کا شوق ہو (اور کسے نہ ہوگا؟) اس کے لیے لازمی ہے کہ وہ خلیفہ صاحب کی تحریروں کا بغور مطالعہ کرے۔

خلیفہ صاحب کی ذہانت اور تقریر و تحریر کی قدرت ان کے علاوہ تھی۔ پاکستان کی فلاسفیکل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی، پروفیسر میاں محمد شریف صاحب اس کے بانی مبانی اور

وقت کی حکومت کشمیر میں ڈائریکٹر تعلیمات بن گئے تھے۔ ان سے پہلے خواجہ غلام السیدین اسی عہدے پر رہ چکے تھے۔ لیکن خلیفہ صاحب کو یہ عہدہ پسند نہ تھا۔ وہ ڈائریکٹری کے کام کو بڑی کلرکی سے موسوم کرتے تھے۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ حکومت کشمیر مسلمان ڈائریکٹر تعلیمات رکھ کر اپنے ڈھب کا کام کروانا چاہتی تھی۔ اس لئے خلیفہ صاحب جلد ہی وہاں سے لاہور آ گئے۔ مجھے انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کی باتیں سننے کا موقعہ اسی زمانہ میں ملا۔ اب پاکستان بھی بن چکا تھا اور پاکستان کے مخصوص مسائل لوگوں کے سامنے آ رہے تھے اور سوچنے والوں کے دل و دماغ کو گرما رہے تھے۔ اس زمانے میں پہلے ان کی عزیز اور امرتسر کے مشہور بیرسٹر مسٹر سعید حسین کی بیٹی ثریا (بیگم ذکا رحمت اللہ) کو ایم اے سائیکالوجی میں داخل کروانے کے لیے گورنمنٹ کالج میرے پاس آئے اور پھر اپنی بیٹی رفیعہ (بیگم مسعود حسن) کو۔ یہ دونوں نہایت ہی ذہین اور پروقار طالبات ثابت ہوئیں اور دونوں اس وقت عائلی زندگی کی ذمہ داریوں کے علاوہ سائیکالوجی کی خدمت کا بار بھی اٹھائے ہوئے ہیں۔ ثریا کراچی یونیورسٹی میں لیکچرار کلینک کی انچارج ہیں اور رفیعہ پنجاب یونیورسٹی میں۔

خلیفہ صاحب کے فرزند عارف حکیم اس سے پہلے گورنمنٹ کالج سے ایم ایس سی پاس کر چکے تھے اور خلیفہ صاحب عارف کو بھی خود داخل کروانے آئے تھے۔ اس وقت بھی وہ ہمارے اسٹاف روم میں کافی دیر تک بیٹھے رہے اور لطائف و ظرافت اور اپنی دلچسپ گفتگو سے حاضرین کو محظوظ کرتے رہے۔ عارف اور رفیعہ (بیٹے اور بیٹی) کے ذکر پر یہ بات بھی یاد آئی کہ ایک دفعہ میں نے خلیفہ صاحب کے سامنے عارف کی تعریف کی اور کہا کہ بالکل آپ کی طرح ہے۔ خوش شکل، ذہین وغیرہ۔ تو اس کے جواب میں خلیفہ صاحب نے کہا کہ آپ ٹھیک کہتے ہیں لیکن میرا دماغ اور میرا علم رفیعہ کو ملا ہے۔

پاکستان کے بننے کے بعد جلد ہی یہ سننے میں آنے لگا کہ خلیفہ صاحب اسلام کے متعلق ایک کتاب کی تیاری میں مصروف ہیں۔ پہلے یہ سنا تھا کہ کتاب مختصر سی ہو گی، شاید رسالے کے برابر۔ لیکن جب کتاب شائع ہوئی تو اچھی خاصی ضخیم تھی۔ یہی وہ کتاب ہے جس سے خلیفہ صاحب کو پاکستان میں اور پاکستان کے باہر بڑی شہرت حاصل ہوئی اور جس کی وجہ سے وہ روشن خیال مسلمان مؤلفین اور مفکرین کی اس صف میں شامل ہو گئے جس میں سید احمد خان، سید امیر علی اور علامہ اقبال کھڑے نظر آتے ہیں۔ یہ نام ہمارے عظیم ترین ناموں میں

روح رواں تھے۔ لاہور میں پہلا سیشن منعقد ہونا قرار پایا۔ گویا لاہور میزبان تھا۔ اس لیے ضروری قرار پایا کہ اس سیشن کا صدر کوئی لاہور سے باہر کا ہونا ضروری ہے۔ مشرقی پاکستان کے ڈاکٹر ممتاز الدین احمد صاحب کی طرف خیال گیا۔ انتظام کے بعد انہوں نے کوئی عذر پیش کر دیا۔ پھر مشہور ادیب، محقق اور فلسفی مسٹر اللہ بخش خان بروہی کو دعوت بھیجی گئی۔ انہوں نے آمادگی کا اظہار کیا لیکن مشروط کر دیا۔ آخر میں جو شرط انہوں نے لگائی تھی (غالباً یہ شرط تھی کہ مجھے حکومت باہر امریکہ وغیرہ کسی کام پر انہی تاریخوں ہی میں نہ بھیج دے) وہ پوری ہوئی اور وہ بھی ہمارے ہاتھ سے نکل گئے اور دن بہت تھوڑے رہ گئے۔ آخر فیصلہ ہوا کہ اب مجبوراً فلاسفیکل کانگریس اگرچہ لاہور میں منعقد ہو رہی ہے اس کے پہلے سیشن کا صدر اگر لاہور ہی کا باشندہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب کو دعوت دی گئی، خیال نہ تھا کہ آپ اس قلیل وقت میں اپنا خطبہ صدارت لکھ دیں گے لیکن آپ نے نہ صرف ایک طویل خطبہ لکھ دیا بلکہ اتنے قلیل وقت میں لکھ دیا کہ ہم اسے چھپوانے کے بعد عین موقعہ پر تقسیم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور پاکستان میں فلسفہ کی ترویج اور فلسفیانہ تحقیقات کے فروغ کے لیے بعض نہایت ہی قیمتی تجاویز بھی پیش ہو گئیں۔ چنانچہ تاریخ فلسفہ اسلام جو اس وقت پاکستان حکومت کی زیر نگرانی مرتب ہو رہی ہے اسی خطبہ کی ایک تجویز کا نتیجہ ہے۔

اس قسم کی مثال گورنمنٹ کالج لاہور کی ایک کانووکیشن بھی ہے۔ اس کے لیے بھی نہایت قلیل نوٹس پر خلیفہ صاحب کو ایڈریس کی دعوت دی گئی جو انہوں نے بلا حیل و حجت قبول کی اور سرعت سے اپنا خطبہ مرتب کر کے بھیج دیا۔

خلیفہ صاحب کی ذہانت اور قوت بیان کا مظاہرہ خطبات اور مقالات کے لکھنے تک ہی محدود نہ تھا۔ اس کا مظاہرہ اس سے کہیں زیادہ ان کی برجستہ تقریروں میں ہوتا تھا۔ بسا اوقات ہماری فلاسفیکل کانگرس میں کوئی مذاکرہ بھی پروگرام میں رکھ دیا جاتا تھا اور مقررین تو یکے بعد دیگرے کوئی نہ کوئی عذر کر کے تقریر سے گریز کر جاتے لیکن خلیفہ صاحب سے جب کہا جاتا تو وہ ہر وقت تیار پائے جاتے اور اگر موضوع اقبال یا اقبالیات کی کوئی شاخ ہوتی تو پھر تو مذاکرے میں جان پڑ جاتی اور سننے والے نہ صرف سنتے بلکہ سر دھنتے۔

مجھے خلیفہ صاحب کی آخری تقریر سننے اور ان کی آخری تحریر دیکھنے بلکہ اس کا موجب ہونے کا موقعہ ملا۔ جنوری سنہ ۱۹۵۹ء میں کراچی میں ایک مذاکرے (سیمینار) کا

انعقام ہوا۔ اسی قسم کا جیسا کہ اس سے پہلے لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کی زیر نگرانی ہو چکا تھا۔ مسلمان عالموں کے علاوہ یورپ، امریکہ اور کینیڈا اور سیلون، سوڈان، لبنان وغیرہ کے اسکالر بھی شریک ہوئے۔ اسلام اور دنیائے جدید کے تقاضے زیر بحث تھے۔ مختلف صورتوں میں بار بار یہی ہوتا کہ مغربی اسکالر اور مسلمان اسکالر ایک دوسرے کے مدمقابل بن کر تقریریں کرتے اور بحث میں اکثر مناظرے کا رنگ پیدا ہو جاتا۔ باوجود اس کے کہ خلیفہ صاحب ایک لبرل مسلمان سمجھے اور مانے جاتے تھے اور خود میں نے بھی انہیں لبرل مسلمان کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ہم نے یہ دیکھا کہ جہاں اسلام اور مسلمانوں پر کوئی غیر مسلمان (مغربی یا غیر مغربی) نکتہ چینی کی جرأت کرتا وہاں اس کے جواب میں خلیفہ صاحب ہی سب سے زیادہ آمادگی اور سب سے زیادہ جرأت دکھاتے۔ لندن کی خاتون پروفیسر لمٹن نے اپنے مقالے میں کچھ اسی قسم کی باتیں کہی تھیں۔ خلیفہ صاحب نے اس کا مضمون وہیں اجلاس میں دیکھا۔ میں خلیفہ صاحب کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھا تھا اور میں نے بھی کچھ بے اختیار ہو کر کہہ دیا کہ مجھے اس مقالے سے دکھ ہوا اور جی چاہتا ہے کہ اس کا جواب دیا جائے۔ پھر کیا تھا خلیفہ صاحب اپنی باری پر اٹھے اور خوب مناظرانہ رنگ میں ترکی بہ ترکی جواب دیا جس سے طبیعت خوش ہو گئی۔ خلیفہ صاحب کا یہی وصف ان کو باقی لبرل مسلمانوں سے ممتاز کرتا ہے۔ باقی لبرل مسلمان اگر معذرت خواہ قسم کے نہیں ہوتے تب بھی ان کا شوق تبلیغ اور شوق دفاع اتنا تیز نہیں ہوتا جتنا خلیفہ صاحب کا تھا۔ اس شوق کے ساتھ ان کے دل میں اسلام کے مستقبل کے متعلق ایک امید اور ایمان پایا جاتا تھا جو ان کے اسلامی جوش کو باقی لبرل مسلمانوں سے ممتاز کر دیتا۔

مذاکرے کے اسی اجلاس میں میں نے رقعہ لکھ کہ ان کے سامنے رکھا (مذاکرے کے ادب کی وجہ سے زیادہ باتیں کرنے کا موقع نہ تھا)۔ میں نے لکھا تھا کہ وجود باری یا تصور باری تعالیٰ کے متعلق سید احمد خان، علامہ اقبال اور خلیفہ عبدالحکیم کے تصور اور طرز فکر میں ایک باریک فرق ہے جس پر ایک مقالہ لکھا جانا چاہئے اور یہ مقالہ خلیفہ صاحب کو ہی لکھنا چاہئے۔ جب میں نے یہ رقعہ ان کے سامنے رکھا تو انہوں نے سر ہلایا اور کہا کہ نہیں، اگر لکھنا ہے تو کوئی اور لکھے یا شاید مجھے کہا کہ تم لکھو۔ میں نے بھی سر ہلایا۔ اس پر انہوں نے رقعہ اٹھایا اور اس پر یہ شعر لکھ دیا:

بازیچہ کفر و دیں بہ طفلاں بسپار
بگذر از خدا ہم کہ خدا ہم حرفیست

یہ شعر خلیفہ صاحب کی آخری تحریر ثابت ہوا۔ دوسرے روز وہ مذاکرے میں شریک نہیں ہوئے کیونکہ بعض ضروری ملاقاتوں کا پروگرام تھا۔ انہی ملاقاتوں میں مسٹر ممتاز حسن سیکرٹری فنانس سے ملاقات بھی شامل تھی اور انہی کے دفتر میں خلیفہ صاحب نے اپنی جان، جان آفرین کے سپرد کردی۔

5

رفیقِ زندگی کی یاد میں

بیگم خدیجہ حکیم

یہ اس انسان کی قابل رشک زندگی کے چند پہلو ہیں جو واقعی اسم با مسمی تھا اور جس کے حکیمانہ انداز فکر و زیست کو میں نے ایک رفیقہ حیات کی حیثیت سے دیکھا ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر میں اپنے تجربہ کی بناء پر حکیم صاحب کی زندگی پر مجموعی طور سے روشنی ڈالوں تو اسی طرح ان کی گھریلو زندگی کی خصوصیات بھی نمایاں ہو سکتی ہیں کیونکہ وہ ان انسانوں میں سے تھے جن کی پوری زندگی خاص خاص اصولوں اور فلسفہ حیات کی پابند ہوتی ہے۔ ان کا رویہ اور اخلاق کچھ ایسا ہمہ گیر تھا کہ نہ صرف گھر والے اور دوست احباب بلکہ نوکر چاکر، امیر غریب، اپنے پرائے اور ہر وہ شخص جس کا کہ ان سے ذرا بھی واسطہ رہ چکا ہو اس کی گواہی دے سکتا ہے۔ ان کا انداز گھر والوں اور باہر والوں دونوں کی نسبت کافی حد تک یکساں تھا۔ لیکن باوجود اس یکسانیت کے ان کے بیوی بچوں، قریبی عزیزوں اور مخلص دوستوں سے ان کا گہرا جذباتی

ہے اور وہ اپنے جوہر کو نمایاں کر کے ملک اور قوم کی بہتر خدمت انجام دے سکتے ہیں۔ اگرچہ اس فیصلہ سے انہیں مالی نقصان بھی ہوا لیکن ان کے نزدیک زندگی کی اور بہت سی قدریں مالی فائدہ کی نسبت زیادہ قابل قبول تھیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان کو اپنی ضروریات سادہ اور مختصر رکھنی چاہئے تا کہ وہ اپنے آپ کو بیکار الجھاؤ میں پھنسا کر زندگی کی بلند تر قدروں کو حاصل کرنے سے محروم نہ رہ جائے اور مادی خواہشات اس کی شخصیت پر حاوی نہ ہو جائیں۔ مولانا روم کی روپیہ کے متعلق وہ مثال انہیں بہت پسند تھی جس میں کہ ایک شخص نے مولانا سے سوال کیا کہ کتنا روپیہ انسان کے پاس ہونا فائدہ مند ہے۔ مولانا نے فرمایا کہ اتنا ہی جتنا کہ کشتی کے لیے پانی کا ہونا ضروری ہے۔ اگر پانی ضرورت سے کم ہو تو کشتی کا چلنا محال ہو جائے گا اور اگر مقدار سے بہت بڑھ جائے تو اس کے اندر گھسنے کا اور ڈوب جانے کا خطرہ ہے۔ سو وہی حال روپیہ کا بھی ہے۔ یہ نہ تو اتنا کم ہو کہ بنیادی ضروریات بھی پوری نہ ہو سکیں اور نہ اتنا زیادہ ہو کہ اس کے بوجھ کے نیچے انسانی شخصیت دب کر مادہ پرست بن جائے۔ روپیہ کو تو ذریعہ یا آلہ سمجھنا چاہئے جس کی بدولت انسان کو زندگی کی بلند پایہ قدروں کو حاصل کرنے میں مدد ملے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ جب کہ ہم سب حسب معمول گرما کی تعطیلات کشمیر میں گزارنے کے لیے گئے ہوئے تھے اور ان دونوں وہاں پر امر سنگھ ڈگری کالج کی پرنسپلی خالی تھی تو راجہ سر مہاراج سنگھ نے جو ان دنوں کشمیر اسٹیٹ کے وزیر اعظم تھے حکیم صاحب کو اس عہدے پر آنے کے لیے آمادہ کر لیا۔ گو کہ اس فیصلہ سے انہیں کئی سو روپیہ ماہوار کا مالی نقصان ہوتا تھا۔ لیکن انہوں نے اپنے جدی وطن کی کشش، وہاں کے پر فضا موسم اور کشمیری برادران کی خدمت کو ترجیح دیتے ہوئے اس عہدے کو منظور کیا اور بعد میں کشمیر میں ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔

تقسیم ہند کے کچھ عرصہ بعد جب ادارہ ثقافت اسلامیہ پاکستان کی داغ بیل پڑی تو گویا کہ انہیں اپنا من پسند کام مل گیا اور ساتھ ہی ساتھ ایک ایسا نصب العین سامنے نظر آنے لگا جو کہ نہایت قابل قدر تھا اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے انتہائی موزوں بھی تھا۔ مذہب کا صحیح مفہوم واضح کرنا، فلسفہ اور مشرقی و مغربی علوم کی روشنی میں اسلامی تعلیمات کو منطبق کرنا اور ان تمام مسائل پر غور و فکر کرنا جن کو مذہبی احکام اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق حل کرنا ضروری ہے۔ یہ مقاصد ان کے لیے قابل قدر نصب العین بن گئے اور وہ اپنے

ہم خیال ساتھیوں کی مدد سے ان کو حاصل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گئے۔ کاش خدا انہیں کچھ اور مہلت دیتا کہ وہ اس مفید کام کے نتائج کو اپنے سامنے مکمل ہوتے ہوئے دیکھتے جس کے لیے وہ آخر دم تک کام کرتے رہے۔ یہ ادارہ ان کو اس قدر عزیز تھا کہ جب انہیں پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری پیش کی گئی تو انہوں نے اس کو نامنظور کر دیا محض اس خیال سے کہ جو کام وہ ادارہ میں رہتے ہوئے انجام دے رہے تھے وہ نامکمل رہ جائے گا۔

ان تمام واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اچھی طرح یہ جانتے تھے کہ وہ کس میلان اور صلاحیتوں کے انسان ہیں اور کونسا کام ان کے لیے زیادہ موزوں ہوسکتا ہے۔ گھر میں بھی وہ اپنے لئے ہمیشہ ایک گوشہ تنہائی بنا لیا کرتے تھے جہاں وہ مقررہ اوقات میں مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہتے تھے اور آرام بھی وہیں کیا کرتے تھے۔ گھر میں شور و غل اور نوکروں کے جھگڑوں سے کوسوں دور بھاگتے تھے کیونکہ ایک تو طبیعت صلح پسند تھی دوسرے دماغی کام کے لیے سکون قلب نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اس لئے گھر میں سب کو اس بات کا لحاظ رکھنے کی تاکید کی جاتی تھی۔ ویسے جب بھی وہ اپنے علمی کام سے فارغ ہوتے تو گھر والوں سے اور خاص طور سے بچوں سے دلچسپ باتیں کر کے سب کا دل بہلاتے تھے۔ اپنے بچوں اور خاص کر نواسی سے اور عام طور پر سب بچوں سے انہیں بے حد لگاؤ تھا۔ وہ ان سے ہر کام پیار و محبت سے نکال لیا کرتے اور کہتے کہ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ یا ڈر سے کام نکالنا غلط ہے۔ انہیں کچھ ڈھب بھی ایسا آتا تھا کہ زبردستی کام لینے کی ضرورت ہی پیش نہ آتی تھی۔ بچوں کو بھی ان سے بے حد لگاؤ تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ایک منٹ کے لیے بھی ان سے جدا نہ ہوں۔

حکیم صاحب کی زندگی کا اہم جز ان کی ظرافت و بذلہ سنجی تھی۔ حاضر جوابی کے لیے وہ اپنے احباب میں مشہور تھے اور ان ہی باتوں سے ہر محفل کی جان بن جاتے تھے۔ ان کی ظرافت میں لطافت کی آمیزش بھی ہوتی تھی اور روانی بھی۔ شاعری سے بھی خاص شغف تھا اور ان کا انداز فکر بھی اچھوتا ہی تھا۔ زمانہ طالب علمی ہی سے شاعری میں اچھا خاصا بلند معیار انہوں نے حاصل کر لیا تھا اور بعد میں بھی گاہے گاہے شاعری کی طرف توجہ کرتے رہتے تھے۔ گو کہ آخری زمانہ میں نثر ہی پر پوری طرح متوجہ رہے۔ غرض یہ کہ حکیم صاحب نے ایک قابل رشک زندگی گزاری اور اپنی ہمت، صلاحیت اور شوق سے وہ درجہ حاصل کیا جو کم لوگوں

مجھے ایسے قابل فخر باپ کی بیٹی بنایا۔

بچپن ہی سے جب سے میں نے ہوش سنبھالا میں نے انہیں اپنے ساتھ وقت کا بیشتر حصہ گزارتے ہوئے دیکھا۔ ان کی طبیعت میں انتہائی نرمی اور صلح پسندی تھی اور مجھے اپنے ہوش میں کوئی ایسا واقعہ نہیں یاد ہے کہ انہوں نے بچپن میں ڈانٹ ڈپٹ یا مار پیٹ سے کوئی کام لیا ہو۔ جس طرح دوسرے تمام معاملات میں ان کا طرز عمل عقل مندانہ تھا اسی طرح بچوں کے ساتھ بھی ان کا برتاؤ نفسیاتی تھا۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے "اگر خدا نے مجھے ماں بنایا ہوتا تو میں ہر کام بچوں سے بغیر رلائے لے لیتا۔ انہیں ہمیشہ سے بچوں سے خاص لگاؤ تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہ بھی انسان کے نیک ہونے کی نشانی ہے کہ کسی شخص کو بچوں سے اور بچوں کو اس سے لگاؤ ہو۔ نتیجہ یہ تھا کہ جو کام دوسرے لوگ بصد مشکل بچہ سے کرواتے اسے وہ محض ایک گر کی بات کر کے بچہ سے بخوشی کروا لیتے اور یہی حال ان کا دوسرے اشخاص سے تعلقات میں بھی تھا۔ اگر خاندان میں یا دوست احباب کے ہاں کوئی ایسا کٹھن مسئلہ پیش آ جاتا ہے وہ نہ سلجھا سکتے وہ دوڑے ہوئے ابا جان کے پاس آتے تھے اور وہ اسے اپنی صلح جوئی، صائب رائے اور معقول دلائل سے نہایت خوش اسلوبی سے طے کرا دیتے۔ جو بات بعض ٹیڑھے اشخاص کسی صورت میں بھی ماننے کو تیار نہ ہوتے تھے وہ بھی ان کے کہے سے مان جاتے۔ دراصل وہ جس کسی سے بھی ملتے اسے یہ یقین ہو جاتا کہ وہ اس سے سچی ہمدردی رکھتے ہیں اور ایک مرتبہ جب کسی کو ان کے خلوص اور ہمدردی کا یقین ہو جاتا تو پھر چاہے اس کو وہ کڑوی سے کڑوی یا سخت سے سخت بات ہی کیوں نہ کہتے وہ ہرگز برا نہ مانتا۔ ان کے بعض ملنے والے عموماً اس بات پر حیران ہوا کرتے تھے کہ خلیفہ صاحب لوگوں کو بہت کچھ کہہ جاتے ہیں اور کوئی برا نہیں مانتا۔ لیکن اگر ہم وہی بات کسی سے کہہ بیٹھتے ہیں تو لوگ بگڑ جاتے اور ہماری بات تک سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے!

ابا جان کا قول تھا کہ اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ آپ کے بچوں کی تربیت اچھی ہو اور وہ کسی قابل بنیں، آپ سے متاثر ہوں اور اچھی باتیں آپ سے سیکھیں تو لازمی طور پر آپ کو ان کے لیے وقت دینا پڑے گا۔ وہ آج کل کی نئی روش کے بعض والدین کے رجحان کے خلاف تھے کہ وہ اپنے معاملات اور سوشل زندگی میں اس قدر محو ہیں کہ بچوں کے لیے ان کے پاس کوئی وقت ہی نہ ہو کہ وہ ان سے کوئی کام کی بات سیکھیں یا اپنی دن بدن بڑھتے اور نئے

سانچوں میں ڈھلنے والی شخصیت کی نشوونما میں والدین کے تجربہ اور شفقت سے مستفید ہو سکیں۔ آئندہ قوم کی ترقی کے ضامن یہی آج کل کے بچے ہیں اور اگر ان ہی کی پرورش پر وقت اور محنت نہ صرف کی جائے تو پھر ان کے مستقبل سے کیا امیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں؟ چنانچہ ان کا عمل بھی ان کے قول کے مطابق ہی تھا اور انہوں نے ہماری تعلیم و تربیت کچھ اس انداز سے کی کہ ہمیں کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ ہماری اصلاح کے لیے خاص طور سے کوئی وعظ و تلقین کی جا رہی ہے یا ہم کو زبردستی بٹھا کر کوئی خشک تعلیمی درس گھول کے پلایا جا رہا ہے۔ انگریزی میں ایک مقولہ ہے کہ MEN SHOULD BE TAUGHT AS IF THEY WERE TAUGHT NOT چنانچہ ان کا طریقہ تعلیم بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ قدم قدم پر اٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے یا خود کوئی اچھی کتاب پڑھتے لکھتے ہوئے ہمیں بلا کر کسی کی کہی ہوئی یا اپنی مفید اور سبق آموز باتیں بتایا کرتے اور پھر اسی ضمن میں ایک سے ایک اچھے اشعار سناتے اور اردو، انگریزی، پنجابی، فارسی، عربی، جرمن اور فرانسیسی زبان کے عمدہ مقولے بیان کیا کرتے۔ اپنی بات کو اس قدر دلچسپ اور دل نشین انداز میں کہتے کہ سننے والے کے دل میں اتر جاتی اور اس طرح ذہن نشین ہوتی کہ عرصہ تک نہ بھولتی۔ سردیوں کے زمانے میں ہم سب آتشدان میں آگ جلا کر اس کے گرد بیٹھ جاتے تھے اور ابا جان کوئی نہ کوئی نئی کتاب لئے ہوئے اس میں سے دلچسپ باتیں اور اشعار ہمیں سنا کر ان پر ہمارے ساتھ ساتھ اپنا خیال بھی ظاہر کیا کرتے اور پھر بات میں سے بات نکلتی ہوئی کبھی شاعرانہ کبھی فلسفیانہ کبھی سیاسی اور کبھی مزاحیہ گفتگو کا رنگ اختیار کر لیتی اور گھنٹے منٹوں میں گزر جاتے۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس فضا میں جو تعلیم میں نے ایک حد تک غیر ارادی طور پر اور بے کوشش کے حاصل کی اس سے مجھے اپنی زندگی میں بے حد فائدہ ہوا۔ مجھے اس سے نہ صرف سکول، کالج اور یونیورسٹی میں پیش پیش رہنے میں مدد ملی بلکہ علم کا ذوق اور مطالعہ کا شوق بھی پیدا ہو گیا۔ انہیں اس بات کی خوشی تھی کہ ان کی مختصر سی اولاد یعنی ایک لڑکا اور ایک لڑکی میں سے اگر لڑکے کو سائنس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کم از کم لڑکی نے ان کے مضمون فلسفہ اور پھر نفسیات کی طرف اپنے رجحان کا اظہار کیا، ان مضامین کی تعلیم پائی اور دی اور ان کی روایت کو قائم رکھا۔

نہ صرف کتابی تعلیم بلکہ زندگی کے متعلق صحیح اور کارآمد نظریات قائم کرنے میں ابا جان کی زندگی خود ایک زندہ مثال تھی۔ ان کا نظریہ حیات صحیح معنی میں فلسفیانہ تھا وہ بڑے سے

بڑے دنیوی یا مالی نقصان کو اپنے نزدیک حقیر جانتے تھے اور کہتے تھے کہ اصل چیز جو انسان کے پاس ہونی چاہیئے وہ خدا پر ایمان اور علم و ہنر ہے اور اگر یہ چیز حاصل ہے تو پھر اس کے مقابلے میں دوسری تمام چیزیں ہیچ ہیں۔ قلبی و روحانی سکون سے بڑھ کر ان کے نزدیک کوئی چیز نہ تھی۔ ان کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع آئے کہ انہیں ایک طرف مالی اور دنیوی فائدہ حاصل کرنے کا اختیار دیا گیا اور دوسری طرف اپنا من پسند علمی شوق پورا کرنے کا موقع ملا تو انہوں نے ہر بار اپنے علمی شوق کو ترجیح دی۔ انہیں خدا نے جو نعمتیں اور ہنر عطا کیا تھا ان کا احساس تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ جس دائرہ میں خدا نے انہیں برتری عطا کی ہے ان کا فرض ہے کہ وہ اسی شعبہ میں رہتے ہوئے ملک وقوم اور نوع انسانی کی خدمت کریں اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا اور اسلام کے دائمی اصولوں کو موجودہ زمانہ کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے قابل عمل طور پر پیش کرنے کا بیڑا اپنے سر لیا اور اس کام کو اپنی زندگی کا ایک اہم مقصد قرار دے کر اپنا تن من دھن اسی مقصد کے حصول میں لگا دیا۔ یہاں تک کہ وہ آخر دم تک اس ادارے کی ترقی کے لیے کام کرتے رہے۔ افسوس کہ قدرت کو یہ منظور نہ تھا کہ انہیں اس زندگی کے چند سال اور مل جاتے اور قوم کو ان کے گراں قدر خیالات سے مستفید ہونے کا مزید موقع حاصل ہوتا۔ ابا جان کے انتقال سے چند ہی دن قبل میں نے دیوان حافظ سے ایک فال نکال کر دیکھا جو کہ ان کے تمام ارادوں کو محض ابتدائی شکل تک ہی پہنچ پانے کی طرف اشارہ کرتا تھا:

زمانہ از ورق گل مثال روئے تو بست
ولی زشرم تو درغنچہ کرد پنہانش

اس کے بعد ہی میں نے متفکر ہو کر دوبارہ فال دیکھی جس سے صاف الفاظ میں ان کی وفات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے:

برسر تربت ماچوں گزری ہمت خواہ
کہ زیارت گہ رندان جہاں خواہد بود
بر زمینی کہ نشان کف پائے تو بود
سالہا سجدہ صاحب نظراں خواہد بود

دیوان حافظ سے فال ابا جان بھی اکثر نکالا کرتے یعنی جب کبھی بھی طبیعت کسی مسئلہ کی وجہ سے مضمحل ہوتی تو لسان الغیب حافظؒ سے اس معاملہ پر رائے طلب کرتے اور ان کا تجربہ یہ تھا کہ انہیں ہمیشہ برمحل اور صحیح جواب ملا کرتا۔ اس کے بعد خود میں نے بھی بارہا اس کا تجربہ کیا اور یہی دیکھا کہ جیسے بھی حالات پر سوال کیا جائے اس کے مطابق ہی نہایت برمحل اور پتے کا جواب ملتا ہے۔ یہ کیونکر ہوتا ہے اور کن اصولوں کے تحت یہ ممکن ہوتا ہے اس کا جواب میرے لئے آسان نہیں۔ لیکن میرا تجربہ یہی ہے۔

جہاں تک انسانیت کا تعلق ہے وہ ابا جان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ خندہ پیشانی سے ہر ایک سے ملنا اور ہر کسی سے یکساں درجہ پر ملنا ان کی فطرت میں داخل تھا۔ خلوص اس قدر تھا کہ رسمی طور پر بڑے سے بڑے افسر یا حاکم تک سے ملنے کے قائل نہ تھے۔ لیکن ان کے علم و فضل کی بناء پر ہر شخص ان سے کچھ نہ کچھ حاصل کرنے کا خواہشمند رہتا اور وہ بخوشی مختلف موضوعات پر اس سے گفتگو کرتے رہتے اور عموماً ہر شخص کو اس قدر متاثر کرتے کہ وہ گرویدہ بن کر رہ جاتا۔ جادو بیانی و محفل آرائی، ظرافت و بذلہ سنجی ان جیسے عالم شخص میں ہونا سونے پر سہاگے کا کام دیتی تھی۔ وہ جس محفل میں بیٹھتے وہاں تمام حاضرین قدرتی طور پر ان ہی کی طرف متوجہ رہتے اور ان کی دلچسپ اور سبق آموز باتوں سے محفوظ ہوتے۔

انصاف پسندی بھی ابا جان کی طبیعت میں خاص طور سے نمایاں تھی۔ وہ ہمیشہ حق بات کا ساتھ دیتے اس چیز کا خیال کئے بغیر کہ آیا وہ کسی ادنیٰ ملازم کی زبانی پیش ہو رہی ہے یا کسی عزیز یا دوست کے خلاف پڑ رہی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف گھریلو بلکہ بیرونی معاملات میں بھی انہیں ثالث مقرر کیا جاتا تھا۔

آخری لمحہ تک ان کی زندگی اپنے نصب العین کی جستجو سے خالی نہ تھی۔ میرے خیال میں ان کی زندگی کا شاید ہی کوئی ایسا لمحہ گزرا ہو جس میں کہ انہوں نے اپنے آپ کو اکتایا ہوا محسوس کیا ہو اور اس کا راز یہی تھا کہ بیشتر اوقات وہ بہترین مفکرین کی صحبت میں اپنے آپ کو مطالعہ کے ذریعہ پہنچا دیا کرتے یا کسی نہ کسی موضوع پر اپنے خیالات کو سپرد قلم کیا کرتے اور یا پھر اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کی صحبت میں وقت گزارتے اور ان سے تبادلہ خیالات کرتے۔ پہاڑوں کی خاموش فضا میں وہ اپنے آپ کو مطالعہ اور تصنیف و تالیف میں محو رکھتے۔ موسم گرما میں ہر سال کم از کم تین چار ماہ کے لیے پہاڑ پر ضرور جاتے اور اس دوران

میں ایک نہ ایک بیش بہا کتاب کی تصنیف مکمل کر لیتے۔ اردو اور انگریزی میں اظہار خیالات کی انہیں یکساں قدرت حاصل تھی۔ بات بات پر وہ جو بات بھی کہتے وہ انمول ہوتی اور سچ تو یہ ہے کہ ان کے جاننے والوں کو ان کی جس قدر دلچسپ باتیں یاد ہیں وہ سب اگر جمع کی جائیں تو یقیناً ایک دلچسپ کتاب بن سکتی ہے۔

ابا جان کو اپنے دین سے جو محبت تھی اس کے بارے میں میں چند الفاظ کہے بغیر نہیں رہ سکتی۔ انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا اور اسے زندگی کے ہر شعبہ کی کسوٹی پر رکھ کر پورا پایا۔ چونکہ انہیں اس بات کا یقین محکم تھا کہ یہی مذہب ہے جو کہ قوانین قدرت کے مطابق ہے اور اس لحاظ سے اس کے بنیادی اصول دائمی ہیں۔ گو تفاوت روزگار اور ملک ملک کی تہذیب و تمدن کے اختلاف کی وجہ سے ان اصولوں کا طریق اظہار بالکل یکساں ہونا ممکن نہیں۔ وہ جس طرف بھی نگاہ اٹھاتے انہیں وحدت خدا کا ثبوت نظر آتا۔ ان کا نظریہ حیات اساسی طور پر مذہبی تھا اور ان کے اعمال بھی ان کے ذاتی عقائد پر مبنی تھے۔ اس لئے ان کی زندگی میں پوری ہم آہنگی پائی جاتی تھی اور ایک سچے مسلمان کا سکون قلب حاصل تھا۔ یہاں تک کہ مرنے کے بعد بھی ایک مسکراہٹ ان کے چہرے پر موجود تھی اور اسے دیکھ کر ایک عجیب قسم کا صبر و سکون دیکھنے والے پر طاری ہو جاتا تھا۔

7

خلیفہ صاحب

بیگم جہاں آرا شاہنواز

خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میرا تعارف اس وقت ہوا جب مرحوم والد صاحب (سر محمد شفیع) وائسرائے کی اگزکٹو کونسل میں وزیر تعلیم تھے۔ پردہ سے باہر آنے کی ابتدا ہوئی تھی اور ہم والد صاحب کے صرف چند احباب سے ملے تھے۔ خلیفہ صاحب کی نئی شادی ہوئی تھی اور وہ اپنی دلہن خدیجہ بیگم کو لے کر آئے تھے۔ ان کا قیام تارا دیوی میں تھا اور وہاں سے صرف ایک دن کے لیے شملہ آئے تھے۔ دونوں والد صاحب سے ملے۔ وہ ان کو اوپر لے آئے اور ہم سب سے تعارف کرایا۔ ہم سیسل ہوٹل سے اوپر کی پہاڑی پر کوٹھی انور آدم میں رہتے تھے۔

خلیفہ صاحب کے گھرانے سے برسوں کے خاندانی مراسم تھے اور خدیجہ بیگم کے والد عبدالغنی سیشن جج سے والد صاحب کے برادرانہ مراسم تھے اور خدیجہ بیگم ہمارے والدین

کے لیے بطور ... کے تھیں۔ ان کی تعلیم کی ابتدا کالج میں ہوئی تھی اور [illegible] تھا۔ ہم سب کو قصہ والد صاحب کو یاد تھا کہ ... ہوئی کہ دونوں ... اور موزوں ہوا ہی ہیں۔ ہم سب نے زور دے کر ان کو ایک رات [illegible] کھانے کے بعد شعر و شاعری شروع ہوئی۔ ایک طرف خلیفہ عبدالحکیم اور دوسری طرف بھائی بشیر احمد، غرض ایک بجے رات تک ایسی محفل آراستہ رہی کہ سونے کو کسی کا دل نہ چاہتا تھا۔ جس وقت خلیفہ صاحب نے "چل میرے چرخے چرخ چوں" سنایا ہے تو ہم سب بے حد محظوظ ہوئے اور مرحوم والد صاحب نے اصرار کر کے دوبارہ یہ نظم سنی۔ ان دنوں چرخے کا دور دورہ تھا اور عبدالحکیم صاحب نے یہ نظم نئی نئی لکھی تھی۔ اس کے بعد بار بار ملنا ہوتا رہا اور ہم ان دونوں کے آنے کے منتظر رہتے تھے۔

حیدر آباد دکن سے واپس آنے کے بعد تو ہمارے گھرانوں میں ایسی کم محفلیں منعقد ہوئی ہوں گی جن میں خلیفہ عبدالحکیم موجود نہ ہوں۔ جب سمندر پار کے رہنے والے اور اسلامی ممالک کی نامور مستیاں زیب محفل ہوں تو خلیفہ صاحب کا شریک نہ ہو سکنا باعث صد افسوس ہوتا اور مجلس سونی ہو جاتی تھی۔ ان کی غیر معمولی شخصیت جس میں قابلیت، جاذبیت ملنساری، بذلہ سنجی، نکتہ رسی اور خلوص و ہمدردی جیسے اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے، بڑی دلکش تھی۔ اسلام کا انہوں نے بہت غائر مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ اسلام کے صحیح احکام کو دور حاضر کی روشنی میں دیکھنا اور تقاضوں کو ان سے ہم آہنگ کرنا انہی کا کام تھا۔ سامعین ان کی فہم و فراست کا گہرا نقش لئے ایسی محفل سے اٹھتے تھے۔ فلسفی اور بھی تھے۔ انشا پردازوں کی کمی بھی نہ تھی۔ اقبالیات سے شغف رکھنے والے بھی کافی تھے۔ مثنوی کی ترجمانی بھی بڑی قابلیت کے ساتھ کئی لوگ کر چکے تھے۔ بیشک ان چیزوں میں خلیفہ صاحب درجہ اختصاص پر فائز تھے لیکن منفرد نہ تھے۔ جس بات میں ان کو میں نے منفرد پایا وہ تھا ان کا مقام انسانیت۔

ہم لوگوں میں وہ اس طرح گھل مل کر بیٹھتے کہ کسی طرح کا امتیاز و تفوق اپنے قریب نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ پندار اور نخوت کا مظاہرہ اگر کرنا بھی چاہتے تو نہیں کر سکتے تھے۔ یہ بات ان کی فطرت سے بعید تھی۔ سب سے بڑی خوبی ان میں یہ تھی کہ اپنی کہتے تھے اور کہتے رہتے تھے لیکن دوسرے کی بھی سنتے تھے اور اگر بات سمجھ میں آ جاتی تو مان بھی لیتے تھے۔

عورتوں کو دیئے ہیں ایک عیسائی یا یہودی عورت مسلمان کی بیوی بن کر وہ سب حاصل کر لیتی ہے۔ اگر ایک مسلمان عورت کسی عیسائی یا یہودی سے شادی کر لے تو وہ ان تمام حقوق سے محروم ہو جائے گی۔ گویا دوسرے الفاظ میں ایک کتابی عورت مسلمان کے گھر میں آ کر وہ سب کچھ پا لیتی ہے جو اس کا مذہب اسے نہیں دے سکا تھا اور ایک مسلمان عورت یہودی یا عیسائی کے گھر میں جا کر ان تمام حقوق و مراعات سے محروم ہو جاتی ہے جو اسلام نے اسے دیئے تھے۔ یہ کوئی معمولی فرق ہے؟

اس جواب نے فضا بدل دی۔

خلیفہ صاحب کو اکثر غیر ممالک سے لیکچر دینے کی دعوتیں ملتی رہتی تھیں اور وہ انہیں قبول بھی کر لیتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ سے واپسی پر لندن ٹھہرے۔ وہاں نہ جانے کیا جی میں آئی کہ وطن واپس آنے کے بجائے سپین چلے گئے۔ جہاں جا کر اقبال نے کہا تھا:

آج بھی اس دیس میں عام ہے چشم غزال

اور نگاہوں کے تیر آج بھی ہیں دل نشیں

خلیفہ صاحب نے اس دیس کی خوب سیر کی۔ قرطبہ دیکھا، غرناطہ گئے۔ الحمراء کی زیارت کی، جامع قرطبہ میں نماز پڑھی۔ وہاں سے ایک خط رفقائے ادارہ کے نام لکھا جس میں اپنی سیاحت کا چند سطروں میں ذکر کرنے کے بعد لکھا:

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے

کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

ان چند الفاظ میں خلیفہ صاحب نے پورا سفر نامہ لکھ ڈالا...... جذبات سے بھرپور۔

اپنے نجی ملازمین کے ساتھ یا دفتر کے چپڑاسیوں کے ساتھ ان کا برتاؤ بے انتہا شفقت اور عنایت کا تھا۔ عام طور پر صبح اٹھنے کے بعد اپنی کوٹھی کے لان میں آ کر بیٹھ جایا کرتے تھے۔ وہیں اخبارات وغیرہ کا مطالعہ کرتے تھے۔ ملازم کو ہر روز ان کے بیدار ہونے سے پہلے کرسی لے جا کر وہاں بچھانی پڑتی تھی۔ لیکن خلیفہ صاحب اسے برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے لکڑی کے چند تختے ایک بنچ کی طرح بنوا کر وہاں رکھ دیئے تاکہ کرسی لانے اور لے جانے کا سوال ہی پیدا نہ ہو۔ آئے اور بیٹھ گئے۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کے لان پر کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ سردی کا موسم تھا۔ دھوپ میں مجلس جمی اور باتیں شروع ہو گئیں۔ مختلف مسائل زیرِ بحث آئے۔ کچھ سوچتے ہوئے خلیفہ صاحب نے کہا:

''شراب کی حرمت کا سبب یہ ہے کہ اس سے نشہ پیدا ہوتا ہے، آدمی بہک جاتا ہے۔ ہوش و حواس کھو بیٹھتا ہے لیکن اگر شراب اتنی پی جائے کہ نشہ نہ ہو تو تب تو شراب حرام نہیں ہونی چاہئے۔'' انہوں نے چاہا اس پر تحقیق کی جائے۔ چنانچہ معلوم ہوا امام محمد کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر نشہ نہ ہو تو پھر حرام نہیں ہے۔ (غیر خبر)

یہ سن کر خلیفہ صاحب خوش ہوئے۔ میں نے عرض کیا یہ امام محمد کا فتویٰ نہیں قول ہے اور مفتی بہ نہیں ہے۔

بشیر احمد صاحب ڈار میرے پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مفتی بہ کی تعریف کیجئے۔ میں نے عرض کیا، امام ابوحنیفہ کی مجلس میں ان کے کبار تلامذہ امام ابو یوسفؒ، امام محمد، امام زفر وغیرہ مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر غور کرتے تھے۔ ہر شخص اپنی اپنی رائے کا اپنی بصیرت کے مطابق اظہار کرتا تھا۔ پھر بحث و مباحثہ کے بعد ایک قول پر یا اتفاق آراء ہو جاتا تھا یا کثرت رائے۔ دونوں صورتوں میں یہ آخری قول مفتی بہ مانا جاتا ہے اور فقہائے امت اسی پر فتویٰ دیتے ہیں۔ دوسرے اقوال ساقط ہو جاتے ہیں۔ ان سے حجت اور سند نہیں لائی جاتی۔

یہ سن کر خلیفہ صاحب خاموش ہو گئے اور پھر کبھی اس مسئلہ کو انہوں نے موضوع بحث نہیں بنایا۔

ایک مرتبہ کا واقعہ ہے، حکومت کے قائم کردہ میرج کمیشن کا اجلاس ادارہ میں ہو رہا تھا۔ سر عبدالرشید صدر تھے خلیفہ صاحب سیکرٹری بیگم شاہنواز اور بیگم جی احمد بھی ممبر کی حیثیت سے شریک مجلس تھیں۔ کبھی کبھی خلیفہ صاحب ہم لوگوں کو بھی شریک بحث کر لیا کرتے تھے۔ اس روز بھی ہم سب موجود تھے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا۔ اسلام میں یہ جائز ہے کہ ایک مسلمان کسی کتابی عورت سے شادی کر لے۔ لیکن کوئی مسلمان عورت کسی کتابی مرد سے نکاح نہیں کر سکتی...... کیوں؟

کسی صاحب نے بتایا قرآن میں تو اس کی ممانعت نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب کو یہ جواب پسند نہیں آیا۔ انہوں نے فرمایا۔ اسلام نے جو حقوق

دفتر کا ایک ملازم حمید اللہ چونکہ مہاجر تھا لہٰذا اسے رہنے کے لیے انہوں نے اپنے گھر میں جگہ دے دی۔ ہمیشہ اس کے دکھ سکھ میں شریک رہے۔ اس کی بیوی بیمار پڑی تو جو کچھ ہو سکا کیا۔ پھر اس کا انتقال ہو گیا۔ خلیفہ صاحب نہ صرف خود دھوپ کی تیزی اور شدت کے باوجود نماز جنازہ میں شریک ہوئے بلکہ رفقائے ادارہ کو بھی دعوت دی کہ جو چلنا چاہے چلے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا دل انسانی ہمدردی سے کتنا معمور تھا۔

خلیفہ صاحب کو اپنی اولاد سے غیر معمولی محبت تھی۔ ان کی صاحبزادی ایم۔ اے ہیں۔ تکمیل تعلیم کے لیے امریکہ بھی جا چکی ہیں۔ فلسفہ سے دلچسپی وراثت میں پائی ہے۔ ان کا ذکر بڑی محبت سے کیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ امریکہ جانے لگے تو فرمایا، اس بہانے عارف سے ملاقات ہو جائے گی۔ بہت دنوں سے اسے نہیں دیکھا۔ واپس آئے تو ایک موٹر اپنے ساتھ لائے کہنے لگے روپے کم پڑ گئے تھے۔ عارف نے جو کچھ جمع کیا تھا سامنے رکھ دیا۔ ان کی دلی خواہش تھی کہ عارف صاحب امریکہ سے واپس آ جائیں اور یہیں رہیں۔ باپ کی آنکھوں کے سامنے۔ ماں کی آغوش محبت میں لیکن انہوں نے کبھی اصرار نہیں کیا۔ وہ چاہتے تھے عارف صاحب خود ہی فیصلہ کریں۔ اپنا فیصلہ ان پر عائد کرنا منظور نہ تھا۔

بزرگوں سے بھی عقیدت رکھتے تھے۔ حضرت غوث شاہ صاحب سے بہت متاثر تھے۔ تذکرہ غوثیہ کے اکثر واقعات جو حضرت صاحب کی کرامات اور خرق عادات پر مبنی تھے جزم و یقین کے ساتھ بیان کیا کرتے تھے۔ راولپنڈی میں کوئی مجذوب تھے ان سے بھی بہت متاثر تھے۔ مری جاتے آتے وقت اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور ان کے کشف و کرامت کے واقعات بیان کرتے۔ ایک مرتبہ کہنے لگے میں اپنی لڑکی کے ساتھ ملنے گیا۔ لڑکی کو دیکھتے ہی انہوں نے مسکرا کر فرمایا اس کی شادی موسیٰ کے لڑکے سے ہو رہی ہے۔ اچھا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے تھے یہ بات سن کر بہت متعجب ہوا کیونکہ واقعی اس کی شادی اس کے خالہ زاد بھائی سے طے ہو چکی تھی۔ اپنی ایک اور عزیزہ کا قصہ بیان کرتے تھے کہ ان کے شوہر نے جس کام میں ہاتھ ڈالا ناکام ہوئے، وہ ان مجذوب صاحب کے پاس پہنچیں۔ دیکھتے ہی آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور کہا ''دروازے بند ہیں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔''

خلیفہ صاحب کو اردو زبان سے اتنا شغف تھا کہ ان کے گھر کی زبان اردو ہی تھی۔

ایک مرتبہ غالباً 1956ء کا واقعہ ہے کہ میں اور حنیف صاحب مری گئے۔ خلیفہ صاحب نے

ایک بنگلہ کرایہ پر لے رکھا تھا جہاں اپنی بیگم اور صاحبزادی کے ساتھ مقیم تھے۔ قریب ہی ہوٹل سنٹرل تھا جہاں ہم دونوں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سہ پہر کو دوسرے تیسرے دن وہاں چلے جاتے۔ ایک دفعہ ہم لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ان کی ننھی سی نواسی کھیلتی ہوئی آئی۔ خلیفہ صاحب نے اسے گود میں لے لیا اور چائے پلانے لگے۔ پھر فرمایا۔ آج اس کی آیا کی شامت آ گئی تھی۔ قریب تھا کہ اس کی ماں اسے نکال دیتی۔ میں نے پوچھا کیوں؟ فرمایا آج اس لڑکی کے منہ سے پنجابی کا ایک لفظ نکل گیا تھا جس سے اس کی ماں برافروختہ ہوگئی کہ یہ آیا تو بچی کی زبان بگاڑ دے گی۔

بہت سی باتیں ہیں لیکن اس مختصر سی مجلس میں تفصیل کا موقع کہاں؟

سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے

8

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کا حیدر آباد دکن میں قیام

پروفیسر ہارون خاں شیروانی

جامعہ عثمانیہ کے قیام سے پہلے میں خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے واقف نہ تھا۔ 1919ء میں جامعہ عثمانیہ قائم ہوا اور میرا تقرر ''مددگار'' پروفیسر تاریخ کی حیثیت سے کیا گیا۔ مجھے 23 اگست کو حیدر آباد پہنچنا تھا۔ اس سے چار چھ دن پہلے علی گڑھ میں عبدالمجید خواجہ صاحب کی کوٹھی حبیب باغ میں (جو اب مسلم یونیورسٹی طبیہ کالج کا اقامت خانہ ہے) خواجہ صاحب کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ جو ان دنوں کالج کے میڈیکل افسر تھے آئے اور وہ بھی ہمارے ساتھ چائے میں شریک ہو گئے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ آپ حیدر آباد کب جا رہے ہیں۔ میں نے کہا کہ میں 20 کو جا رہا ہوں۔ انہوں نے کہا بہت اچھا ہوا۔ میرے نسبتی بھائی خلیفہ عبدالحکیم بھی اسی ریل سے جا رہے ہیں۔ آپ ان کے ساتھ ہو جایئے گا۔ وہ جامعہ عثمانیہ میں فلسفے کے ''مددگار'' پروفیسر مقرر ہوئے ہیں۔ وہ آپ سے دہلی میں ملیں

گے۔

خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات دہلی کے اسٹیشن پر ہوئی۔ ہم دونوں ایک ساتھ حیدر آباد پہنچے۔ ایک ساتھ اپنے اپنے کام کا ''جائزہ'' لیا۔ کئی سال ایک ہی جگہ رہے۔ ایک ہی ہفتے میں دونوں کی شادیاں ہوئیں۔ جامعہ عثمانیہ کے طلبہ نے ایک ہی تاریخ میں دونوں کو مبارکبادی عصرانہ دیا اور پرلطف بات یہ ہے کہ خلیفہ نے اس عصرانے میں میرا بناری شملہ زیب سر کیا۔ چنانچہ اس عصرانے میں ہم دونوں کی جو تصویر لی گئی وہ اس وقت تک میرے کمرے میں بھولے بسرے زمانے کی یاد تازہ کر رہی ہے۔ ہم دونوں کی تنخواہیں زیادہ نہ تھیں اس لئے ہم نے وحید الرحمٰن ''مددگار'' پروفیسر طبعیات کے ساجھے میں ایک وسیع بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ ہم دونوں مجرد تھے اور وحید الرحمٰن متاہل، مگر ان کی بیگم حیدر آباد نہیں آئی تھیں۔ مکان وسیع تھا۔ ہم میں سے ہر ایک کو دو دو کمرے اور ایک ایک غسل خانہ ملا۔ اس کے علاوہ کھانے اور بیٹھنے کے کمرے مشترک تھے۔ مکان کے عقب میں ایک بڑا خانہ باغ تھا جس میں مختلف قسم کے پھلدار درخت تھے۔ میرے متعلق جو کمرے تھے وہ اس باغ کے بالکل محاذ میں تھے اور میری کھڑکیوں سے پورا باغ نظر آتا تھا۔ خلیفہ سے اپنے کمروں میں صبر نہ ہو سکتا تھا۔ وہ جامعہ کے اوقات کے علاوہ اپنا بیشتر وقت باغ میں بسر کرتے تھے۔ ہمیشہ ہاتھ میں کوئی کتاب ہوتی یا پنسل کاغذ۔ پنسل کاغذ اس لئے کہ کسی شعر یا نظم کے لیے طبیعت موزوں ہو تو کمرے سے لانا نہ پڑے۔ میں نصاب کی کتابوں کا ذرا زیادہ مطالعہ کرتا تو مجھے کمرے سے کھینچ لے جاتے اور کہتے بھائی ابھی تو صرف انٹرمیڈیٹ کی کلاسیں ہیں! اگر اس وقت مطالعے کا یہ عالم ہے تو جب بی۔ اے، ایم۔ اے کو پڑھانا پڑے گا تو تم اپنے آپ کو بالکل ہلاک ہی کر ڈالو گے۔

میری اور خلیفہ کی عمر میں کم و بیش ایک سال کی چھوٹائی بڑائی تھی۔ وحید الرحمٰن عمر میں ہم دونوں سے ذرا بڑے ہوں گے۔ خلیفہ کی طبیعت میں جولانی بھری ہوئی تھی تو وحید الرحمٰن نسبتاً سنجیدہ تھے۔ بہت سے نوجوان فلسفی شعراء کی طرح خلیفہ کی مزاج میں بھی ذرا لا ابالی پن تھا مگر کپڑے وہ نہایت نفیس پہنتے تھے۔ تازہ ولایت قسم کے لوگوں کی طرح پتلون کی شکن، ٹائی، کالر کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ مگر دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے ان کا دوپہر کا قیلولہ ناغہ نہ ہوتا تھا۔ ہمارے ''گھرانے'' میں جتنا فرنیچر تھا وہ سب کا سب کرائے کا تھا۔ پلنگ، کرسی،

میز، برتنوں کی الماریاں، کتابوں کی الماریاں، یہاں تک کہ غسل خانوں کا پورا سامان کرائے کا تھا۔ صرف کھانے کے برتن، چھری کانٹے، چمچے میرے تھے۔ کرائے کے فرنیچر کا انتخاب وحید الرحمٰن نے کیا تھا جن کا مزاج ذرا نوابانہ تھا۔ چنانچہ ہم میں سے ہر ایک کو فرنیچر کے کرائے کے چالیس پینتالیس روپے ماہوار دینے پڑتے تھے۔ ایک روز خلیفہ نے کہا کہ بھائی ہم اس نوابانہ ٹھاٹھ سے باز آئے۔ ہمیں اپنی چیزیں خرید لینی چاہئیں۔ حیدر آباد میں ایک اہم ادارہ حراج خانوں کا تھا۔ بیسیوں حراج خانے تھے اور ان میں سے سوئی سے لیکر موٹریں اور ہاتھیوں تک نیلام ہوتی تھیں۔ خلیفہ نے کہا کہ میں حراج خانے جا کر فرنیچر ہی نہیں بلکہ برتن بھی خرید لاتا ہوں۔ برتن میرے پاس تھے میں نے کہا برتن خریدنے کی کیا ضرورت ہے؟ جواب دیا کہ کل تمہاری بیگم آجائے گی۔ تو برتن تو وہ لے جائیں گی، پھر ہم کیا ٹھیکروں میں کھائیں گے؟ غرض وحید الرحمٰن اور میں نے خرید اشیاء کا کام خلیفہ کے سپرد کیا۔ حراج عموماً چھٹی کے دن جمعہ کو ہوا کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب ناشتے کے بعد چل دیئے اور دس گیارہ بجے سے سامان آنا شروع ہو گیا۔ ان میل بے جوڑ رکابیاں ڈرائنگ روم کے لیے تین طرح کی کرسیاں اور صوفہ، کھانے کے کمرے کے لیے ایک اعلیٰ درجہ کا کرسی سیٹ ٹین کے چمچے چمچیاں، ایک بہت بڑا سنگ مرمر کا شیر، اندر والے برآمدے کے لیے (جس کا نام ہم نے ٹیپو سلطان کے مہمان خانے کے نام پر ''دریائے دولت'' رکھ چھوڑا تھا) نہایت خوبصورت مگر نہایت بے آرام کرسیاں، نہ جانے کتنے فریم جن میں طرح طرح کی تصویریں، زیادہ تر مناظر اور خوش رو اور بدصورت دونوں وضع کی لڑکیوں کی تصویریں اور خدا جانے کیا کیا متفرق چیزیں جو آنی شروع ہوئیں تو برابر مغرب کے وقت تک آتی رہی۔ مغرب سے ذرا پہلے خلیفہ مسکراتے ہوئے آئے۔ ہم نے کہا کہ بھائی یہ کیا خاک بلا اٹھا لائے ہو۔ ایک طرف تو سنگ مرمر کا شیر اور دوسری جانب یہ ٹین کے چمچے کس غرض سے خریدے گئے ہیں؟ خلیفہ نے نیم سنجیدہ اور نیم مزاحی انداز میں کہا کہ چمچی چمچے میں نے دیکھے تھوڑا ہی تھے۔ حراج گر نے تعریف کی، میں نے بولی بول دی۔ میں نے سمجھا کر الکٹرو پلیٹ ہوں گے۔ خیر اب ہم اگلے حراج میں انہیں بھیج دیں گے!

ہم تینوں کا ساتھ چند مہینوں بعد چھوٹ گیا۔ وحید الرحمٰن وظیفہ لے کر یورپ چلے گئے۔ خوش قسمتی سے اردو کے مشہور ادیب مولوی عنایت اللہ صاحب دہلوی (ولد مولوی ذکاء

صاحب اور خلیفہ میں خوب خوب چوٹیں رہتی تھیں۔ مولوی صاحب کی منطق وہی جامعہ نظامیہ والی منطق تھی جس پر انہیں لاثانی عبور حاصل تھا۔ حدیث، منطق، فلسفہ، کلام سب کی درسی کتابوں کے صفحے کے صفحے حفظ یاد تھے۔ ان کے استدلال کے طریقے خلیفہ کے استدلال کے طریقوں سے بالکل جدا تھے اور بحث ہوتی تھی تو یہ معلوم ہوتا تھا کہ دونوں گویا میز کے چاروں طرف گھوم رہے ہیں اور کوئی ایک دوسرے کو نہیں پکڑ سکتا۔

یہ بھی خلیفہ کی جدت یا جودت تھی کہ انہوں نے تین مرتبہ حیدر آباد کو خدا حافظ کہا اور تینوں مرتبہ اپنا تمام اثاثہ (جن میں وہ حراج والی تصویریں بھی شامل تھیں) فروخت کر دیا۔ ایک مرتبہ تعلیمی رخصت پر یورپ کا سفر، پھر سرینگر میں مہاراجہ کالج کی صدارت، غرض ہر مرتبہ لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے خلیفہ ''سبکدوش'' ہو کر یہاں سے گئے۔ ایک بہت بڑا بنگلہ بنا لیا تھا وہ بھی فروخت کر دیا۔ اسٹاف اور طلبہ دونوں میں ہر دلعزیز تھے اس لئے ہر مرتبہ رخصتانے ہوئے، دعوتیں ہوئیں، عصرانے ہوئے۔ سرینگر کی ملازمت پسند نہیں آئی تو حیدر آباد واپس لوٹے اور یہاں میر شعبہ فنون (ڈین فیکلٹی آف آرٹس) مقرر ہوئے۔

1946ء میں میں نے نظام کالج کی پرنسپلی سے وظیفہ لے کر دہلی کے اینگلو عربک کالج کی پرنسپلی کا جائزہ لیا۔ وہاں 1947ء کے خوں چکاں زمانے تک رہا۔ اس کے بعد دستور ساز اسمبلی کی ایک ذیلی مجلس کے ممبر کی حیثیت سے پانچ مہینے دہلی میں قیام کرنا پڑا۔ جون 1947ء میں واپس حیدر آباد ہوا تو حکومت حیدر آباد کے ایما سے میری باز ماموری جامعہ عثمانیہ میں ہوگئی اور مجھ سے شعبہ سیاسیات کی تنظیم کے لیے کہا گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خلیفہ میر شعبہ فنون بنے بیٹھے ہیں۔ سیاسیات کے شعبے کا وجود ہی نہ تھا لہٰذا اس کے لیے نہ لیکچر روم نہ اسٹاف نہ صدر شعبہ کے لیے کوئی کمرہ۔ میں نے خلیفہ سے کہا کہ بھائی کہاں بیٹھوں۔ کہنے لگے کہ تم اور مجھ سے پوچھو، جہاں جگہ ملے بیٹھ جاؤ اور نہ ملے تو نکال لو!! جگہ نہیں تھی اس لئے کہیں نہ کہیں سے مجھے نکالنی پڑی!

چند مہینے بعد خلیفہ وظیفہ حسن خدمت پر سبکدوش ہو گئے۔ انہوں نے کبھی اس کو نہیں چھپایا کہ وظیفے کے بعد وہ پاکستان جا رہے ہیں۔ طلبہ نے انہیں رخصتانہ عصرانہ دیا اور جس روز حیدر آباد سے جا رہے ہیں اس روز وائس چانسلر انہیں خدا حافظ کہنے آئے۔

جیسا میرے عزیز دوست شاہد حسین رزاقی صاحب نے رسالہ ثقافت میں لکھا ہے،

اللہ صاحب) دارالترجمہ کے ناظم بن کر حیدر آباد آ گئے اور ہم دونوں نے ایک بنگلہ کلیہ جامعہ عثمانیہ کے قریب لے لیا۔ خلیفہ صاحب بھی ہمارے ساتھ رہنے لگے۔ یہ زمانہ خلیفہ کی شاعری کے اوج کا زمانہ سمجھنا چاہیے۔ شام کے وقت ہمارے بنگلے میں کلب کی سی فضاء پیدا ہو جاتی تھی۔ جامعہ کے اساتذہ، دارالترجمہ کے مترجم اور بعض دوسرے علم دوست اصحاب جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کی بذلہ سنجی، مزاح آفرینی، حاضر جوابی اور شاعری سے فضا گونج جاتی تھی۔ کبھی کبھی رات کے دو ڈھائی بجے خلیفہ کے کمرے سے گنگنانے کی آواز آتی تھی۔ اسی وقت اشعار موزوں ہو جاتے اور دوسرے دن مغرب کے بعد سنائے جاتے۔ رفتہ رفتہ خلیفہ کی مانگ حیدر آباد کی محفلوں میں ہونے لگی۔ بیاض کافی ضخیم تھی اور اکثر گاڑی میں رکھی رہتی تھی اور وقت پر منگا لی جاتی تھی۔ اس بیاض میں قومی، مزاحی، تعلیمی، شخصی غرض ہر طرح کی نظمیں رہتی تھیں اور موقع کی مناسبت سے پڑھ دی جاتی تھیں۔ بعض نظموں میں مزاح کے پردے میں بڑی کام کی باتیں ہوتی تھیں۔ جب گاندھی جی نے ہندوستان کی نجات کو چرخے کے ساتھ وابستہ کیا اور چرخہ کانگریس کے ترنگے میں چسپاں کیا گیا تو خلیفہ صاحب نے اپنی نظم۔

"چل میرے چرخے چرخ چوں"

موزوں کی جو قوم پرست اور انگریز پرست دونوں طرح کی محفلوں میں مقبول ہوئی۔ افسوس ہے کہ یہ نظم راقم الحروف کے پاس نہیں ہے ورنہ اس سے اس کا اندازہ ہو جاتا کہ خلیفہ مزاح کے پیرائے میں بھی کتنی گہرائیوں تک پہنچ جاتے۔

تقریباً ایک سال کے بعد یہ ثالوث مقدس بھی ٹوٹ گیا۔ میں کلیہ جامعہ عثمانیہ کے اقامت خانے کا مؤدب مقیم (وارڈن) مقرر ہوا اور مجھے اقامت خانے ہی میں رہنا پڑا۔ مگر یہاں بھی خلیفہ کا اور میرا ساتھ نہیں چھوٹا اس لئے کہ وہ میرے ساتھ مؤدب غیر مقیم مقرر ہوئے اور اس بہانے سے ہفتے میں کم سے کم دو روز (جب وہ اپنی مؤدبی کے فرائض پورے کرنے کے لیے اقامت خانے آتے) ان سے لطف ملاقات رہتا۔

اسی دوران میں ہم دونوں کی شادیاں ہوگئیں اور میں نے مؤدبی کو خیر باد کہا۔ خلیفہ صاحب نے بھی عنایت اللہ صاحب کا ساتھ چھوڑ دیا اور ایک الگ بنگلہ کرائے پر لے لیا۔ مگر انہیں کہیں نہ کہیں تو اپنی تقریر اور اپنے علم مجلس کے جوہر دکھانے تھے۔ اب ان کی آماجگاہ اساتذہ کا کامن روم بن گیا۔ شعبہ دینیات کے منطق کے استاد مولوی سید ابراہیم

خلیفہ کے جوہر عمر کے آخری حصے میں کھلے۔ میں مارچ 1953ء میں کامن ویلتھ ریلیشنز کانفرنس میں ہندوستانی وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے لاہور گیا تھا۔ کانفرنس ختم ہونے کے بعد پہلا کام میں نے یہ کیا کہ خلیفہ سے ملنے 44 وارث روڈ گیا۔ اپنے آنے کی میں نے انہیں پہلے سے کوئی اطلاع نہیں کی تھی۔ رات کے وقت باہر کے باغیچے میں کتاب دیکھ رہے تھے۔ دیکھتے ہی لپٹ گئے۔ پرانے قصے یاد دلائے۔ حیدرآباد میں ہر ایک کا حال دریافت کیا۔ دوسرے دن مجھے کراچی جانا تھا۔ اس لئے ان سے صرف ایک ہی مرتبہ ملاقات ہوسکی۔ ستمبر 1957ء میں میرا پھر لاہور جانا ہوا۔ اس مرتبہ خلیفہ سے کئی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ اپنا ادارہ دکھایا۔ وہاں کے سب کارکنوں سے ملایا۔ شیخ محمد اشرف صاحب کے یہاں عصرانے پر اور بیگم رفیع کے یہاں عشائیے پر ملاقات ہوئی۔ شاید آخری مرتبہ میں نے خلیفہ کو حمید الظفر صاحب کے یہاں ظہرانے پر دیکھا۔ نہ جانے کیوں چلتے وقت میرے اوپر ایک خاص اثر تھا اور یہ خیال تھا کہ شاید اب ملاقات نہ ہو۔ 1957ء میں خلیفہ صاحب کی طبیعت میں میں نے بدیہی فرق پایا۔ ان کی بذلہ سنجی اور شاید حاضر جوابی کی بھی وہ کیفیت نہ رہی تھی جو جامعہ عثمانیہ کے دور میں نمایاں تھی اور اس کے بجائے ان کے چہرے بشرے سے ایک عالمانہ کیفیت مترشح ہوتی تھی۔ میں نے کہا کہ ہندوستان میں تمہاری کتابوں، خاص کر اسلامک آئیڈیالوجی اور فکر اقبال کی کافی مانگ ہے۔ تو اس سے بہت خوش ہوئے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے قیام میں جو دقتیں پیدا ہوئیں انہیں تفصیل سے بیان کیا اور کہا انشاء اللہ آئندہ اس کام کو اس سے بھی زیادہ پھیلایا جائے گا۔

ہمارے پہلے ثالوث میں سے وحید الرحمٰن اور خلیفہ دونوں چل بسے، بلکہ شاید ان لوگوں میں سے جو کلیہ جامعہ عثمانیہ کے افتتاح کے موقع پر 27 اگست 1919ء میں موجود تھے ان میں شاید میں ہی تن تنہا اس دنیائے فانی میں رہ گیا ہوں۔ رہے نام اللہ کا۔

9

خلیفہ عبدالحکیم اور عثمانیہ یونیورسٹی

محمد حبیب اللہ رشدی

خلیفہ عبدالحکیم عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کے ان چند پروفیسروں میں تھے جن سے ۱۹۱۹ء میں یونیورسٹی کا افتتاح ہوا۔ اس برعظیم میں عثمانیہ یونیورسٹی وہ اولین یونیورسٹی تھی جہاں سائنس اور تمام جدید علوم کی تعلیم انگریزی کے بجائے اُردو میں دی جاتی تھی۔ اس زمانے میں جدید علوم خصوصاً سائنس کا اُردو میں پڑھایا جانا عجیب سمجھا جایا کرتا تھا۔ یہ خیال بہت عام تھا کہ اُردو یا ہندوستان کی کسی بھی زبان میں یہ صلاحیت موجود نہیں ہے کہ اس میں علوم جدیدہ اور سائنس کو منتقل کیا جا سکے۔ پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کا زمانہ تھا۔ ریاست کے باہر ہندوستان کے عام اہل الرائے حضرات کو اس طرف سوچنے کی ضرورت تھی اور نہ فرصت۔ خود ریاست کے اندر اس خیال کے مخالفین کی تعداد کچھ کم نہیں تھی، بہت سے مخالفین تو اس خیال کا مضحکہ اڑانے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔

یونیورسٹی کالج کے افتتاح سے سال ڈیڑھ سال پہلے اُردو میں علوم کی تعلیم کے لیے نصابی کتابوں کا ترجمہ کرنے کی غرض سے ایک دارالترجمہ مولوی عبدالحق کی نگرانی میں قائم کیا گیا تھا اور چند نصابی کتابوں کا ترجمہ بھی ہو چکا تھا۔ اس یونیورسٹی کے لیے دوسرا مشکل مرحلہ پروفیسروں کے انتخاب کا تھا۔ ریاضی، طبیعات، کیمیا، فلسفہ، معاشیات وغیرہ علوم کو انگریزی میں پڑھانے والوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ لیکن ان علوم کو اُردو میں معقول طریقہ پر پڑھا سکنے والوں کی تلاش بہت مشکل تھی۔ بہرحال اس مشکل پر کسی نہ کسی طرح قابو پالیا گیا۔ ریاضی کے لیے ایک نہایت قابل آدمی قاضی محمد حسین (رینگلر) پہلے سے دارالترجمہ میں موجود تھے، انہیں ریاضی کا پروفیسر بنایا گیا۔ اسی طرح سائنس کے ایک قابل آدمی چودھری برکت علی مرحوم اور معاشیات کی تعلیم کے لیے الیاس برنی بھی دارالترجمہ سے لئے گئے اور شعبہ فلسفہ کے لیے خلیفہ عبدالحکیم کا انتخاب کیا گیا۔

کالج کا پہلا تعلیمی سال ختم ہو چکا تھا کہ میں جون یا جولائی ۱۹۲۰ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج میں داخل ہونے کے لیے گیا۔ مجھے سائنس سے بہت دلچسپی تھی اس لئے یہ ارادہ تھا کہ مضامین اختیاری میں طبیعیات اور کیمیا کے مضامین لوں۔ وہاں معلوم ہوا کہ سائنس کے مضامین کے ساتھ ریاضی کا لینا لازمی ہے۔ میں حساب میں بہت کمزور تھا لیکن الجبرا اور اقلیدس میں بہت اچھا تھا۔ اس وقت کسی نے یہ نہیں بتایا کہ حساب کا جھگڑا میٹرک میں ختم ہو چکا ہے اب صرف الجبرا اور اقلیدس سے کام پڑے گا۔ یہ بات مجھے کئی برس کے بعد معلوم ہوئی۔ غرض ریاضی سے گھبرا کر سائنس کو ترک کرنا اور شعبہ فنون کے مضامین میں سے انتخاب کرنا تھا۔ لطف کی بات یہ ہے کہ نہ ہم طالب علموں میں سے کسی کو یہ خیال تھا اور نہ کسی بزرگ نے یہ سمجھایا کہ ہمیں ایسے مضامین کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے جو ہمارے آئندہ کے پیشوں میں کارآمد ہوں۔ ہم سب کا خیال یہی تھا کہ بس ہمیں بی۔ اے پاس کرنا ہے، خواہ کسی مضمون میں ہو۔ میری دلچسپی کے چار مضامین تھے: نفسیات، معاشیات، فارسی، اُردو۔ لیکن صرف تین مضمون لئے جا سکتے تھے۔ ہم چند طلبا معاشیات کی جماعت میں جا بیٹھے۔ الیاس برنی صاحب کا پہلا لیکچر سنا۔ انہوں نے معاشیات کا مقصد سمجھایا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا آپ لوگ ہر مضمون کی جماعت میں بیٹھیں اور جن مضامین میں دلچسپی ہو وہ لیجیے۔ ان کی رائے سے بڑی ڈھارس بندھی اور اطمینان ہوا کہ ہمیں مضامین بدلنے کا موقع حاصل ہے۔

مجھے منطق سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ اس مضمون سے ایک طرح کا خطرہ تھا۔ معاشیات کے لیکچر کے بعد میں شاید اٹھ کر چلا جاتا مگر کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نہایت سرخ و سفید پروفیسر جو انگلو انڈین معلوم ہوتا تھا کلاس میں آیا۔ میں آل سینٹس انسٹیٹیوشن میں پڑھ چکا تھا۔ وہ اٹالین رومن کیتھولک مشن کا اسکول تھا۔ وہاں کا مقتدرِ اعلیٰ ایک اٹالین پادری فادر گربیلی تھا جو ریکٹر کہلاتا تھا۔ اونچا لمبا، گورا چٹا آدمی، زعفران کی سی سرخ لمبی ڈاڑھی، ٹخنوں تک لمبا سفید چغہ پہنے، اسکول کی جماعتوں کے درمیانی گلیاری میں ٹہلتا رہتا تھا۔ ہیڈ ماسٹر ایک انگلو انڈین مسٹر فنی مور تھے۔ وہ کسی کالج میں پروفیسر ہو کر چلے گئے تو ان کی جگہ ایک انگریز مسٹر راس نے لی۔ مسٹر راس گورے چٹے بوڑھے آدمی تھے۔ انگریزی بہت اچھی پڑھاتے تھے۔ اب یہاں یونیورسٹی کالج میں ایسا معلوم ہوا کہ مسٹر راس کا چھوٹا بھائی کرسی پر آ بیٹھا ہے۔ آس پاس کے طالب علموں سے پوچھا یہ کون ہیں۔ ایک طالب علم انہیں جانتا تھا کہا "یہ خلیفہ عبدالحکیم ہیں فلسفہ کے پروفیسر، اب یہ منطق پڑھائیں گے۔" منطق کا نام سن کر جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگوں مگر میں جماعت کے وسطی حصہ میں بیٹھا تھا، اٹھ کر بھاگنا محال تھا۔ مجبوراً بیٹھا رہا کہ دیکھوں یہ "انگریز" خلیفہ کیا منطق چھانٹتا ہے۔ ہچکچاتے ہوئے خلیفہ صاحب نے زبان کھولی۔ چند ہی فقروں کے بعد معلوم ہو گیا کہ یہ پنجابی ہیں۔ ابھی ابھی ہم نے پروفیسر الیاس برنی کا لیکچر سنا تھا جو بلند شہر (یوپی) کے تھے۔ انگریزی کے نثر کے پروفیسر مسٹر نارائن گنا جی ولنکر صوبہ بمبئی کے تھے۔ انگریزی نظم کے پروفیسر ڈاکٹر سید عبد الطیف صوبہ مدراس کے تھے۔ دینیات لازمی کے پروفیسر مولانا عبدالواسع بھوپال کے تھے اور اُردو کے مشہور معروف پروفیسر سید وحید الدین سلیم پانی پت کے تھے۔ (جو ویسے تو پنجاب کی سرحد میں تھا مگر اس کو پنجاب اور یو۔ پی کا آمیزہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا)۔ رک رک کر چند فقرے ادا کرنے کے بعد خلیفہ صاحب کی زبان میں وہ روانی پیدا ہو گئی کہ پوری جماعت ہمہ تن گوش ہو گئی۔ زبان سے الفاظ نہیں پھول جھڑ رہے تھے۔ مغربی خیالات اُردو زبان میں اس خوبی سے ادا ہو رہے تھے کہ ہم سب حیرت کے ساتھ سنتے رہے۔ فن منطق کا مقصد بیان کیا، اس کی تشریح کی کہ منطق نام ہے فکر کے قوانین ناظمہ کا۔ ان کے لیکچر کے بعد یہ یقین ہو گیا کہ اگر پڑھنے کے قابل کوئی علم ہے تو وہ منطق ہے۔ غرض میں نے اپنی حد تک یہ طے کر لیا کہ معاشیات اور منطق تو قطعی پڑھوں گا۔ نفسیات کے شعبے کا آغاز ہی نہیں ہوا تھا۔ اب اُردو

عبدالحکیم اکثر آتے تھے۔ ان کے آتے ہی محفل چمک اٹھتی۔ مولوی سلیم اپنی ذہانت کے مقابلے میں کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ مگر خلیفہ صاحب سے مرعوب رہتے تھے۔ کالج میں خلیفہ صاحب کے لیکچر سے، جو ایک گھنٹہ ہوتا تھا، ہمیں اتنا فائدہ نہیں ہوا جتنا ان کی نشستوں سے ہوا۔ کالج میں ان کے خیالات متعلقہ مضمون کی حد کے اندر رہتے تھے لیکن اس محفل میں ہر موضوع پر ان کے افکار، خیالات اور دلچسپ فقرے سننے کا موقع ملتا تھا۔

ریاست کے باہر خلافت اور کانگریس کی سیاسی تحریکوں کا طوفان بپا تھا۔ مسلمان کانگریس کے ساتھ تھے۔ گاندھی جی کو ''مہاتما'' کا خطاب دیا گیا تھا۔ ایسے زمانہ میں ایک خبر شائع ہوئی کہ مسز اینی بسنٹ نے گاندھی جی کی تحریک عدم تعاون کی مخالفت کی ہے۔ مسز اینی بسنٹ ایک عجیب خاتون تھیں۔ یہ غالباً آئرش تھیں۔ آئر لینڈ والے صدیوں سے انگریزوں کے اقتدار کا جوا اتار پھینکنے کی جدوجہد کرتے رہے تھے۔ مسز اینی بسنٹ تھیا سوفی تحریک سے وابستہ تھیں۔ یہ ایک طرح کی صوفیانہ تحریک تھی۔ ہر مذہب کا آدمی اس میں حصہ لے سکتا تھا۔ پہلی جنگ کے بہت پہلے ہندوستان میں اس تحریک کا بہت چرچا تھا۔ اکثر شہروں میں تھیا سوفیکل ہال تعمیر ہوئے تھے جو اس تحریک کے ممبروں کا مرکز ہوتے۔ مسز اینی بسنٹ نے اپنا صدر مقام شہر مدراس کے قریب ادیار کو بنایا تھا یا شاید ان کی آمد سے پہلے ہی وہ صدر مقام قرار پا چکا تھا۔ جنگ سے کچھ پہلے انہوں نے ہندوستان کے لیے ''ہوم رول'' کی تجویز پیش کی تھی جس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستان کی حکومت ہندوستانیوں کے ہاتھ میں ہو۔ اس تحریک کی وجہ سے وہ سارے ہندوستان میں عزت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں۔ اب گاندھی جی کی برطانوی حکومت سے عدم تعاون کی تحریک سے ان کی مخالفت پر لوگوں کو بڑا تعجب ہوا اور بہت سے لوگوں کی نظروں میں ان کا وہ احترام نہیں رہا۔ اس خبر کے شائع ہونے کے بعد حضرت سلیم کی اسی محفل میں خلیفہ عبدالحکیم اور مولوی سلیم ان کے اس بدلے ہوئے رویہ پر گفتگو کرنے لگے۔ ان دونوں کو اس معمر خاتون کی رجعت قہقری پر افسوس تھا۔ مسز بسنٹ کے متعلق یہ گمان تو نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ انگریز حکومت کی حامی بن گئی ہیں۔ اس وقت خلیفہ صاحب نے جو کہا وہ مجھے خوب یاد ہے۔ انہوں نے کچھ اس طرح اپنا خیال ظاہر کیا کہ آدمی بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کے ذہن میں نئی چیزوں کو سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ مولوی سلیم کی یہ نادر خصوصیت تھی کہ ان کا ذہن ہر نئی چیز کو قبول کرنے کے لیے تیار

اور فارسی میں سے کسی ایک زبان کو انتخاب کرنا تھا۔ بہت دنوں تک دونوں جماعتوں میں حاضری دیتا رہا۔ فارسی کے پروفیسر عبدالحمید خاں صاحب کے اخلاق اتنے مسحور کن تھے کہ ان کی جماعت چھوڑنے کو دل نہیں چاہتا تھا۔ ادھر پروفیسر سلیم کے سے مشہور اور تجربہ کار شخص کے علم سے فائدہ نہ اٹھانا بڑی بدنصیبی تھی۔ آخر انتخاب مضامین میں یکسوئی کرنے کا وقت آ پہنچا اور میں نے بادل ناخواستہ فارسی کو خدا حافظ کہا۔

عثمانیہ یونیورسٹی کی اپنی عمارت کی تعمیر تو کجا اس کا منصوبہ بھی تیار نہیں ہوا تھا۔ کالج، کتب خانہ، رجسٹرار کا دفتر، دار الترجمہ وغیرہ سب شہر کے ایک آباد محلہ میں کرایہ کی مختلف کوٹھیوں میں تھے۔ سب سے بڑی کوٹھی افضل حسین مرحوم چیف جسٹس کی تھی جس کے ایک حصہ میں کسی زمانے میں علامہ سید علی حیدر نظم طباطبائی بھی مقیم تھے اور کچھ عجب نہیں کہ ان کی مشہور شرح دیوان غالب اسی کوٹھی کے قیام کے زمانے میں لکھی گئی ہو۔ اس کوٹھی میں کالج کی جماعتیں ہوتی تھیں جس کے ایک بڑے حصہ پر شعبہ سائنس کا قبضہ تھا۔ اس کے قریب ہی ایک کوٹھی میں خلیفہ عبدالحکیم دو اور پروفیسروں کے ساتھ مقیم تھے۔ پاس ہی ایک کوٹھی کے ملحقہ کمرے میں پروفیسر سلیم اپنے ایک کرم فرما کی عنایت سے بلا کرایہ رہتے تھے۔ اس کے معاوضہ میں وقتاً فوقتاً نظمیں لکھ دیا کرتے تھے جو انہیں کرم فرما کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔ یہ کمرہ کوٹھی کے احاطہ میں بگھی خانہ اور اصطبل کے ساتھ تھا۔ گمان غالب یہ تھا کہ یہ کمرہ کوچوان کے لیے بنایا گیا ہوگا۔ جو لوگ مولوی سلیم سے ناخوش تھے وہ کہا کرتے تھے کہ مولوی صاحب اصطبل میں رہتے ہیں۔ شام کو پانچ بجے بعض پروفیسر اور چند طلبہ مولوی صاحب کے ہاں آ جاتے تھے، چائے بنتی اور ہر پیالی میں لاہوری نمک کی ایک ڈلی گھمائی جاتی جس سے چائے نمکین ہو جاتی۔ کوئی چاہے یا نہ چاہے یہی نمکین چائے اس کو پینی پڑتی۔ ہم طلبہ تو استاد کا یہ تبرک بہ خوشی نوش جان کرتے مگر بعض باہر والے ناک بھوں چڑھاتے تھے۔ جو پروفیسر ملنے آتے تھے وہ اپنے گھروں سے چائے پی کر نکلتے تھے اور عموماً چائے کا وقت گزر جانے کے بعد آتے تھے۔ چائے کے بعد مولوی صاحب کمرے کے باہر صحن میں کھڑی چارپائی پر آ بیٹھتے بلکہ لیٹ جاتے۔ آس پاس کرسیاں رکھ دی جاتیں۔ ان پر ملاقاتی بیٹھتے۔ مغرب سے کچھ پہلے محفل جمتی تو رات کے سات آٹھ بجے تک گرما گرم بحثیں ہوتیں۔ کبھی شعر خوانی ہوتی۔ چند طالب علم، دو تین پروفیسر اور کبھی کبھی کوئی باہر والا ملاقاتی آ جاتا۔ اس محفل میں خلیفہ

رہتا تھا۔ انہوں نے خلیفہ صاحب کے خیال کی پر جوش تائید کی اور کہا کہ بالکل یہی بات ہے کہ مسز بسنٹ زمانہ حاضر کے ہندوستانی کو سمجھ نہیں رہی ہیں۔ اس گفتگو کے آخر میں خلیفہ صاحب نے کہا: ''مولوی صاحب، اگر میں بوڑھا ہو جاؤں تو اپنے پوتے کا ساتھ دوں گا، بیٹے کا بھی ساتھ نہ دوں گا۔'' مطلب یہ کہ ذہنی زندگی یہی ہے کہ آدمی نئی تحریکوں، نئے خیالات کو سمجھے اور ان کا ساتھ دے۔

ایک مرتبہ چھٹیوں کے بعد خلیفہ صاحب اس محفل میں آئے۔ اس روز گفتگو میں کچھ زیادہ دلچسپی نہیں لے رہے تھے، چپ چپ سے بیٹھے تھے۔ مولوی سلیم نے چھیڑتے ہوئے کہا ''خلیفہ صاحب، آج آپ کس سوچ میں ہیں۔'' جواب دیا ''مولوی صاحب سوچ رہا ہوں کہ کوئی عظیم انقلاب آ جائے اور مجھے کشمیر کا بادشاہ بنا دے۔'' خلیفہ صاحب کے اس عجیب جواب پر ہم سب چونک پڑے۔ کہاں ہمارا فلسفی پروفیسر اور کہاں ریاست کی حکمرانی کی خواہش۔ سلیم صاحب نے درد بھری آواز میں کہا: ''اس راجہ کی حکومت نے مسلمانوں کا برا حال کر رکھا ہے۔''

اب ہماری سمجھ میں آیا کہ خلیفہ صاحب اس بڑے انقلاب کی خواہش کیوں کر رہے تھے۔ اس کے بعد دیر تک کشمیر کے مسلمانوں پر حکومت کی سختیوں اور مظالم کا ذکر رہا۔ اس سلسلہ میں خلیفہ صاحب نے بتایا کہ وہ کسی چھوٹے سے لکڑی کے پل پر اپنے دوست سے کھڑے باتیں کرتے تھے۔ دوسری طرف سے ایک ہندو پانی کا گھڑا اٹھائے آیا اور پل کے ادھر ہی سے ان سے کہنے لگا کہ پل سے ہٹ جائیں۔ خلیفہ صاحب سے یہ واقعہ سن کر مجھے پہلی دفعہ معلوم ہوا کہ ہندوؤں کے نزدیک چھوت چھات کا اثر لکڑی میں بھی سرایت کر جاتا ہے۔ ہمیں دکن میں اس قسم کا نہ کوئی تجربہ ہوا تھا اور نہ ہم نے کوئی ایسا واقعہ سنا تھا، اگرچہ دکن کے مشرقی اضلاع کے اور خصوصاً صوبہ مدارس کے ہندو چھوت چھات میں بڑا مبالغہ کیا کرتے تھے۔ اسی نشست میں ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب اصلاً کشمیر کے ہیں۔ حضرت اقبال کے معتقد و مرید ہی نہیں ان کے ہم وطن بھی ہیں۔

ہم نے اپنے پروفیسروں میں تین کو معیاری پروفیسر قرار دیا تھا۔ پہلا نمبر این جی ویلنکر کا تھا، دوسرا خلیفہ عبدالحکیم کا اور تیسرا الیاس برنی کا۔ این۔ جی۔ ویلنکر کوکنی برہمن خاندان کے تھے۔ شہر بمبئی کے جنوب میں ایک ساحلی ضلع کوکن ہے۔ یہ لوگ اس ضلع سے

جرم زمین تار کو حائل اگر پاتا ہے تو
تو فرقت خورشید سے گھبرا کے گھناتا ہے تو
ایسے ہی اک اندھیر ہے مجھ کو بھی فکر آب وگل
چھپتا ہے جب نور ازل اس سے تو گھناتا ہے دل

ترجمہ سننے کے بعد کوئی پانچ منٹ تک تالیوں کا شور برپا رہا۔ خلیفہ صاحب نے اپنے مقررہ وقت سے ڈیوڑھا وقت زیادہ لیا۔ لکچر کے بعد پروفیسر ویلنکر نے بھرائی ہوئی آواز میں لکچر کی شدومد کے ساتھ تعریف کی اور لکچرار کا شکریہ ادا کیا۔ اس کامیاب لکچر کے بعد خلیفہ صاحب حیدر آباد کے عام علمی طبقہ میں اچھی طرح متعارف ہو گئے اور ضمناً عثمانیہ یونیورسٹی کا وقار بھی بڑھ گیا۔

ایک روز حضرت سلیم کی محفل میں ہم چند طلبہ موجود تھے اور خلیفہ صاحب کی گلفشانیوں سے محظوظ اور مستفید ہو رہے تھے۔ محفل برخاست ہوئی اور میں نے اپنی بائیسکل سنبھالی۔ خلیفہ صاحب نے پوچھا ''تم بائیسکل پر آیا کرتے ہو؟ کتنی دور ہے تمہارا گھر؟'' میں نے کہا ''ہمارا گھر قدیم شہر کے اندر ہے، یہاں سے خاصا فاصلہ ہے۔'' کہنے لگے ''کتنی دیر میں گھر پہنچتے ہو؟'' میں نے کہا ''تقریباً ایک گھنٹہ میں پہنچ جاتا ہوں۔'' کہنے لگے ''اُفوہ'' یہاں سے ایک گھنٹہ کی مسافت پر رہتے ہو۔ ایک گھنٹہ آنے میں ایک گھنٹہ جانے میں، روزانہ اپنی عمر کے دو گھنٹے صرف طے مسافت میں ضائع کرتے ہو۔'' وقت کی بات تھی۔ ان کا یہ کہنا کہ روزانہ میری عمر کے دو گھنٹے صرف آنے جانے میں صرف ہو جاتے ہیں، میرے دل میں تیر کی طرح لگا اور یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ اس تضیع اوقات سے نجات کس طرح حاصل کروں۔ یونیورسٹی کا ہوسٹل کالج کے قریب تھا مگر اس میں جگہ نہیں تھی۔ میرے دل سے لگی ہوئی تھی کہ کسی طرح ہوسٹل میں آجاؤں۔ ہوسٹل کے لیے ایک کوٹھی گزشتہ سال لی جا چکی تھی۔ اس سال ایک اور کوٹھی ہندو طلبہ کے ہوسٹل کے لیے لی گئی اور اضلاع سے آنے والے ہندو طلبہ کو اس میں جگہ دی گئی تھی۔ میں نے اور دو تین ساتھیوں نے یہ طے کیا کہ ''ہندو ہوسٹل'' میں ممکن ہے کوئی کمرہ مل جائے۔ اس ہوسٹل کے نگران علی گڑھ کے رہنے والے پنڈت ہری ہر شاستری تھے جو سنسکرت کے پروفیسر تھے۔ ہم لوگ ان سے ملے۔ وہ شاید کوئی کمرہ دے دیتے مگر انہیں دکنی ہندو طلبہ کا خیال تھا جو چھوت چھات پر سختی سے عمل کرتے تھے۔ ہم نے درخواست

منسوب ہو کر کوکنی یا کوکنست کہلاتے ہیں۔ دکن کی اور قوموں کے مقابلے میں اُن کا رنگ بہت گورا ہوتا ہے۔ نہایت ذہین اور بڑی مستعد قوم ہے۔ یہ مرہٹے نہیں ہیں مگر سارے مہاراشٹر پر چھائے ہوئے ہیں۔ بعض اہل علم کا خیال ہے کہ یہ لوگ اصلاً ایرانی ہیں جو کسی قدیم زمانے میں سمندر کے راستہ آکر بمبئی کے ساحل پر آباد ہو گئے اور ہندو مذہب اختیار کر کے برہمن بن بیٹھے۔

پروفیسر ویلنکر کی ابتدائی تعلیم کسی مشن اسکول میں ہوئی تھی۔ غالباً اس زمانہ میں وہ عیسائیت سے متاثر ہو کر عیسائی بن گئے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان بھیجے گئے لیکن صحت خراب ہو جانے کی وجہ سے تعلیم کی تکمیل سے پہلے ہندوستان آ گئے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد انہوں نے عیسائیت کو ترک کر دیا اور ''برہمو سماج'' کے ممبر بن گئے۔ حیدر آباد دکن میں وہ ''برہمو سماج'' کے صدر تھے اور ہر سال آٹھ دس دن تک ''برہمو سماج'' کا گویا اک تہوار سا منایا جاتا تھا جس میں روزانہ کسی نہ کسی قابل مقرر کا لکچر بھی ہوتا تھا۔ لکچر ایسے لوگوں کے ہوتے تھے جو عام مذہبی رواداری اور انسانیت کو اہم سمجھتے تھے۔

غرض پروفیسر ویلنکر نے خلیفہ صاحب کو بھی ایک لکچر دینے پر راضی کر لیا۔ ہم سب طالب علم اس روز بڑے اشتیاق کے ساتھ برہمو سماج کے جلسے میں گئے کہ دیکھیں خلیفہ صاحب انگریزی میں کیسی تقریر کرتے ہیں۔ تقریر کا موضوع فلسفیانہ تھا۔ ہم لوگوں نے وقت سے پہلے پہنچ کر اگلی نشستوں پر قبضہ کر لیا۔ خلیفہ صاحب کا لکچر شروع ہوا۔ رک رک کر ایک ایک جملہ ادا کرنے لگے، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ انگریزی میں تقریر کرنے کی مطلق عادت نہیں۔ جلسہ میں بڑے اچھے مقرر اور ہمارے کالج کے علاوہ نظام کالج اور دوسری انگریزی درس گاہوں کے ہندو اساتذہ موجود تھے۔ ہم عثمانیہ کالج والوں کو بڑی مایوسی ہوئی۔ ہم نے گردنیں جھکا لیں۔ چند ہی منٹ کے بعد خلیفہ صاحب کی زبان کھلنے لگی۔ تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد خلیفہ صاحب فراٹے سے بول رہے تھے اور سارا مجمع بڑے انہماک کے ساتھ ان کی تقریر سن رہا تھا۔ خاص خاص موقعوں پر تالیوں سے سارا ہال گونج اٹھتا تھا۔ اسی زمانے میں ان کی ایک نظم ''چاند سے خطاب'' شائع ہوئی تھی۔ لکچر میں اپنے موضوع کو فلسفیانہ انداز میں سمجھاتے ہوئے، انسان کی روح کو خدا کی ذات سے جو تعلق خاص ہے اس کی طرف اشارہ کیا اور اپنی نظم کے یہ دو شعر اپنے مخصوص انداز میں سنا کر ان کا ترجمہ کیا:

کی کہ کوٹھی کے احاطہ میں (اصل عمارت سے علیحدہ) جو ''آوٹ ہاؤسز'' یعنی ملازموں کے کمرے ہیں وہ خالی پڑے ہیں وہی دے دیجئے۔ اس پر وہ راضی ہو گئے۔ ہم تین چار طلبہ کو علیحدہ علیحدہ کمرہ مل گیا۔ اب ہمیں مولوی سلیم کی شام کی محفل میں روزانہ حاضری دینا آسان ہو گیا اگرچہ ہمیں تین مرتبہ کھانا کھانے کے لیے قدیم ہوسٹل کو جانا پڑتا تھا۔

کالج میں تعلیمی کام پوری روانی کے ساتھ جاری تھا کہ خلیفہ صاحب کالج سے مہینہ ڈیڑھ مہینے کی رخصت لے کر وطن چلے گئے۔ اسی زمانہ میں (شاید چند ہی ماہ پیشتر) مرزا محمد ہادی رسوا (مصنف ''امراؤ جان ادا'') پروفیسر کرسچن کالج لکھنو کا دارالترجمہ میں مترجم فلسفہ و منطق کی خدمت پر تقرر ہوا تھا۔ پہلے اس خدمت پر مولانا عبد الماجد دریا بادی مامور تھے۔ ان کی کتاب ''فلسفہ اجتماع'' پر حیدر آباد کے اخباروں نے ایک شور مچایا تھا کہ اس کتاب میں بزرگان دین کی شان میں گستاخیاں کی گئی ہیں۔ خبر نہیں کہ ان سخت تنقیدوں سے برہم ہو کر خود مولانا عبد الماجد نے استعفا دے دیا تھا یا سرکاری طور پر انہیں علیحدہ کر دیا گیا تھا۔

خلیفہ صاحب کی غیر حاضری میں ہمیں منطق پڑھانے کا کام مرزا ہادی رسوا کے سپرد ہوا۔ مرزا رسوا منطق میں عالمانہ مہارت رکھتے تھے۔ اگرچہ انہوں نے عربی منطق پڑھی ہو گی مگر انگریزی سے خوب واقف تھے اور منطق کی انگریزی کتابوں کا ترجمہ کر رہے تھے۔ اس وقت ان کی عمر پچاس ساٹھ کے درمیان تھی۔ آواز بہت پست اور باریک تھی۔ انداز بیان بھی شگفتہ نہیں تھا، طلبہ میں مقبولیت حاصل نہ کر سکے۔ انہوں نے منطق کی ایک خاص بحث کو دائروں کی صورت میں ترتیب دیا تھا۔ یہ ان کی اپنی ایجاد تھی۔ میں نے بڑی احتیاط سے ان کے نوٹ اپنی بیاض میں لکھ لئے تھے۔ انہوں نے خود فرمایا تھا کہ ان کو لکھ لو کام آئیں گے اور حقیقت میں وہ بڑے کارآمد دائرے ثابت ہوئے۔ رخصت کے ختم ہونے پر جب خلیفہ صاحب واپس آئے تو مرزا ہادی رسوا صاحب سے نجات ملنے پر طلبہ نے گویا ''یوم نجات'' منایا۔ ہم چند ہی طلبہ ایسے تھے جن پر مرزا صاحب کی فضیلت کا اثر تھا۔ ہمیں افسوس تھا کہ ہمارے ساتھیوں نے نہ صرف ان سے فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ ان کی فضیلت کا خاطر خواہ احترام بھی نہیں کیا۔

دسمبر کے مہینے میں سرمائی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو جاتا تھا۔ اضلاع کے طلبا اور پروفیسر اپنے اپنے وطن کو چلے جاتے تھے۔ اس سال سرما کی تعطیلات کے بعد جب کالج

کھلا تو معلوم ہوا کہ خلیفہ عبد الحکیم کی شادی ہو چکی ہے۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، نواب صدر یار جنگ (رئیس بھیکم پور) اس زمانہ میں حیدر آباد دکن میں صدر الصدور (وزیر امور مذہبی) کے عہدہ پر فائز تھے۔ حضور نظام کے ہاں مولانا کا بڑا اثر و رسوخ تھا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ایک فیکلٹی کے ڈین بھی تھے۔ شادی کی تقریب میں انہوں نے ایک ڈنر دیا جس میں مولوی سلیم بھی شریک تھے۔ ہمیں معلوم ہوا کہ کھانے کی میز پر مولوی سلیم نے ارتجالاً چند شعر سنائے جس سے ساری محفل محظوظ ہوئی۔ اڑتے اڑتے ایک شعر ہم لوگوں تک بھی پہنچا۔ اس وقت اس کا پہلا مصرعہ یاد نہیں دوسرا مصرعہ یہ ہے جس میں سلیم صاحب نے خلیفہ صاحب سے خطاب کیا ہے:

تو وہ دولہا ہے کہ شرمندہ دلہن ہے تجھ سے

اسی زمانہ میں جناب ہارون خاں شروانی پروفیسر تاریخ کی بھی شادی ہوئی تھی۔ ہوسٹل کے طلبہ نے یہ طے کیا کہ ان دونوں پروفیسروں کو شادی کی خوشی میں ایک ڈنر دیا جائے۔ چنانچہ ڈنر ہوا اور ایک تصویر بھی لی گئی جس میں دونوں دولہوں کے ساتھ دو طالب علم دولہے بھی ہیں جن کی انہیں دنوں میں شادی ہوئی تھی۔ تقریباً چالیس سال پہلے کی یہ یادگار تصویر حسن اتفاق سے میرے پاس محفوظ رہ گئی ہے۔

سر اکبر حیدری نے ایک تعلیمی خدمت یہ بھی کی کہ نوجوان پروفیسروں کو آسان شرائط پر قرضہ دیئے جانے کی اسکیم حکومت سے منظور کرالی تاکہ وہ یورپ جا کر اپنے اپنے شعبوں کی اعلیٰ تعلیم پا سکیں۔ خلیفہ صاحب کو بھی قرضہ دیا جانا منظور ہوا۔ ۱۹۲۳ء میں ہم نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا اور خلیفہ صاحب یورپ روانہ ہوئے۔ اگر وہ موجود ہوتے تو شاید میں بی۔ اے میں فلسفہ کا مضمون لیتا۔ ڈھائی تین سال کے بعد خلیفہ صاحب پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لے کر واپس آئے۔ میں بی۔ اے کر کے ایم۔ اے میں تھا۔ گریجویٹ طلبہ کے ہوسٹل کے لیے ایک علیحدہ کوٹھی کرایہ پر لی گئی تھی جو ہمارے سابقہ ہندو ہوسٹل کے قریب تھی۔ خلیفہ صاحب نے اس کے برابر والی کوٹھی کرایہ پر لی۔ اب پھر ان سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ خلیفہ صاحب اپنی بیگم اور صاحبزادے کو لے آئے تھے۔ پہلی دفعہ میں نے ان کے صاحبزادہ کو دیکھا تین چار سال کی عمر تھی۔ خلیفہ صاحب نے بتایا کہ اس کا نام "عارف حکیم" رکھا ہے۔ اس زمانے میں اس ترکیب کے ناموں کا بالکل رواج نہیں تھا۔ مولوی سلیم

پہلے شخص تھے جنہیں ہندوستانی مسلمانوں کے پرانے انداز کے ناموں کو بدلنے کا خیال پیدا ہوا۔ وہ کہتے تھے کہ ترکی انداز کے دولفظی نام رکھے جائیں۔ انہوں نے اس قسم کے ناموں کی دو بڑی بڑی فہرستیں بنائی تھیں، لڑکوں کے ناموں کی ایک فہرست اور لڑکیوں کے ناموں کی ایک فہرست۔ اگر کوئی ملاقاتی اپنے لڑکے یا لڑکی کے لیے نام تجویز کرنے کی فرمائش کرتا تو اپنی فہرست میں سے دو تین نام بتا دیتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خلیفہ صاحب کو اس تجویز کا ضرور علم تھا۔

ڈاکٹر عبدالحق بی لٹ، پی ایچ۔ ڈی (آکسن) عربی کے پروفیسر ہو کر کالج میں آئے۔ یہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے۔ لڑکپن میں عربی کی تعلیم کسی قدیم طرز کے عربی مدرسہ میں تکمیل کر کے انگریزی پڑھنے علی گڑھ جا پہنچے۔ وہاں مولانا حالی سے ملے اور کہا جناب میں آپ کو اپنے شعر و شاعری سنانا چاہتا ہوں۔ انہوں نے ان کی کم عمری اور ہیئت کذائی کو دیکھ کر فرمایا، میاں صاحبزادے شعر و شاعری میں مت پڑو، اپنی تعلیم کی طرف پوری توجہ صرف کرو۔ انہوں نے کہا: ''مولانا شاید آپ سمجھ رہے ہوں گئے کہ میں اُردو شعر سناؤں گا۔ نہیں اپنے عربی شعر سنانا چاہتا ہوں۔'' اس پر تو مولانا حالی چونک پڑے۔ کہا ''سناؤ''۔ شعر سنائے۔ شعر تو خیر کیا ہوں گے مگر مولانا حالی کو اتنا اندازہ ہوا کہ یہ کم عمر لڑکا عربی پڑھ کر آیا ہے۔ شاید انہوں نے یہ خیال کیا کہ علی گڑھ میں انگریزی شروع کرنے سے بہتر ہوگا کہ یہ مصر چلا جائے اور وہاں عربی کی تعلیم مکمل کر لے۔ غالباً انہوں نے عزیز مرزا صاحب ہوم سیکرٹری کو سفارشی خط دیا ہوگا۔ عبدالحق حیدر آباد واپس آئے، عزیز مرزا سے ملے۔ انہوں نے کہا ''افسوس ہے تمہیں وظیفہ دے کر مصر نہیں بھیج سکتا کیونکہ اس زمانہ میں مصری حکومت سے انگریزی حکومت کے تعلقات خراب ہیں۔ انگریزی حکومت کو ممکن ہے یہ ناگوار گزرے کہ حکومت نظام اپنے طالب علم مصر کو بھیج رہی ہے۔ ہم تمہیں مصر جانے کا سفر خرچ دیتے ہیں، تم جامعہ ازہر میں داخلہ لے لو۔'' غرض عبدالحق سفر خرچ کی رقم لے کر بمبئی پہنچے اور جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ وہاں کسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد سے ملاقات ہوگئی۔ وہ اس زمانے میں رسالہ الہلال نکالنے کی فکر میں تھے۔ انہیں روک لیا کہ تم عربی اخباروں اور رسالوں سے ترجمہ کا کام سنبھال لو۔ دو تین مہینے ان کے ساتھ ساتھ پھرتے رہے۔ مگر معلوم نہیں کس بات سے ناراض ہوئے کہ مصر جانے کا تہیہ کرلیا۔ دریافت سے معلوم کہ جہاز کا ٹکٹ چھ مہینے تک کارآمد

ان سے اس قدیم ربط کی تجدید ہوگئی۔ سرما کا آغاز ہی تھا کہ مجھے نزلہ زکام ہوگیا۔ اس حالت میں مجھے دیکھتے ہی خلیفہ صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا......''دکنی بچے پر لاہور کی سردی نے حملہ کر دیا......'' میں نے کہا'' ابھی سردی کہاں شروع ہوئی ہے۔ نزلہ زکام تو کبھی کبھی گرما میں بھی ہو جاتا ہے۔'' کہنے لگے''نہیں یہ دکن کی سردی نہیں ہے لاہور کی سردی ہے سخت احتیاط کرو۔'' ان ملاقاتوں کی یادگار خلیفہ صاحب کا صداقت نامہ ہے جس میں انہوں نے اپنی مہربانی سے میرے متعلق اپنے اچھے خیالات کا اظہار فرمایا ہے۔

چند ہی ماہ کے بعد میں ریلوے روڈ اور پھر نسبت روڈ پر چلا گیا اور پھر کراچی آ گیا۔ وارث روڈ والی وہی چند ملاقاتیں آخری ملاقاتیں تھیں۔ کراچی میں کبھی کبھی خبر ملتی تھی کہ خلیفہ صاحب آئے تھے اور چلے گئے۔ کب آئے اور کہاں ٹھہرے تھے اس کا علم نہیں ہوتا تھا۔ آخر ۱۹۵۹ء میں اچانک یہ خبر اخبار میں پڑھی کہ خلیفہ عبدالحکیم کراچی میں جناب ممتاز حسن صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے، یکایک قلب کا دورہ پڑا اور حرکت قلب کے بند ہو جانے سے جاں بحق ہو گئے۔ اس زمانہ میں خود بیمار تھا یہ خبر پڑھ کر عجب حالت طاری ہوئی۔ مجھے اپنی زندگی کی وہ صبح یاد آئی جس میں خلیفہ صاحب کا مسکراتا ہوا چہرہ آئندہ مصاف زندگی کے لیے ہمیں تیار کر رہا تھا اور ہمارے حوصلے بڑھاتا تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم کی عمر میں اور ہم طالب علموں کی عمروں میں کوئی بڑا تفاوت نہیں تھا۔ ہم میں سے اکثروں سے وہ پانچ سات سال ہی بڑے ہوں گے۔ ان کے شاگردوں میں دو چار طالب علم ایسے بھی تھے جو ان کے ہم عمر بلکہ ان سے کچھ بڑی عمر کے ہوں گے۔ وہ کبھی اپنے پروفیسر ہونے کا رعب نہیں جماتے تھے بالکل مساوات کا برتاؤ کرتے تھے۔ میری جماعت میں ایک طالب علم ان کے ہم عمر یا سال دو سال بڑے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کر چکے تھے۔ حیدرآباد کے جاگیردار خاندان کے فرد تھے۔ جماعت میں پان کی ڈبیہ اور بٹوہ ساتھ لاتے تھے اور بے تکلف پان کھایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی پروفیسروں کو بھی پان پیش کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب پان کھانے کے عادی نہیں تھے، اگر انہیں اس کی عادت ہوتی تو مجھے یقین ہے کہ وہ بے تکلفی سے شاگرد کا پان بھی کھا لیتے۔

میں اپنی حد تک غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ مجھ پر دو ایک پروفیسروں کا اثر غالب رہا۔ پروفیسر ویلنکر کا اور دوسرے خلیفہ عبدالحکیم کا۔ سب سے زیادہ میں پروفیسر ویلنکر

رہتا ہے اور ابھی اس کی مدت باقی تھی۔ یہ مصر چلے گئے۔ وہاں کچھ مدت گزار کر قسطنطنیہ گئے اور خشکی کے راستہ سے یورپ کے درمیانی ملکوں سے گزرتے ہوئے انگلستان پہنچ گئے۔ لطف یہ ہے کہ اس وقت تک انگریزی کا ایک حرف نہیں جانتے تھے۔ تقریباً پچیس سال انگلستان میں رہے۔ پہلے بی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ مولوی سلیم سے ان کی خط و کتابت تھی۔ مولوی صاحب کو انہوں نے اپنی ایک تصویر بھیجی تھی جس میں وہ بی لٹ کا گون پہنے تھے۔ یہ تصویر مولوی صاحب نے ہم سب کو دکھائی تھی۔ اس مدت میں ایک مرتبہ حیدر آباد آئے اور وظیفہ منظور کرا کر پھر انگلستان گئے اور ڈی۔ فل (پی۔ ایچ۔ ڈی) کی ڈگری لے کر واپس آئے۔

ڈاکٹر عبد الحق انتہا کے سیاہ فام تھے۔ ناک نقشہ نہایت سڈول۔ تصویر دیکھئے تو بڑے خوبصورت آدمی معلوم ہوتے تھے مگر رنگ بلا کا سیاہ تھا۔ ڈاکٹر عبد الحق اور خلیفہ عبد الحکیم بڑے گہرے دوست بن گئے۔ روزانہ شام کو دونوں ٹہلنے نکل جاتے تھے۔ دیکھنے والوں کی بڑی تفریح تھی کہ ایک سرخ و سفید اور دوسرا انتہائی سیاہ آدمی، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے مسکراتے باتیں کرتے چلے جا رہے ہیں۔ بعض طالب علموں نے اس اجتماع کا نام ''بلیک اینڈ وہائٹ'' رکھ دیا تھا جو ایک مشہور شراب کا تجارتی نام ہے۔

۱۹۲۷ء میں میں ایم۔ اے کا امتحان دے کر ہوسٹل سے اپنے گھر چلا گیا اور پھر کشمکش حیات میں ایسا مبتلا رہا کہ حیدر آباد شہر کے باہر ہی رہا یہاں تک ۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم عمل میں آئی۔ اس بیس سال کی مدت میں چند ہی مرتبہ خلیفہ صاحب سے سرسری طور پر ملنے کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۴۸ء میں ریاست حیدر آباد کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۴۹ء کے آغاز میں میں پاکستان چلا آیا اور ایک ملازمت کے انٹرویو کے سلسلے میں لاہور گیا۔ وہاں میرے بزرگ کرم فرما ملک حبیب احمد صاحب نے اپنے ہاں ٹھہرا لیا۔ جو کوٹھی ملک صاحب کو ملی تھی وہ وارث روڈ پر ہے۔ اسی سڑک پر چند قدم کے فاصلہ پر ڈاکٹر شانتی سروپ بھٹنا کر کی متروکہ کوٹھی میں خلیفہ عبد الحکیم صاحب کا قیام تھا۔ اتفاقاً کسی کی زبان سے نکلا کہ خلیفہ صاحب یہیں رہتے ہیں۔ بس میں بے اختیار وہاں پہنچا۔ تیس برس کے بعد استاد شاگرد پھر اکٹھے ہوئے۔ لیکن دونوں بدلے ہوئے تھے۔ خلیفہ صاحب ادارہ ثقافت اسلامیہ کے قیام کے سلسلے میں متردد تھے اور میں سخت پریشان حال تھا کہ خود بے روزگار تھا اور بیوی بچے حیدر آباد دکن میں پھنسے ہوئے تھے، ان کے بلانے کی کوئی تدبیر بن نہیں پڑتی تھی۔ بہر حال ان دنوں جو چند ملاقاتیں ہوئیں

خدمت اور دیکھ بھال کر سکوں گا۔ بہر حال خلیفہ صاحب میرے ہاں تشریف لے آئے اور یہ دن اپنی معنوی اہمیت اور اپنے دوررس ادبی اور ملی اثرات کے لحاظ سے میرے لئے ایک تاریخی دن تھا۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں مجھے خلیفہ صاحب سے صرف نہایت دور کی آشنائی تھی وہ بھی صرف ان کے نام تک محدود تھی۔ لیکن ابھی چند منٹ بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ میں یہ محسوس کرنے لگا کہ یہ تو میرے پرانے دوست اور رفیق ہیں۔ خلیفہ صاحب کا بشاش، خوش قیافہ چہرہ اور نہایت ہی بے تکلف طرز گفتار اور ان کا محبت آمیز خلوص ''من وتو'' کے تمام مراحل طے کر چکا تھا۔

پروگرام کے مطابق ان کا قیام یہاں غالباً صرف ایک دن تھا اور اب میری انتہائی آرزو یہ تھی کہ ان کا قیام کچھ طویل ہو جائے مگر اس آرزو کے برآنے کی بظاہر کوئی امید نہ تھی کیونکہ اگلے ہوائی جہاز میں ان کی سیٹ ریزرو ہو چکی تھی۔ مگر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ موسم بہار کی بارش اور متغیر ہواؤں نے مزید تین دن خلیفہ صاحب کو تہران میں روکے رکھا اور ان مختصر سے تین دنوں میں وہ کئی دلچسپ اور دل انداز یادگاریں یہاں چھوڑ گئے اور کچھ اپنے ہمراہ لے گئے۔ میں اس ضمن میں یہاں کی بعض شخصی ملاقاتوں کا ذکر ضروری خیال کرتا ہوں محض زیب داستاں کے لیے نہیں بلکہ ان تاثرات اور اثرات کے پیش نظر جو بعد میں مختلف طور پر نتیجہ خیز ثابت ہوئے۔

21 اپریل کو سفارت خانہ پاکستان میں یوم اقبال کی تقریب تھی اور ایران کے علماء، فضلا اور ادبا بڑی تعداد میں جمع تھے۔ جلسہ کے صدر علامہ علی اکبر مرحوم تھے دہ ایران معاصر کی بلند ترین علمی اور ادبی شخصیتوں میں سے تھے اور ان کی بے مثل تالیف لغت نامہ (جو فارسی زبان میں دائرۃ المعارف کی حیثیت رکھتی ہے) شرق وغرب میں معروف ہے۔ علامہ مرحوم نے اپنے صدارتی خطبہ میں اقبال کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا کہ سیاسی غلامی سے ذہنی اور فکری غلامی خطرناک تر ہوتی ہے اور اقبال نے انسان کو ذہنی غلامی اور فکری فساد سے نجات دینے کی کوشش کی ہے اور یہ اقبال کا تمام اہل شرق پر احسان ہے۔ خلیفہ صاحب پر ایران کے ہشتاد سالہ عالم کے الفاظ کا بہت اثر ہوا اور مجھ سے کہا کہ میں علامہ دہ خدا سے خصوصی طور پر ملاقات کرنا چاہتا ہوں۔ چنانچہ ان سے ملاقات ہوئی جس کا ذکر بعد میں آئے

گا۔

اسی جلسہ میں خلیفہ صاحب نے فی البدیہ اقبال پر فارسی زبان میں تقریر کی جس میں حاضرین کو بتایا کہ اقبال نے ملا اور اس کی گمراہی پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس تقریر میں جو خلیفہ صاحب کی فارسی زبان میں پہلی تقریر تھی، نہایت دلچسپ لطیفے اور داستانیں بیان کیں۔ اگرچہ ان کا تلفظ اور لہجہ ایرانی نہیں تھا لیکن وہ الفاظ کو نہایت صاف صاف اور علیحدہ ادا کرتے تھے جس سے حاضرین کو سمجھنے میں کوئی مشکل نہ تھی۔ سارا ہال قہقہوں سے گونج رہا تھا۔ یہ تقریر باتی پروگرام کے ساتھ ریڈیو تہران سے تمام ملک میں ریلے بھی کی گئی اور پڑھے لکھے لوگوں میں اس کا خاطرہ خواہ اثر ہوا کیونکہ ایران میں بھی کم و بیش وہی حالات موجود ہیں جن پر اقبال نے تنقید کی ہے۔

جلسہ کے دوسرے روز میں علامہ دہ خدا کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ خلیفہ صاحب آپ کی خدمت میں ملاقات اور عرض ارادت کے لیے حاضر ہونا چاہتے ہیں، علامہ کی صحت ایک مدت سے خراب تھی اور وہ بہت کم گھر سے نکلتے تھے۔ بڑھاپے اور علالت کی وجہ سے ان کے لیے حرکت کرنا بھی مشکل تھا۔ میری بات سن کر فرمایا کہ میں بیمار اور بوڑھا ہوں۔ مگر ہماری قدیم ایرانی وضع داری اور مہمان نوازی کا تقاضا یہ ہے کہ میں خود ایسے بلند مقام دانشمند کی خدمت میں حاضر ہوں۔ میں یہ گوارا نہیں کروں گا کہ وہ میرے پاس آئیں۔ میں نے کہا کہ میرے لئے اور خلیفہ صاحب کے لیے آپ کا قدم رنجہ فرمانا باعث فخر ہے۔ علامہ دہ خدا میرے ہاں تشریف لائے۔ ان دو عظیم شخصیتوں کی ملاقات میری نظر میں ایک تاریخی واقعہ تھا۔ اتفاق سے ایران کے چند ایک اور ادیب اور شاعر بھی تشریف لے آئے تھے میں نے فوٹو گرافر کو ٹیلیفون کیا اور اس نے چند تصویریں لیں، ان میں سے ایک گروپ کی تصویر میرے پاس تھی جو فارسی مجلہ ہلال میں چھپ چکی ہے۔

خلیفہ صاحب سے ملاقات اور گفتگو کا علامہ دہ خدا پر بہت اچھا اثر ہوا۔ علامہ دہ خدا بھی مولانا روم کے مداحوں میں سے تھے اور خلیفہ صاحب کی باتیں نہایت توجہ سے سنتے رہے اور پاکستان میں ان کی دوستانہ دلچسپی میں اضافہ کی بڑی وجہ خلیفہ صاحب سے ملاقات تھی۔

مجھے اس سے پہلے معلوم نہ تھا کہ خلیفہ صاحب نے رومی اور اسلامی ادبیات کا اتنا

وسیع اور اتنا گہرا مطالعہ کیا ہے اور فلسفہ شرق وغرب پر ان کو اتنا عبور ہے۔ اس کے علاوہ انہیں بے شمار فارسی اشعار یاد تھے اور مناسب موقع پر ان اشعار کو پیش کرتے تھے۔ قیام کے تیسرے دن کی شام کو کچھ وقت مل گیا اور میں نے خلیفہ صاحب سے کہا کہ اگر ممکن ہو تو آپ کو پروفیسر بدیع الزمان فروز انفر سے مل لینا چاہئے۔ پروفیسر فروز انفر ایران میں بلکہ دنیا بھر میں رومی کے سب سے بڑے محقق اور مفسر سمجھے جاتے ہیں اور میرا دل گواہی دیتا تھا کہ یہ ملاقات ہمارے آئندہ ادبی اور علمی تعلقات کے لیے مفید ثابت ہو گی۔ میں نے فروز انفر صاحب کو ٹیلیفون کیا کہ ہم چند منٹ کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونا چاہئے ہیں۔ ضمناً میں نے ان کو کہہ دیا کہ خلیفہ صاحب برصغیر میں سب سے بڑے رومی کے محقق ہیں اور سب سے پہلے رومی کے فلسفہ پر جو کتاب لکھی گئی ہے انہی کے قلم سے ہے۔ ٹیلیفون محض اطلاع کے لیے کیا تھا خلیفہ صاحب کو لے کر غروب کے کچھ بعد ہم پروفیسر فروز انفر کی خدمت میں پہنچ گئے۔ ان دو عظیم المرتبت شخصیتوں کی گفتگو میرے لئے سرور روح تھی۔ چند منٹ کی مختصر ملاقات میں ان دو عالموں اور ان کے وسیلے سے دو ہمسایہ ملکوں کے ادبی اور علمی حلقوں کے درمیان ایک گہرا رشتہ قائم ہو چکا تھا۔

خلیفہ صاحب کے قیام تہران کے دوران کا ایک اور دلچسپ اور نتیجہ خیز واقعہ ان کی لیڈی ڈاکٹر کچکینہ کاظمی سے ملاقات ہے۔ مارچ 1952ء میں بیگم لیاقت علی خاں کی طرف سے کئی ممالک کی خواتین کو اپوا (APWA) کے بین المللی جلسہ میں شرکت کے لیے دعوت دی گئی۔ ایران کی طرف سے بھی کافی تعداد میں خواتین نے شرکت کا ارادہ اور وعدہ کیا۔ مگر عین وقت پر معلوم ہوا کہ مختلف وجوہات کے باعث سب نے پاکستان جانے کا ارادہ ترک کر دیا ہے۔ ہم سفارت کی طرف سے کئی ایک نام بھجوا چکے تھے اور اس پہلے مہم بین المللی جلسہ میں ایران کی طرف سے اب ایک خاتون بھی جانے کو تیار نہ تھی۔ جب صرف ایک دن باقی رہ گیا تو سفیر کبیر کے ایما سے میں ڈاکٹر کاظمی کے ہاں گیا اور کہا کہ ایرن کی غیبت ہم سب کے لیے افسوسناک ہو گی۔ دو ہمسایہ ملکوں کے درمیان اتنے تعلقات ہوتے ہوئے کم از کم ایک خاتون کو جلسہ میں شرکت کرنی چاہئے۔ یہاں اس بات کا ذکر کر دینا لازم ہے کہ اس زمانے میں ہمارے ایران سے تعلقات تو دوستانہ تھے مگر حالات موجودہ حالات سے بہت مختلف تھے۔ ایران کی دوستی حاصل کرنے کے لیے کئی ممالک میں رقابت تھی اور اغلب دعوتیں جو

ایرانیوں کو بیرونی ممالک سے آتی تھیں ان کا تمام خرچ دعوت دینے والے ملک کے ذمہ ہوتا تھا مگر اپوا کے جلسہ میں ایران سے لاہور کا خرچ شرکت کرنے والی خاتون کے ذمہ تھا یا اس مدعو ملک کی حکومت کو ادا کرتا تھا۔ حکومت کا جہاں تک تعلق ہے اسے اس جلسہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بہرحال کچھ گفتگو اور بحث تمحیص کے بعد میں نے ڈاکٹر کاظمی کو شرکت اور ان کے والد محترم پروفیسر کاظمی کو اجازت دینے پر آمادہ کرلیا۔ دوڑ دھوپ کے بعد ہمارے ہم کار ملک محمد اکرام نے اپنی بیگم کو جو لاہور میں موجود تھیں بذریعہ تار اس محترم خاتون کی آمد کی اطلاع دے دی تاکہ وہ مناسب طور پر ان کا استقبال اور رہائش وغیرہ کا انتظام کرسکیں۔ لاہور میں قیام کے دوران میں ایرانی مہمان کا وہاں کے علمی وادبی حلقوں اور پنجاب یونیورسٹی کے اساتذہ اور دیگر فارسی دوست لوگوں سے تعارف کرایا گیا جس کا بہت اچھا اثر ہوا۔ چنانچہ ڈاکٹر کچکینہ کاظمی جب تہران واپس آئیں تو ہر لحاظ سے پاکستان اور خاص کر خواتین پاکستان کی گرویدہ تھیں۔ ڈاکٹر کاظمی نے خود بخود انجمن بانوان ایران میں ایک جلسہ کا انتظام کیا اور سفارت کے اراکین کو شرکت کی دعوت دی۔ ہمارے لئے ان ابتدائی مراحل میں یہ ایک غیر مترقبہ موقع تھا اور میں نے خلیفہ صاحب سے کہا کہ مناسب ہوگا اگر وہ بھی اس جلسہ میں شرکت کریں خلیفہ صاحب نے نہایت خوشی اور اشتیاق سے دعوت قبول کی اور کہا کہ ایسے موقعوں پر پاکستانیوں کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں شرکت کرنی چاہیئے۔

سفارت خانہ کے ایک اور آفیسر افضل اقبال (جن کو ایرانی ادبیات میں غیر معمولی دلچسپی ہے) بھی ہمارے ہمراہ اس جلسہ میں شریک ہوئے۔ ہم جلسہ میں بہت دیر سے پہنچے اور جب ہال میں داخل ہوئے تو کافی انتظار کے بعد ڈاکٹر کاظمی تقریر شروع کرچکی تھیں اور ہال میں کوئی پاکستانی موجود نہ تھا۔ ہمارے آنے کے بعد ڈاکٹر نے مختصر طور پر اپنی تقریر کو دہرایا اور تقریباً ایک گھنٹہ تک پاکستانیوں کے خلوص، ان کی ایران دوستی اور فارسی زبان میں دلچسپی کے متعلق تقریر کی۔ یہ پہلی تقریر تھی جو عورتوں کے جلسہ میں پاکستان کے بارے میں کی گئی اور حاضرین نے نہایت دلچسپی سے اس تقریر کو سنا۔ خلیفہ صاحب پر مقرر خاتون کی سادگی بیان اور پاکستان سے ان کی گہری ہمدردانہ دلچسپی کا بہت اثر ہوا اور انہوں نے ڈاکٹر کاظمی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ان کی پرخلوص تقریر کی تعریف کی اور کہا کہ آپ کی تقریر ایرانی خواتین میں پاکستان کے متعلق دلچسپی پیدا کرنے میں بہت موثر ثابت ہوئی ہے اور میں آپ کے

خلوص اور ہمدردی سے اتنا متاثر ہوا ہوں کہ میرے دل میں ایران کی اور بالخصوص ہر انہائی خاتون کی عزت بڑھ گئی ہے۔ خلیفہ صاحب تو واپس پاکستان چلے گئے لیکن ڈاکٹر کاظمی سے ان کی ملاقات اور باتوں کا یہ اثر ہوا کہ وہ پاکستان کی نہایت مخلص دوست بن گئیں اور 1952ء میں جب انجمن فرہنگی ایران و پاکستان کی طرف حکومت کی کوئی توجہ نہ تھی، ڈاکٹر کاظمی نے اس انجمن کا انتظام اور خرچ اپنے ذمہ لے لیا اور قریباً تین سال بہت مفید خدمت انجام دیتی رہیں۔ خلیفہ صاحب پر اس نیک دل خاتون کی بے لوث خدمت کا جو اس نے کئی سال شخصی اور نجی حیثیت سے اور حکومت ایران یا پاکستان کی طرف سے کسی قسم کی ہمت افزائی یا دلچسپی کے بغیر انجام دیں گہرا اثر تھا اور انہوں نے ڈاکٹر کاظمی کو فروری 1956ء میں پاکستان آنے کی دعوت دی۔ ڈاکٹر کاظمی نے اس روز مغربی پاکستان کا دورہ کیا۔ لاہور میں انہوں نے خلیفہ صاحب کے ہاں ہی قیام کیا اور نہایت اچھے تاثرات لے کر واپس ہوئیں۔

دسمبر 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام بین الملی اسلامی مجلس مذاکرہ منعقد ہوئی جس میں ایران کے چند علما نے جن میں ڈاکٹر رضا زادہ شفق، پروفیسر سعید نفیسی اور پروفیسر فروز انفر بھی شامل تھے شریک ہوئے۔ مذہبی معاملات میں خلیفہ صاحب کی بلند اور وسیع نظر اور مشرق و مغرب کے فکری اور ادبی علوم سے گہری آشنائی سے یہ سب علما متاثر ہوئے۔ ڈاکٹر شفق سے خلیفہ صاحب کی ملاقات یورپ، امریکہ اور دیگر بین الملی مجالس میں بھی ہوئی اور ڈاکٹر شفق ان کے شخصی اخلاق اور وسعت مطالعہ کے بڑے مداح ہو گئے۔

جب خلیفہ صاحب کی ناگہانی موت کی خبر ایران پہنچی تو ان کے صدہا جاننے والوں کو بہت رنج ہوا۔ انجمن فرہنگی ایران۔ پاکستان کی طرف سے پاکستان کے اس عالی قدر عالم اور ادیب کی یاد میں ایک جلسہ ہوا جس میں تہران کے علما و فضلا و شعرا نے شرکت کی۔ ایران کے بلند پایہ شاعر آقائے صادق سرمد نے اس جلسہ کی صدارت فرمائی۔

جلسہ کے صدر آقائے سرمد نے اس انداز سے سلسلہ کلام کا آغاز کیا:

انساں بہر مقام و بہر شاں رتبتے است
پر خوان زندگانیش از مرگ قسمتے است

حکم ممات بر سر بازیچہ حیات
حکم طبیعت است و بحکم مشتے است

کس را مجال نیست کہ بگریزد از اجل
گر عادل است آجل حتمی قھیتے است

(انسان کسی مقام، کسی شان اور کسی رتبے کا حامل ہو، جب زندگی کا خوان اس کے

لیے آراستہ کیا جاتا ہے تو لامحالہ اسے موت کا ذائقہ ضرور چکھنا پڑتا ہے...... بشری تقاضا یہی ہے کہ موت اس لہو ولعب کی زندگی کا سلسلہ منقطع کر دے، مشیت ایزدی بھی یہی ہے...... موت سے گریز وفرار کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ خواہ جلد آئے یا بدیر موت قدرت کا ایک اٹل قانون ہے)

آج کی رات پاکستان کے عالی مقام مفکر اور ممتاز و متبحر شخصیت خلیفہ عبد الحکیم کی روح پر فتوح کی مبارک پرواز کے اعزاز میں انجمن نے یہ جلسہ منعقد کیا ہے جس میں شرفاء و خواتین رونق افروز ہیں۔ خلیفہ عبد الحکیم مرحوم نے اسلامی فضائل و کمالات کے مکتب میں تربیت پائی تھی اور جب تک آپ اس دنیا میں رہے علم وفضل کے موتی بکھیرتے اور لٹاتے رہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج جب کہ آپ اس دنیا کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے ہیں، آپ کے علم وفضل کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں۔ دنیائے فضل و کمال کی نظر آپ پر اور آپ کی نظر دنیائے فضل و کمال پر ہے۔

اگرچہ اس نوع کی شخصیتوں کی ابدی زندگی کا آغاز موت سے ہوتا ہے۔ لیکن جہاں تک ان کے مادی آثار اور عالم انسانی کی حرماں نصیبی کا تعلق ہے، ملت کے کسی ممتاز فرد کی رحلت کا احساس دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑ جاتا ہے:

آرے کسیکہ خدمت امت مرام اوست

مرگش نہ مرگ یک تن وبل مرگ امتے است

(جس کی زندگی کا نصب العین قوم کی خدمت رہا ہے اس کی موت کسی ایک فرد کی موت نہیں بلکہ پوری قوم کی موت ہے)

خلیفہ عبد الحکیم نے خدمت اسلام اور ایران و پاکستان کے ثقافتی روابط کی توسیع کے سلسلے میں پوری عمر بسر کی ہے۔ لہٰذا موصوف کی رحلت سے ہمارے ثقافتی روابط اور عالم اسلام میں رخنہ پڑ گیا ہے میں ایران و پاکستان میں دو بار موصوف کی زیارت سے مشرف ہوا ہوں آپ کا شمار ان حکمائے اسلام میں ہوتا ہے جن کی اسلام کے حقائق و معارف پر گہری نظر تھی اور آپ پر حقیقت بخوبی روشن تھی کہ اسلام وہ دین ہے جس کی اعلیٰ تعلیمات درس حیات دیتی ہیں۔ رشد و ہدایت کا سرچشمہ اور انسان کی صلاح و فلاح کا وسیلہ بھی یہی تعلیمات ہیں اور ان کے کمال میں کوئی کلام نہیں۔

حقیقت میں خلیفہ عبد الحکیم حکیم تھے اور ہمیشہ ان کے آثار و افکار سے حکمت کی روح ٹپکتی تھی۔ مرحوم کی نمایاں خصوصیت بردباری تھی اور اسی کا نتیجہ تھا کہ موصوف کو دیگر اقوام کے افکار و خیالات سے بھی اچھی خاصی واقفیت تھی۔ آپ پر یہ حقیقت روز روشن کی طرح آشکارا ہو چکی تھی کہ حقیقت ایک ہے البتہ ظاہر میں اس کی شکلیں اور ہیئتیں مختلف ہیں۔ اختلافات و نزاعات جو مختلف اقوام میں پائے جاتے ہیں۔ فروغ میں ہیں اصول میں نہیں۔ مسجد ہو یا بت خانہ ہر مقام جلوہ گاہ کبریا اور مرکز عشق ہے۔ موصوف کی یہی بلند خصلت تھی جس نے انہیں تمام اقوام کے ساتھ رواداری اور ملاطفت پر آمادہ کیا تھا۔ آپ ان کے عقائد اور ان کی تعلیمات کے بارے میں نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ ذوق سماعت کا ثبوت دیتے۔ ہر شے پر اس کی تہ میں ڈوب کر نظر ڈالتے۔ موصوف کی نظر ظاہر سے زیادہ باطن، پوست سے زیادہ مغز اور ریت سے زیادہ دانے پر ہوتی تھی۔ آپ کی چشم امتیاز سے کوئی شے چھپی ہوئی نہ تھی۔

مرحوم خلیفہ عبد الحکیم کی یہ کوشش رہی ہے کہ اپنے ادارہ تصنیف و تالیف (ادارہ ثقافت اسلامیہ) کی سرپرستی میں ایسی جدید تالیفات منظر عام پر لائیں جو ملت اسلامیہ کی عزت و ناموس کے دامن پر دشمنان اسلام کے توہمات کی گرد جمنے نہ دیں اور اسلام کے احکام و قوانین ٹھیک اسی انداز اور اسی نہج پر دنیا کے سامنے پیش کریں جو عہد نبوت میں خود رسول کریم ﷺ کا معمول رہا ہے۔ یقیناً ایسی عظیم الشان شخصیت کی رحلت باعث صد افسوس و ملال ہے:

لاجرم در مرگ اہل معرفت

گفت باید "اے دریغا عالمے"

کسی حق شناس کی موت پر بجز اس کے اور کوئی چارہ نہیں کہ ہم یہ کہیں آہ! عالم کی موت عالم کی موت ہے۔

صدر جلسہ کی تقریر کے بعد ایران کے مشہور مفکر استاد ڈاکٹر شفق نے جو بین الملی کانفرنسوں میں مرحوم خلیفہ صاحب کے رفیق رہے ہیں تقریر کی اور خلیفہ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ چار سال سے زیادہ عرصہ گزرا کہ بیروت میں اسلامی و مسیحی انجمن کا اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس اجلاس کے شرکاء میں سے میں نے ایک بزرگ شخصیت کے نام و مقام کے بارے میں بہت کچھ سنا تھا جب مجھے اس کی زیارت کا شرف حاصل ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ شخصیت فضل و دانش کا پیکر اور شجر علمی کا مل ہے۔ میں نے چاہا کہ زبان حال سے یہ کہوں:

می شنیدم کہ جان جانانی

بینم اکنوں ہزار چندانی

(ترجمہ: میں سنا کرتا تھا کہ تو جان جاناں ہے لیکن اب جو میں تجھے دیکھتا ہوں تو ہزار گنا زیادہ پاتا ہوں) موصوف کی طاقت لسانی اور وسعت علم و آگاہی نے اس مختصر سی مدت میں نہ صرف مجھے بلکہ ایک جماعت کو پاکستان کے اس نامور مفکر خلیفہ عبد الحکیم کی عظیم الشان شخصیت کا قائل کر دیا تھا۔ رنج و ملال کی انتہا ہے کہ آج موصوف کی وفات حسرت آیات کی خبر وحشت اثر نے ان کے تمام مخلص دوستوں کو غم و اندوہ سے دوچار کر دیا ہے۔

10

خلیفہ عبدالحکیم ایران میں

ڈاکٹر عبدالحمید عرفانی

اقبال اور رومی میں دلچسپی لینے والے کم و بیش خلیفہ صاحب کے نام سے آشنا ہیں اور راقم کو بھی خلیفہ مرحوم سے دور کی آشنائی تھی۔ اپرل 1952ء میں خلیفہ صاحب یورپ سے آتے ہوئے تہران میں اترے۔ ان دنوں راجہ غضنفر علی خاں ایران میں پاکستان کے سفیر تھے اور خلیفہ صاحب کی غالباً ان سے دیرینہ ملاقات تھی۔ راجہ صاحب نے مجھے بلا کر کہا کہ پاکستان کے ایک بہت بڑی فیلسوف اور عالم تہران آئے ہیں اور چونکہ میرے ہاں ان کے لیے رہائش کی مناسب جگہ نہیں اس لئے آپ انہیں اپنے پاس ٹھہرالیں۔ معزز مہمان کے نام سے تو آشنائی تھی مگر ان کی عادات، طبیعت، اخلاق اور دیگر شخصی خصوصیات کے متعلق کسی قسم کا علم نہ تھا۔ میں خلیفہ صاحب کو اپنے ہاں لے آیا لیکن ان کی ظاہری شخصیت اور باطنی عظمت سے یقیناً مرعوب تھا اور مجھے اپنے اور اپنے وسائل پر پورا یقین تھا کہ میں ان کی خاطر خواہ

11

خلیفہ عبدالحکیم کی یاد میں

مولانا محمد حنیف ندوی

''مجلس یادگارِ خلیفہ عبدالحکیم'' کی طرف سے ۳۰۔ جنوری ۱۹۸۳ء کو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی یاد میں ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ میں ایک تقریب منعقد ہوئی۔ اس موقع پر مولانا محمد حنیف ندوی نے ایک مضمون پڑھا جو یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۹۵۱ء کی ایک سہ پہر کو خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی، بہت تپاک سے پیش آئے، مجھ سے پوچھنے لگے کہ اسلام میں اجتہاد کو کیا اہمیت حاصل ہے اور خود ہی اس مسئلے پر اظہارِ خیال کرنے لگے۔ اُن کی گفتگو کا آغاز کچھ یوں تھا جیسے علم وادب کا دریا اُمڈ آرہا ہے۔ مسلسل اور پُرجوش۔ جو بات کہتے اس میں فکر کی گہرائی، عقیدے کی استواری اور

معلومات کی فراوانی صاف جھلکتی ہوئی نظر آئی۔ اثنائے گفتگو میں اشعار، لطائف اور چٹکلے برابر اپنی بہار دکھاتے رہے۔ خلیفہ صاحب سے متعلق میرا اولین تاثر یہ تھا کہ یہ شخص بلا کا ذہین اور دانش ور ہونے کے ساتھ ذوقِ سلیم سے بھی بہرہ ور ہے اور اسلام کے لیے اپنے دل میں بے پناہ درد اور کسک بھی رکھتا ہے۔ خلیفہ صاحب کی پوری تقریر تو اس وقت مستحضر نہیں البتہ کچھ جملے اب تک کانوں میں گونج رہے ہیں۔

ان کا کہنا تھا کہ اسلام اور دوسرے مذاہب میں امتیازی فرق یہ ہے کہ اس کی تعلیمات صرف ان تصریحات ونصوص ہی پر حاوی نہیں جو وحی وتنزیل کا کرشمہ ہیں بلکہ اس میں انسانی فہم واستدلال کو بھی درخورِ اعتنا سمجھا جاتا ہے جو قرآن وسنت کی روشنی میں ترتیب پائے۔ اسلام کا تعلق جس طرح ہمارے تابناک ماضی سے ہے، اسی طرح اس کا تعلق حال و مستقبل کی درخشانیوں سے بھی ہے۔ یعنی اسلام میں اجتہاد کے ذریعے اس بات کی گنجائش رکھی گئی ہے کہ تاریخ کی کروٹوں سے مختلف احوال نہ ظروف میں جو نئے نئے مسائل اُبھریں اُن کا حل تلاش کیا جائے۔

اجتہاد کی نیچر کے بارے میں ان کا کہنا تھا کہ اس کو نسبتاً آزاد اور تخلیقی ہونا چاہیے، کیوں کہ الفاظ وحروف کی مختلف النوع دلالتوں پر مبنی اجتہاد مسائل کو پوری طرح حل کرنے میں قاصر رہتا ہے۔ مجھے یاد ہے اُنھوں نے ذرا زور دے کر کہا تھا کہ فقہا کے روایتی اجتہاد سے ہٹ کر ہمیں حضرت عمر فاروقؓ کے طریقِ استنباط کی پیروی کرنا چاہیے اور الفاظ وحروف سے زیادہ اس حقیقت کا سراغ لگانا چاہیے کہ زیرِ تحقیق مسئلے میں اسلام کی اصل روح کیا ہے اور اس کے کیا تقاضے ہیں۔ تیس چالیس منٹ کی اس تقریر کے دوران مَیں صرف اُن کا منہ تکتا رہا۔ میرے لیے اُن کی باتیں نئی بھی تھیں اور کہیں کہیں اختلاف کا موجب بھی۔ مجھے اس شے نے ورطۂ حیرت میں ڈال رکھا تھا کہ سوٹ بوٹ میں ملبوس یہ شخص اسلامیات پر کس درجہ گہری نظر رکھتا ہے۔ مَیں اُن کی تقریر سے کس درجہ متاثر ہوا، اس کے جواب میں اس سے زیادہ کیا کہوں کہ میری پہلی کتاب ''مسئلہ اجتہاد'' اسی تقریر کا نتیجہ تھی۔ جس میں اپنی صواب دید کے مطابق میں نے قدرے وسیع تر تناظر میں اس موضوع سے متعلق تحلیل وتجزیہ سے کام لیا اور یہ کہ اس مسئلہ کی فقہی وتہذیبی اہمیت اس تقریر کے بعد ہی اُبھر کر میرے سامنے آئی اور میں مجبور ہو گیا کہ سب سے پہلے اسی موضوع کو اپنے غور وفکر کا محور ٹھہراؤں۔

اس ملاقات کے دوسرے دن میں نے فیصلہ کر لیا کہ مجھے اگر کوئی علمی کام کرنا ہے تو خلیفہ صاحب کے حلقہ فکر و دانش میں بلا محابا شریک ہو جانا چاہیے۔ خلیفہ صاحب نے مجھے باقاعدہ دعوت شرکت دی اور میں مان گیا، اور آج تک بحمد اللہ اس حلقے میں رہ کر اپنی بساط کے مطابق علم و فکر کی خدمت میں مصروف ہوں۔

یوں تو خلیفہ صاحب کی پہچان کے کئی پہلو ہیں، لیکن نمایاں اور اُبھرے ہوئے خدوخال یہ تین ہیں:

۱۔ مطالعہ کی ہمہ گیری

۲۔ مجلس آرائی اور مکالمہ طرازی

۳۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی

کتابوں سے اُنھیں عشق کی حد تک لگاؤ تھا، لیکن اس عشق میں فرزانگی کا یہ پہلو نمایاں تھا کہ یہ صرف انہی کتابوں کو منہ لگاتے جو چیدہ اور مستند ہوں۔ مطالعہ کے لیے وقت کی کوئی قید نہ تھی، جب بھی فارغ ہوتے کتاب کی ورق گردانی شروع کر دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ علم ایسی غذا ہے جس کے کھانے سے سیر ہونے کے بجائے بھوک اور بڑھتی ہے، اس لیے پیٹ بھر پڑھنا چاہیے اور خوب پڑھنا چاہیے۔ پڑھنے کی لت اور خواہش و طلب کے داعیے ان کے نزدیک اس درجہ عزیز تھے کہ اکثر اوقات یہ بڑی اہم تقریبات میں اس لیے شریک نہ ہو پاتے کہ اس سے ان کے ذوقِ مطالعہ میں حرج واقع ہوتا ہے۔

انور اقبال قریشی نے لکھا ہے کہ ''خلیفہ صاحب کے ذوقِ مطالعہ نے مجھے حیران کر دیا۔ وسعتِ مطالعہ کے ساتھ اُن کی رفتارِ مطالعہ بھی حیران کُن تھی۔ مجھے ذاتی طور پر اُن کی رفتارِ مطالعہ کا علم اس سے ہوا کہ ایک دن ایک نشست میں جو روزانہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لان میں التزام سے منعقد ہوتی تھی، تشبیہات کا ذکر چھڑا، مَیں نے کہا، تشبیہ بھی ایک طرح کا اندازِ استدلال ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے بعض عسیر الفہم مسائل کو سمجھانے کے لیے سادہ اور دل نشین تشبیہات سے کام لیا ہے اور حضرت مسیح کی دعوت و ارشاد کا تو یہ مخصوص اور جانا بوجھا اسلوب تھا کہ تشبیہات بسا اوقات منطقی استدلال سے کہیں زیادہ مؤثر اور کارگر ثابت ہوتی ہیں۔ خلیفہ صاحب نے اس مصرع طرح پر یہ گرہ لگائی کہ تصوف و دین کے رموز و اسرار کو بہترین تشبیہات کے بل پر جس خوبی و عمدگی سے رومی نے آشکار کیا ہے اس کی مثال اور

لیے جھیلنا دشوار ہو جاتا، اور اگر کسی مغربی سکالر کو تقریر پر مجبور کر ان کو وہاں لے آتی تو دیکھیے
کس کس انداز سے خلیفہ صاحب اس پر حملہ آور ہوتے۔ مغرب کا فلسفہ، کلیسا، مجلس، تاریخ اور
اہل مغرب کا موجودہ انداز حیات، ہر چیز ان کی شدید تنقید کا ہدف بنتی۔ اس وقت خلیفہ
صاحب اسلام کے ایک پُرجوش مبلغ کی حیثیت سے دفاع کا فریضہ نہایت خوش اسلوبی سے
انجام دیتے۔ شکل و صورت اور وضع قطع اور اس کے اندر پنہاں روح و باطن کا یہ تضاد اجنبی
کے لیے اچھے خاصے اچنبھے کا باعث ہوتا کہ کوٹ پتلون میں ملبوس یہ شخص کس درجہ اسلام کی
محبت میں سرشار ہے۔

خلیفہ صاحب کی مجلس آرائی اور سخن طرازی کا یہ ڈھب ایسا پیارا اور جاذبِ توجہ ہوتا
کہ خود خلیفہ صاحب پر خود فراموشی کا عالم طاری ہو جاتا۔ ایک مرتبہ ایک نہایت ہی معزز اور
پڑھے لکھے امریکی کو ادارہ ثقافت اسلامیہ میں آنا تھا۔ خلیفہ صاحب نے ملازمین کو آدابِ
مہمان نوازی بتاتے ہوئے کہہ رکھا تھا کہ پہلے ٹھنڈے اور میٹھے مشروب سے اُن کی تواضع کی
جائے گی اور اس کے بعد گرم گرم چائے کا دور چلے گا۔ لیکن ہوا یہ کہ خلیفہ صاحب نے حسبِ
معمول جب گفتگو کا آغاز کیا اور اس سلسلے کو طولِ شبِ فراق کی شکل میں ڈھالا تو اس کا منطقی
نتیجہ تو یہ نکلا کہ ٹھنڈا مشروب تو گرم ہو گیا اور گرم گرم چائے ٹھنڈی اور یخ بستہ آہیں بھرنے
لگی۔

اقلیمِ لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کے خلیفہ صاحب بلاشرکتِ غیرے واحد فرماں روا
تھے۔ انگریز مفکر و فلسفی لاک کی طرح ان کی یہ رائے تھی کہ لطائف اور لوک کہانیوں میں بھی
حکمت و دانش کے ایسے ایسے جوہر یک دانہ پائے جاتے ہیں جو بسا اوقات ٹھوس علمی کتابوں
پر بھاری ثابت ہوتے ہیں۔

ان کی لطیفہ گوئی کی ایک دلچسپ جھلک دیکھیے اور داد دیجیے۔ ایک مرتبہ ایک مغربی
خاتون اپنے مقالے کی ترتیب کے سلسلے میں خلیفہ صاحب کے ہاں ادارے میں آئیں۔ آپ
نے بہ کمالِ شفقت اس کی رہنمائی فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں سے اس کے معمولی مقالے کو
چار چاند لگا دیے۔ وہ بہت ممنون ہوئیں۔ چلتے چلتے کہنے لگیں، خلیفہ صاحب اور تو اور آپ کا
یہ ادارہ بہت خوبصورت ہے، اس کے وسیع لان، مہکتے ہوئے سبزہ زار اور پھول دیکھ کر یوں
محسوس ہوتا ہے جیسے یہ جنتِ ارضی ہو۔ خلیفہ صاحب اس کی اس تحسین پر مسکرائے اور کہا، اس

کہیں نہیں ملتی۔ اس پر میں نے کہا، کیوں نہ ''تشبیہات رومی'' کے نام سے ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ خلیفہ صاحب کو یہ تجویز پسند آئی اور چند ہی روز بعد دیکھتا ہوں کہ خلیفہ صاحب نے پوری مثنوی معنوی کو اس غرض سے کھنگال ڈالا ہے کہ اس میں مندرج حسین تشبیہات کو ایک لڑی میں سلیقے سے پرو دیا جائے۔

خلیفہ صاحب کے مطالعہ میں تنوع، وسعت اور بوقلمونی اس بنا پر اُبھر آئی کہ ان کو انگریزی، جرمن، فرنچ، فارسی اور ادب اُردو میں یکساں دسترس حاصل تھی۔ مزید برآں فلسفہ، تصوف اور اسلامیات کی بہترین کتابیں اُن کو زیرِ مطالعہ رہتیں۔ شبلی ان کا چہیتا ممدوح تھا۔ حالی کی سوانح نگاری اور بابائے اُردو مولوی عبدالحق کے تحقیقی مقالات ان کو دل پسند تھے، فلسفہ وتصوف میں افلاطون سے لے کر کانٹ تک اور تصوف میں بایزید اور ابوالہاشم سے لے کر ابنِ عربی تک ہر بڑے مفکر کے شاہ کار اُن کے نہاںخانۂ دل میں محفوظ تھے۔ ان کے مطالعے کے دائرے کتنے وسیع اور پھیلے ہوئے تھے، اس کا اندازہ ان کی تصنیفات سے کم اور گفتگو سے زیادہ ہوتا تھا۔ جن لوگوں کو اُن کی ہم نشینی کا موقع ملا ہے، وہ خوب جانتے ہیں کہ بات مذہب و دین کی ہو یا فلسفہ و ادب کی، جب بھی انھوں نے کسی مسئلے پر لب کشائی کی حکمت و معرفت کے رنگا رنگ دلبستان سجا دیے۔ مجلس آرائی کا رکھ رکھاؤ اور ٹھاٹھ جو ہم نے اُن کے ہاں دیکھا وہ اور کہیں نظر نہ آیا۔ مکالمہ طرازی میں اُن کا خاص اور اپنا رنگ تھا۔ ہم روزانہ حلقہ بنا کر گیارہ بجے کے قریب کرسیاں ڈال کر ادارے کے صحن میں بیٹھ جاتے، خلیفہ صاحب ہلکے پھلکے لطیفوں کے تبادلے کے بعد چہکنا شروع کرتے اور ہم محسوس کرتے کہ ہم ان کے ساتھ ساتھ فکر و ذوق کی مختلف وادیوں میں گشت کر رہے ہیں۔ کبھی شبہ ہوتا کہ شاید ہم افلاطون کی اکاڈمی میں بیٹھے ہیں، کبھی احساس ہوتا کہ مسندِ درس پر قشیری اور ابنِ عربی تشریف فرما ہیں اور تصوف کے مقالات و احوال کی تشریح کر رہے ہیں اور کبھی کبھی ایسا لگتا کہ لکھنؤ اور دہلی کی قدیم ادبی محفلیں کانوں میں حلاوت ٹپکا رہی ہیں اور تذکیر و تانیث اور بدیع و بیان کے وہی چرچے دوبارہ بپا ہیں، جو کبھی ان محفلوں کی زینت تھے، یعنی اس ایک مجلس نے گویا زمان و مکان کے فاصلوں کو پھلانگ کر ماضی و حال کی علمی و ادبی یادوں کو ازسرِ نو تازہ کر دیا ہے۔

اس نشست میں شومئی قسمت سے اگر کوئی خشک اور جامد قسم کا مولوی آ نکلتا تو خلیفہ صاحب کی حسِ طنز و مزاح پھڑک اُٹھتی اور اس کو اس طرح آڑے ہاتھوں لیتے کہ اس کے

کے جنت ہونے میں کیا شبہ ہے، گر صرف اس بات کی ہے کہ اس میں آپ جیسی کوئی حور جلوہ کناں نہیں۔

دوسرا لطیفہ سنیے۔ ایک دفعہ لندن میں کھانے پر مرزا بشیر الدین محمود اور خلیفہ صاحب میں مسئلہ ختم نبوت پر بحث چھڑ گئی، مرزا صاحب نے کہا کیا آپ بھی ہایں روشن خیالی اس بات کے قائل ہیں کہ موجودہ دور وحی و تنزیل کی ارزانیوں سے یکسر محروم رہے گا۔ خلیفہ صاحب نے فوراً جواب دیا، جی تو میرا بھی چاہتا ہے کہ کوئی اللہ کا فرستادہ آئے، لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے کردار و عمل اور پیغام و دعوت سے منصب نبوت کو اتنی بلندیوں تک اُچھال دیا ہے کہ اب چھوٹے قد کا کوئی مدعی نبوت آنکھوں میں جچتا ہی نہیں۔

لطیفہ گوئی اور طنز و مزاح میں خلیفہ صاحب پروفیسر وحید الدین سلیم سے بہت متاثر تھے۔ جن لوگوں نے ان دونوں حضرات کو حیدر آباد کی علمی و ادبی صحبتوں میں یک جا دیکھا ہے، اُن کا کہنا ہے کہ جب یہ لطیفہ گوئی اور طنز و مزاح کے پھول بکھیرنا شروع کرتے تو پوری محفل دیوارِ قہقہہ بن جاتی۔

خلیفہ صاحب کی شخصیت اتنی جاذب، پیاری اور علوم و معارف سے آراستہ پیراستہ تھی کہ جو شخص ایک مرتبہ ان کو دیکھ لیتا، ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ ڈاکٹر شناخت کا کہنا ہے ''میں خلیفہ صاحب سے صرف ایک مرتبہ ملا، میرے دل میں اُن کی یاد اور قدر و منزلت ہمیشہ رہے گی۔''

شیخ علی کاشف الغطا لکھتے ہیں۔ ''خلیفہ صاحب کی شخصیت سے حیات و توانائی کے شعلے بھڑکتے تھے، انھیں ادب و کمال کا ایک پیکر کہہ سکتے ہیں، ان کی حکمت کے نور سے زندگی کی راہیں چمک اُٹھتی ہیں۔''

خلیفہ صاحب نے نہ صرف مشرق و مغرب کے فکری سوتوں سے ذہن کی حد تک استفادہ کیا بلکہ ان کے امتزاج سے خیالات و افکار اور عمل و کردار کے ایسے حسین سانچے کی صورت اختیار کی جس میں مغرب کی جدت طرازیوں کے پہلو بہ پہلو اعتدال و توازن اور اسلامیات کی جھلک صاف نمایاں ہے۔

کائنات، انسان، مادہ اور مذاہب عالم کے بارے میں ان کے اپنے نظریات

تھے۔ اس عالمِ رنگ و بو کو وہ ساکن و راکد نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ ہر آن یہ انقلاب و تغیر کے اٹل قانون کے تابع ہے۔ وہ ہیراکلیٹس کے اس مقولے کے پُرزور حامی تھے کہ ''کوئی بھی شخص ایک ہی ندی میں دوبارہ نہیں اُتر سکتا۔'' کائنات کی مکینیکل توجیہ کے برعکس وہ یہ راسخ عقیدہ رکھتے تھے کہ برگساں کا نظریہ جوشِ حیات کی مکمل تشریح حی و قیوم خدا کو مانے بغیر نہیں ہو سکتی۔

وہ حضرتِ انسان کو روح و جسم کے دو خانوں میں تقسیم پذیر نہیں مانتے تھے، بلکہ تصوریت و تصوف کے حامیوں کی طرح جسم و قالب اور روح و ذہن کو خدائے لم یزل کی ایک ہی تجلی کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ مادے کو متحرک اور اتساع پذیر ماننے کے باوجود اس لائق نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کائنات میں نظم و ترتیب اور غایت و مقصد کی آفرینش کا باعث ہو سکے۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ رب کائنات کی ربوبیت کا کرشمہ ہے کہ اس عالم تغیر و ارتقا کو ایک خاص ڈگر پر چلا رکھا ہے۔ مذاہب عالم کے بارے میں ان کا نظریہ یہ تھا کہ ان سب میں حق و صداقت کے بنیادی عناصر کا پتہ چلتا ہے، لیکن مکمل اور واضح صداقت کا حامل صرف اسلام ہے۔

خلیفہ صاحب اپنی حکیمانہ کاوشوں اور منفرد اسلوب اظہار کی وجہ سے فکر و دانش کے حلقوں میں زندہ رہیں گے، لیکن تاریخ کے صفحات میں ان کو دوام اس وجہ سے حاصل ہوگا کہ اُنھوں نے ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کی بروقت تاسیس کی اور اس میں ایسے لوگوں کے لیے خدمت کے مواقع مہیا کیے جو اپنے قلم اور نگارشات سے اسلاف کے کارناموں کو اُجاگر کرنے کا سلیقہ رکھتے ہیں اور اس حقیقت سے خوب آگاہ ہیں کہ قدیم و جدید علوم و معارف سے ربط پیدا کیے بغیر ہم صحت مند ذہنوں کی پرورش نہیں کر سکتے۔

خدا کا شکر ہے کہ ان کا قائم کردہ ادارہ اپنے محدود وسائل کے باوجود ملت کی عظیم خدمت انجام دے رہا ہے۔ آپ کو یہ جان کر مسرت ہوگی کہ اب تک اُردو اور انگریزی میں ڈیڑھ صد سے زیادہ کتابیں طبع ہو کر قارئین کے فکری تغذیہ کا سامان فراہم کر رہی ہیں، جن میں قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، تاریخِ اسلامی ایسے اہم مضامین شامل ہیں۔ دُعا ہے کہ خلیفہ صاحب مرحوم کی یہ یادگار اور پھلے پھولے اور پروان چڑھے۔

12

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

پروفیسر ایم ایم شریف

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم سے میری ملاقات ایک نہایت عجیب واقعہ سے شروع ہوتی ہے۔ میں اپنے دیہاتی سکول سے آٹھویں جماعت پاس کر کے اسلامیہ ہائی سکول، شیرانوالہ گیٹ، لاہور کی جونیئر کلاس میں صرف انگریزی پڑھنے کے لیے داخل ہوا۔ خلیفہ حکیم اس وقت اسلامیہ سکول کی ساتویں جماعت میں پڑھتے تھے۔ میری ان سے مطلقاً واقفیت نہ تھی۔ اسلامیہ ہائی سکول میں جمعہ کے روز پڑھائی شروع ہونے سے پہلے سکول کے مولوی صاحب وعظ کہا کرتے تھے اور اسے سننے کے لیے سکول کی تمام جماعتیں صحن میں جمع ہوتی تھیں۔ ایک روز اسی وعظ کے دوران میں ایک طالب علم نے جو میرے سامنے بیٹھا ہوا تھا پیچھے کی طرف مڑ کے دیکھا اور غصے کے عالم میں میری طرف دیکھ کر مجھے گالی دی۔ میں ایک دیہاتی لڑکا تھا اور مجھے گالیاں نہ آتی تھیں۔ میں نے گالی کے جواب میں انہیں ایک گھونسہ رسید کیا۔ میرے

آیا تو خلیفہ بھی ایم اے کا امتحان درجہ اول میں پہلے نمبر پر پاس کر چکے تھے۔ 1917ء میں میں علی گڑھ یونیورسٹی میں بحیثیت سینئر پروفیسر ملازم ہو گیا اور خلیفہ مرحوم عثمانیہ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔

دو تین سال کے بعد وہ عثمانیہ یونیورسٹی سے سکالر شپ لے کر جرمنی چلے گئے اور وہاں تین سال کے بعد پی ایچ ڈی لے کر غالباً 1924ء میں واپس آئے اور عثمانیہ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر ہو گئے۔ اس کے بعد ہم دونوں کی زندگی متوازی چلتی رہی۔ جب بھی وہ علی گڑھ آتے، مجھ سے ملے بغیر واپس نہ جاتے۔ میں بھی جب کبھی حیدر آباد جاتا ان سے اور ان کے بیوی بچوں سے ضرور ملتا۔ چونکہ عثمانیہ یونیورسٹی میں تعلیم بذریعہ اردو ہوتی تھی اس لئے خلیفہ مرحوم کو لیکچر اردو میں دینے پڑتے تھے۔ اسی سلسلہ میں یونیورسٹی میں ان سے بہت سی کتابیں اردو میں ترجمہ بھی کروائی گئیں۔

خلیفہ حکیم کو طالب علمی کے زمانے ہی سے ادب میں کافی شغف تھا۔ وہ اردو اور انگریزی دونوں نہایت روانی سے لکھتے تھے اور دونوں زبانوں میں ان کی تحریر نہایت شگفتہ ہوتی تھی۔ خلیفہ اقبال کے انداز میں شعر بھی کہتے تھے اور نہایت عمدہ شعر کہتے تھے۔ ایک نظم ان کی امیر خسرو کے رنگ میں چرخے پر بھی تھی۔ وہ ایسی مقبول ہوئی کہ ان کے احباب اکثر ان سے اس کے سنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔ دوستوں کی صحبت میں اُن کی گفتگو اکثر نہایت دلچسپ ہوتی تھی۔ ان کی طبیعت نہایت باغ و بہار تھی اور جو شخص ان سے ایک دفعہ مل لیتا وہ ان کی لچھے دار مگر فلسفیانہ گفتگو کو کبھی نہ بھولتا۔

یوں تو ہم میں سے ہر شخص کشمیر کو جنت نظیر سمجھ کر وہاں جانے کو ایک نعمت سمجھتا تھا لیکن خلیفہ حکیم مرحوم کو کشمیری ہونے اور پھر اس پہ شاعر ہونے کی وجہ سے کشمیر سے خاص محبت تھی۔ چنانچہ دو ایک سال کے لیے وہ حیدر آباد کی نوکری چھوڑ کر کشمیر میں ڈائریکٹر آف ایجوکیشن کے عہدے پر بھی فائز رہے۔ وہاں انہوں نے ڈل لیک کے کنارے ایک خوبصورت مکان بھی اس خیال سے بنوایا کہ ملازمت کے اختتام پر وہ وہیں رہائش اختیار کریں گے، لیکن خدا کو یہ منظور نہ تھا۔

جب سر محمد اقبال شروع شروع میں پالیٹکس میں آئے تو اس زمانے میں خلیفہ بھی حیدر آباد سے چھٹی لے کر کچھ عرصہ کے لیے اس خیال سے لاہور چلے آئے کہ پالیٹکس میں

خیال میں اس گالی کی وجہ یہ تھی کہ کہیں بے خبری میں میری کتابیں اسے چھو گئی تھیں اور وہ آگے نہ بڑھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس لڑکے کا نام عبدالحکیم ہے۔ اس کے بعد اکثر اسکول کے اوقات میں ہماری مڈھ بھیڑ ہوتی تھی اور گو ہم دونوں کے سکول کے دوست مشترک تھے ہماری بات چیت نہ ہوتی تھی۔ اسی طرح ایک سال گزر گیا۔ بعد میں، نامعلوم کس طرح ہم دونوں ایک دوسرے سے بولنے لگے۔

سینئر کلاس پاس کر کے میں ماڈل سکول میں چلا گیا۔ میں نے اس سکول سے اور عبدالحکیم نے شیرانوالہ سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد وہ فورمن کرسچین کالج میں چلے گئے اور میں دو چار ماہ گورنمنٹ کالج میں رہنے کے بعد ایم اے او کالج علی گڑھ میں داخل ہو گیا۔ خلیفہ حکیم نے عزیز و اقربا کے کہنے سننے پر سائنس کا کورس لیا اور یہی بات میں نے کی۔ مگر میں نے دو تین ہی ماہ میں یہ کورس چھوڑ دیا۔ مگر خلیفہ کا یہی کورس جاری رہا۔ انہیں سائنس کی طرف کوئی رغبت نہ تھی، چنانچہ ان کا یہ سال ضائع ہوا اور اس طرح میں ان سے ایک سال آگے ہو گیا۔ اس کے بعد انہوں نے بھی علی گڑھ پہنچ کر فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ جب تو ہم دو بچھڑے ہوئے دوستوں کی طرح ملے اور اکثر ملتے رہے۔ ایف اے پاس کرنے کے بعد میں تو وہیں رہا مگر خلیفہ سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں چلے گئے۔ ہم دونوں نے بی اے میں فلسفہ بطور اختیاری مضمون لیا۔

خلیفہ مرحوم پروفیسر سین کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ مجھ پر بھی میرے پروفیسر اختر لونی نظر عنایت رکھتے تھے۔ میں نے بی اے الہ آباد یونیورسٹی سے 1914ء میں پاس کیا اور ایم اے میں داخل ہونے کا ارادہ کیا۔ اس وقت پنجاب میں فلسفہ میں ایم اے کی تعلیم صرف سینٹ اسٹیفن کالج دہلی میں ہوتی تھی۔ میں نے الہ آباد کے مقابلے میں سینٹ اسٹیفن کالج میں داخلہ کو ترجیح دی اور پنجاب یونیورسٹی سے اجازت لے لی کہ میں ایم اے کا امتحان ایک سال میں دے لوں اس لئے میرا داخلہ ایم اے کی دوسری کلاس میں ہوا۔ خلیفہ نے وہیں بی اے پاس کر کے ایم اے کے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ میں چند ایک ماہ سینٹ اسٹیفن کالج میں رہنے کے بعد کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ کے لیے انگلستان چلا گیا اور خلیفہ وہیں رہے۔

میرا کیمبرج کا کورس دو سال کا تھا۔ جب 1917ء میں میں وہاں سے فارغ ہو کر

حصہ لیں لیکن چند ماہ کے بعد انہیں معلوم ہو گیا کہ پنجاب کی پالیٹکس بہت کثیف تھی۔ چنانچہ اقبال کے ان دوستوں نے جو انہیں پالیٹکس میں گھسیٹ لائے تھے عین وقت پر انہیں دھوکہ دیا اور تمام وزارتیں خود سنبھال بیٹھے۔ چنانچہ خلیفہ حیدر آباد واپس چلے گئے اور ڈین آف ریسرچ مقرر ہوئے۔ مجھے بھی علی گڑھ یونیورسٹی میں پرو وائس چانسلر ہونے کے مواقع ملتے رہے۔

ملک کی تقسیم کے بعد ہم دونوں پاکستان چلے آئے۔ خلیفہ مرحوم نے مسٹر غلام محمد کی مدد سے جو اس وقت پاکستان کے وزیر خزانہ تھے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنا ڈالی اور اس کے مینجنگ اور اکیڈیمک ڈائریکٹر بنے۔

میں ایک سال تک پنجاب یونیورسٹی کمیشن کے سیکرٹری کی حیثیت سے کام کر کے اسلامیہ کالج لاہور کا پرنسپل ہو گیا۔ اس دوران میں نے گورنمنٹ کی مدد سے پاکستان فلاسفیکل کانگریس کی بنا ڈالی۔ کانگریس کے پہلے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے میں نے خلیفہ حکیم کا نام تجویز کیا اور انہوں نے ایک نہایت اعلیٰ خطبہ صدارت پڑھا۔ اس کے ایک سال بعد کانگریس کے کارکنوں نے یہی عزت مجھے بخشی۔

ہندوستان کی فلاسفیکل کانگریس کے ہم دونوں ممبر تھے اور خلیفہ اس کانگریس کے مابعد الطبعیات کے سیکشن اور سکائیکالوجی کے سیکشن کے صدر بنے۔ میں بھی مابعد الطبیعات کا صدر بننے کے بعد 1945ء میں ساری انڈین فلاسفیکل کانگریس کا صدر چنا گیا۔

ملک کے باہر بھی لوگ ہم دونوں کو جانتے تھے۔ چنانچہ ہم دونوں کو اکثر دعوتیں اکٹھی ملا کرتی تھیں۔ ہم دونوں اکٹھے سیلون گئے۔ راستے میں میں بیمار ہو گیا اور خلیفہ مرحوم نے میری تیمارداری کی۔ اس کے بعد ہم دونوں اکٹھے آسٹریلیا بھی گئے۔

خلیفہ مرحوم نے اپنے آپ کو ادارہ ثقافت اسلامیہ کے لیے واقف کر دیا تھا۔ وہ اپنے ادارہ کے لیے روپیہ حاصل کرنے کے لیے سیکرٹری فنانس کو ملنے گئے تھے اور وہیں ان کے دفتر میں خلیفہ کے دل نے جواب دے دیا اور وہ ہم سب کو داغ مفارقت دے گئے۔ خدا انہیں جنت الفردوس میں جگہ دے۔ آمین! اب دوستوں نے ان کا شروع کیا ہوا کام مجھے سونپا ہے۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ مجھے اسے جاری رکھنے کی توفیق دے۔

13

مرد درویش

پروفیسر شیخ محمود احمد

میرے ذہن میں ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم کا نمایاں ترین نقش ان کی درویشی ہے۔ 1949ء کا ذکر ہے وہ ہندوستان سے ہجرت کر کے لاہور آئے ہوئے تھے۔ حیدر آباد یونیورسٹی سے ریٹائر ہوئے تھے اور ریاست حیدر آباد کے سقوط کے بعد کوئی پنشن ملنے کی توقع نہ تھی۔ ابھی پاکستان میں بھی نہ کوئی کام کر رہے تھے نہ حسب طبیعت کوئی کام ملنے کی امید تھی۔ پنشن لینے کے بعد اپنے آبائی وطن کشمیر میں سکونت کا ارادہ رکھتے تھے اور اسی خیال سے جنگ کے دوران میں جب سوائے صنعت کار یا تاجر پیشہ کے کوئی اور مکان بنانے کا سوچ بھی نہ سکتا تھا انہوں نے سری نگر میں بڑا پیارا بنگلہ تعمیر کروایا۔ زندگی کی تمام سہولتیں اس میں جمع کیں۔ پچاس کنال کے قریب زمین بنگلہ کے ساتھ لی اور اس میں باغ لگوایا۔ زندگی بھر کی جمع کی ہوئی کتابیں اس میں رکھیں۔ لیکن وہاں بھی حالات اس سرعت سے بدلے کہ آتے

سمندری طوفان میں گھر گئے اور سامان سمیت سب ڈوب گئے۔ سید والا مقام نے کہا الحمد للہ اور درس پہلے کی طرح جاری رکھا۔ دوسرے روز پھر درس فرما رہے تھے کہ وہی کارندہ بھاگا بھاگا آیا اور کہا کہ کل والی اطلاع غلط تھی۔ طوفان تو واقعی شدید تھا لیکن قدرت کا معجزہ ہے کہ کوئی جہاز بھی نہیں ڈوبا۔ حضور جیلانی نے کہا الحمد للہ اور درس پہلے کی طرح جاری رکھا۔ ایک طالب علم جو دونوں روز موجود تھا پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ حضور آپ نے کل جہازوں کے ڈوبنے کی خبر سن کر بھی الحمد للہ کہا اور آج جہازوں کے بچ جانے پر بھی الحمد للہ کہا۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟ حضور نے جواب دیا کہ جب ڈوبنے کی خبر سنی تو میں نے اپنے دل کو ٹٹولا کہ کہیں اس خبر سے اس میں کوئی مایوسی یا رنج یا تکلیف کا جذبہ تو نہیں پیدا ہوا۔ چونکہ ایسی کوئی چیز دل میں موجود نہیں تھی اس لئے میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور کہا الحمد للہ۔ دوسرے روز جب سب جہازوں کے بچ نکلنے کی خبر ملی تو میں نے پھر دل کو ٹٹولا کہ اس میں کہیں فخر و ناز یا کم از کم غیر معمولی مسرت اور اٹھان تو نہیں اور چونکہ یہ جذبہ بھی نہیں تھا اس لئے میں نے دوبارہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا اور الحمد للہ کہا۔

دل حریم او سنت جزبا اومده

چنانچہ اپنی تکلیف کی نہ بات کرتے تھے نہ ان کی نشست و برخاست اور گفت و شنید سے اس کا کوئی اثر ان پر نظر آتا تھا۔ البتہ ملنے والے سے اس کی بات ضرور کرتے تھے۔ میں بھی ابھی ہجرت کے بعد ملازم نہیں ہوا تھا مجھ سے پوچھا تو میں نے کہا کہ یہ روپے کی تنگی نہ ہو تو آدمی ملازمت کا دھندا کبھی نہ کرے۔ کہنے لگے روپیہ ہو تو کیا کرو؟ میں نے کہا فلاں کاروبار کر لوں۔ تفصیلیں پوچھتے رہے۔ کہنے لگے کتنا روپیہ ہو تو یہ کام کر سکو گے؟ میں نے کہا دس ہزار اور پھر کچھ اور بات ہوتی رہی۔ اسی دوران اندر گئے اور میرے ہاتھ میں ایک چیک دے دیا۔ میں نے رقم دیکھی تو دس ہزار روپیہ تھی۔ چک بیرر تھا اور حسب معمول نہ رسید نہ پرچہ۔ میں نے پوچھا بھی تو کہنے لگے اس کی کیا ضرورت ہے۔

مجھ جیسے درس و تدریس سے تعلق رکھنے والوں سے کاروبار کیا ہوتا (خود ہی کہا کرتے تھے جو کچھ جانتے ہیں وہ کچھ کر بھی لیتے ہیں اور جو کچھ نہیں جانتے وہ پڑھا لیتے ہیں)۔ کچھ ہی دنوں میں بارہ سو کا نقصان کر دیا۔ ان سے ذکر کیا تو کہنے لگے کاروبار میں یہ ہوتا ہے اور تمہیں معلوم نہیں ایک کہاوت ہے۔ پہلے سال چٹی، دوسری سال وٹی اور تیرے

ہوئے اپنی کار بھی نہ لا سکے۔

زندگی بھر کا اثاثہ اس مکان پر لگا چکے تھے۔ اب نہ تنخواہ رہی تھی نہ پنشن، نہ مکان، نہ کتابیں، نہ زندگی کی دیگر سہولتیں اور ضرورتیں۔ میں انہیں چھ سال پہلے سے جانتا تھا اور انتہا حیران تھا کہ ان کے لباس اور فرنیچر اور کھانے میں تو فرق تھا لیکن ان کی علمی گفتگو، ان کے اشعار، ان کے لطیفے اور بذلہ سنجی اسی جگہ قائم تھی۔

میں اس سے چند ہی ماہ پہلے ہجرت کر کے کشمیر سے لاہور پہنچا تھا۔ میری عمر اس وقت 23 سال تھی اور ان کی 56۔ مستقبل اور زندگی میرے سامنے تھی اور ان کی پشت پر۔ وہ ایک زندگی کا اثاثہ لٹا کر آئے تھے اور میرے پاس تھا ہی کیا جو لٹاتا۔ میں اس زمانہ میں حوصلہ، یقین اور مثبتیت کا درس لینے لاہور جیسے علمی گہوارے میں اسی لٹے پٹے بوڑھے کے پاس حاضر ہوتا تھا۔

اسی زمانے میں انہیں ایک اور نقصان بھی ہوا۔ ایک عزیز آئے اور ان سے 25 ہزار روپے مانگ کر لے گئے کہ کاروبار میں لگائیں گے۔ خلیفہ صاحب روپیہ دیتے ہوئے گھر میں کبھی مشورہ نہ کرتے تھے۔ جس نے جو مانگا اگر پاس ہوا تو فوراً دے دیتے تھے۔ کاروبار میں نقصان ہوا تو گھر میں معمولی طور پر بات کر چھوڑی جیسے پانچ دس روپے کی بات ہو۔ گھر والوں کو قدرتاً تشویش تھی کہ روپیہ مانگنا چاہیئے۔ پیچھا کرنا چاہیئے۔ لیکن ان کا یہ کہنا بھی انہیں ناگوار ہوتا تھا۔ کہتے تھے جب ہوگا ضرور دے دیگا۔

جب بھی ان سے کسی کام کاج کی بات کی جاتی تو فوراً ٹال دیتے۔ بہت مجبور کرتے تو کہہ دیتے کہ ساری عمر پڑھتے رہے ہیں ذرا جم کے بیٹھے تو کچھ لکھ بھی ڈالیں گے۔ رہنے کو گھر تو ہو ہی گیا ہے۔ یہ بھی نہ ہوتا تو اتفاقاً اندرون موچی دروازہ ایک آبائی مکان تو ہے ہی۔ اس میں میرا بھی کچھ حصہ ہے۔ وہاں بھی بڑے مزہ سے رہ سکتا ہوں اور پھر کوئی حکایت، کوئی لطیفہ، کوئی علم و حکمت کی بات کر دیتے۔ غالباً ایک ایسے ہی موقع پر حضرت سید عبد القادر جیلانیؒ کی یہ بات سنائی کہ وہ علاوہ علم و عرفان میں بلند مقام رکھنے کے دنیوی ثروت میں بھی بڑے ممتاز تھے۔ وہ بہت بڑے بین الاقوامی تاجر تھے۔ اس پیمانے کے کہ انہیں اسباب تجارت کی حمل و نقل کے لیے اپنے جہازوں کا بیڑا رکھنا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ درس فرما رہے تھے کہ کوئی کارندہ گھبرایا ہوا آیا اور کہا تمام جہاز فلاں ملک سے واپس آتے ہوئے

سال بھی۔ یعنی پہلے سال نقصان ہوتا ہے۔ دوسرے سال معاملہ برابر ہوتا ہے اور تیسرے سال منافع ہوتا ہے۔ میں جو پہلے ہی اتنے درویش صفت آدمی سے دس ہزار روپیہ باوجود ان کی نازک مالی حالت کے لے چکا تھا۔ اپنے آپ میں پہلے دو سالوں کی کٹھن منزلوں کو برداشت کرنے کی اخلاقی قوت نہ رکھتا تھا۔ میں نے یہی مناسب سمجھا کہ باقی رقم ان کو لوٹا دوں اور نقصان والا حصہ پھر کبھی انہیں دے دوں۔ جب رقم کا چیک انہیں دیا اور بقایا کے متعلق کہا تو کہنے لگے کہ یہ تو اشتراک کا معاملہ ہوتا ہے۔ بارہ سو کا نقصان ہوا ہے تو چھ سو مجھے برداشت کرنا چاہئے اور چھ سو تمہیں۔ اس وقت تو خیر میرے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہیں تھی اور انہوں نے بھی کبھی اس چیز کا مجھ سے ذکر نہیں کیا۔ دو تین سال کے بعد میں نے نقصان والی رقم کا چیک بھیجا تو مجھے ایسا خط لکھا کہ جیسے ان میں نہ کوئی نیکی تھی اور نہ ہے اور دنیا بھر کی نیکی اور دیانت میرے ہی حصے میں آئی ہے!

مشہور مصنف لوئی فشر نے MEN AND POLITICS میں اپنی ایک گھریلو بات لکھی ہے۔ وہ اس زمانے میں ماسکو میں رہتے تھے۔ ان کے پانچ سالہ بچے نے اپنی ماں سے جو خود بھی مشہور جرنلسٹ ہیں اخبار پر اودا میں ایک کارٹون کا مطلب پوچھا۔ ماں نے کہا اس کا مطلب تم نہیں سمجھ سکتے تو بچے نے فوراً جواب دیا کہ اگر آپ واقعی کسی چیز کو سمجھتی ہوں تو آپ ضرور اسے سمجھا سکیں گی۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم ان یگانہ روزگار ہستیوں میں سے تھے جنہیں کبھی کسی کو یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ تم فلاں چیز سمجھ نہیں سکتے۔ انہوں نے علم و شعر و حکمت کو اس حد تک سمجھا ہوا تھا کہ وہ اسے لطیفوں اور حکایتوں کی شکل میں فلسفہ و شعر سے نابلد لوگوں کو بھی سمجھا سکتے تھے۔ علم و حکمت کا کوئی مشکل سے مشکل مسئلہ ایسا نہ تھا جو ان کی زبان سے سننے کے بعد اپنی گرہ کھول نہ دیتا ہو۔ انداز ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ جواب کسی شعر سے شروع کرتے یا کسی لطیفہ یا کہانی سے اور اس شعر کی تشریح میں اس کی کہانی یا لطیفہ سے منسلک قہقہے میں ساری دقت یوں دور ہو جاتی کہ حیرت ہوتی تھی کہ دقت تھی کہاں۔

لیکن اب اس چیز کو دہرانا اور بیان کرنا میرے بس میں نہیں۔ اس چیز کا احساس اس وقت بھی تھا جب وہ زندہ تھے کہ انمول موتی ان کے منہ سے نکل کر ہوا میں غائب ہو رہے ہیں۔ اگر کوئی زندہ قوم ہوتی تو دو اسٹینوگرافر ہر وقت ان کے ساتھ رکھتی جو ان کی ہر بات کو ضبط تحریر میں لے آتے اور اگر یہ ہوتا تو آج بیسیوں جلدیں علم و حکمت سے بھری ہوئی

قوم کو زندگی کا درس دینے کے لیے موجود ہوتیں۔

قوم کو کیا کہوں خود اپنی خامی پر دکھ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر جاسن ہم میں موجود تھے۔ ذرا آگے بڑھ کر پاسول بن جاتا کچھ مشکل نہ تھا۔ لیکن کبھی بھی گھر جا کر وہ بات نہ لکھی جو ان کی زبان سے سنی تھی۔ سوائے ایک بار کے، وہ بھی آج سے چودہ سال پہلے اور وہ بھی اب ملتی نہیں۔

اب تو صرف وہ کتابیں ہیں جو انہوں نے خود لکھیں۔ لکھنے کا اسلوب وہی تھا جو بات کرنے کا تھا۔ ہمیشہ قلم برداشتہ لکھتے تھے اور لکھے ہوئے کو دہراتے نہیں تھے۔ یہ بحیثیت مصنف ان کی خامی تھی اور جب وہ زندہ تھے تو میں نے کئی بار ان سے اس کی شکایت بھی۔ لیکن اب خوش ہوں کہ وہ ہماری طرح دہرانے اور سہرانے نہیں بیٹھے ورنہ شاید وہ دولت بھی ہمیں نہ ملتی جو خوش قسمتی سے اب ہم سے چھن نہ سکے گی۔

میں نے عمداً اس مضمون کا عنوان مرد درویش رکھا ہے حالانکہ وہ علم و عرفان کا ایک سمندر بھی تھے اور اس پہلو پر بہت کچھ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اپنی کوتاہ قلمی اور کوتاہ علمی ہے کہ نہ ان کے علم کو بیان کر سکتا ہوں اور نہ ان کے اسلوب کی کوئی مثال اب یاد ہے اور دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ ان کا خطاب ذہن سے زیادہ قلب و وجدان سے ہوتا تھا۔ شاید یہی وجہ ہو کہ شعور میں کوئی بات نہیں اور کم از کم خوش فہمی یہ ضرور ہے کہ وجدان میں سب باتیں محفوظ ہیں۔

جب ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کرنے کے لیے حکومت نے انہیں معین کیا تو انہیں یوں محسوس ہوا جیسے مچھلی کو پانی مل گیا ہو۔ ادارے کو انہوں نے بے انتہا باعمل ادارہ بنایا۔ کئی لالچ ان کے راستے میں ایسے آئے کہ کوئی دنیا دار ہوتا تو ادارے کو چھوڑ دیتا۔ مثلاً دو بار پنجاب یونیورسٹی کی وائس چانسلری انہیں پیش کی گئی۔ لیکن دونوں بار انکار کر دیا کہ میں اس ادارہ کا کام کرنا چاہتا ہوں۔ ایک بار تو میں نے بھی ان سے پوچھا کہ وہ کیوں انکار پر مصر ہیں، جو جواب دیا وہ الفاظ تو مجھے یاد نہیں لیکن اس کا مفہوم میرے جیسا معاشیات کا طالب علم اس طرح بیان کر سکتا ہے کہ کام کی قدر یافت کی قدر سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔

کسی کے متعلق برائی یا بدنیتی کا وہ سوچ ہی نہیں سکتے تھے۔ جب سری نگر کا بنگلہ بنانا تھا تو ڈیزائن تیار کروا لیا اور ایک کارندہ مقرر کر دیا کہ اس کے مطابق چیز بنوا دے۔ اس

14

اس کی باتوں میں گلوں کی خوشبو

ڈاکٹر عبدالسلام خورشید

اس وقت میں والد مرحوم مولانا سالک کے کتب خانے میں بیٹھا ہوں اور سوچ رہا ہوں کہ اپنے نہایت ہی شفیق بزرگ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے بارے میں اپنے تاثرات کا آغاز کہاں سے کروں۔ وہ میرے دوست نہیں تھے۔ میرے باپ کے دوست تھے لیکن ان کی شخصیت اتنی پیاری تھی کہ جو ان سے چند لمحے بات کر لیتا ان کا گرویدہ ہو جاتا اور ان کی عظمت کا کمال یہ تھا کہ جو شخص ان کے آستانے پر حاضری دیتا اس سے یوں ملتے جیسے وہ سچ مچ ان کا دوست ہو۔ خواہ وہ شخص کتنا ہی ادنیٰ کیوں نہ ہو۔ تصور کیجئے ایک طرف خلیفہ عبدالحکیم، ایک عظیم فلسفی، اسلامی مسائل کے ہر پہلو سے آگاہ، ماہر تعلیمات، اعلیٰ پائے کا ادیب، نقاد اور شاعر اور دوسری طرف راقم الحروف ایک اخبار نویس اور صحافت کا معمولی معلم۔ اس وسیع بُعد کے باوجود انہوں نے کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیا کہ میں ذہنی طور پر ان سے کہیں کمتر

حد تک تو ان کی مجبوری جائز تھی کیونکہ نہ کسی قسم کی بھاگ دوڑ کا کام انہوں نے خود کیا تھا اور نہ کر سکتے تھے۔ جس انداز سے وہ کارندہ خرچ کر رہا تھا اس سے صاف نظر آتا تھا کہ جنگ کی گرانی کے علاوہ بھی کوئی غیر معمولی وجہ اس خرچ کی تھی اور وہ وجہ باقی سب لوگوں کو نظر آ رہی تھی سوائے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے۔ کوئی کچھ کہتا بھی تو جواب دیتے کہ آپ لوگ خواہ مخواہ بدظنی کر رہے ہیں چنانچہ مکان کی تکمیل کے بعد بھی وہ ان کا ملازم رہا اور باغ لگانے کا کام بھی اسی سے کروایا گیا۔

اسی طرح ایک اور کارندہ تھا جسے تھل میں باغ لگوانے کے لیے ملازم رکھا۔ مختلف حیلوں سے وہ جائز خرچ سے ہزاروں روپیہ زیادہ وصول کرتا رہا۔ سب جانتے تھے کہ وہ ان کی تن آسانی اور روپے پیسے کے معاملے میں تفصیل سے گریز سے ناجائز فائدہ اٹھا رہا ہے لیکن آخر تک انہیں اس کی ایمانداری کا قطعی یقین تھا اور اگر کوئی شبہ کی بات کرتا بھی تو وہ یوں محسوس کرتے جیسے دوسرے کا شبہ بھی ان کا اپنا قصور ہے، چنانچہ اولین فرصت میں وہ اس کے لیے کپڑے یا کوئی اور تحفہ ضرور بھجوا دیتے اور چونکہ وقت گزرنے اور معاملہ کی اور وضاحت ہونے کے ساتھ زیادہ لوگ زیادہ موقعوں پر یہ بات کہنے لگے۔ اس لئے تحفوں کی مقدار بھی ہمیشہ بڑھتی ہی رہی۔ میں اس کارندے سے ان کی وفات کے بعد میں ملا لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ انہیں ایک فرشتہ سمجھتا ہوگا:

اور کون جانے کہ وہی ٹھیک سمجھتا ہو!

ہوں۔ یقیناً اس میں یہ حقیقت بھی کارفرما ہو گی کہ میں ان کے دوست کا فرزند تھا۔ لیکن میں نے انہیں اوروں سے بھی گفتگو کرتے دیکھا ہے اور ان کے کردار میں یہ چیز نمایاں پائی ہے کہ وہ امتیاز مراتب کے اتنے زیادہ قائل نہیں تھے۔

والد مرحوم کہتے تھے میرے نزدیک دو شخص ایسے ہیں جو گفتگو کے بادشاہ ہیں اور محفل آرائی میں کمال رکھتے ہیں۔ ایک حکیم احمد شجاع، دوسرے خلیفہ عبدالحکیم۔ لیکن دونوں کی گفتگو کے انداز میں فرق ہے۔ اوّل الذکر ہمیشہ سنجیدہ رہتے ہیں اور اپنی گفتگو سے بعض اوقات حاضرین پر رقت کا تاثر چھوڑ دیتے ہیں۔ ان کے برعکس خلیفہ عبدالحکیم کی گفتگو سے محفل کی محفل لوٹ پوٹ ہو جاتی ہے اور ایسے ایسے لطیفے ہو جاتے ہیں جو مدتوں تک ذہن میں آ آ کر ہونٹوں کو مسکرانے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ راقم الحروف کو یاد ہے ایک دفعہ برطانوی ڈپٹی ہائی کمشنر کی ایک دعوت میں خلیفہ صاحب بھی مدعو تھے۔ میں سلام کو آگے بڑھا تو فرمانے لگے۔ کارٹون چھپوا دیا نا؟ میں تھوڑی سی دیر الجھن میں رہا کہ وہ کس کارٹون کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ دو لمحوں میں سمجھ گیا کہ ان کی مراد ''پاکستان ٹائمز'' کے اس کارٹون سے ہے جو پنجاب یونیورسٹی کے اس وقت کے وائس چانسلر میاں افضل حسین صاحب کی تعلیمی پالیسی پر طنز کے لیے بنایا گیا تھا اور اس کی بنیاد میاں صاحب کا وہ بیان تھا جس میں انہوں نے اعلیٰ تعلیم کو صرف ذہین طلبہ تک محدود کرنے کا نظریہ پیش کیا تھا۔ میں نے فوراً کہا ''کارٹون مجھے چھپوانے کی کیا ضرورت تھی، میاں صاحب بات ہی اس انداز سے کرتے ہیں کہ کارٹونسٹ لپک کر آتا ہے اور چند آڑے ترچھے خطوط کی مدد سے اس کا مذاق اڑا دیتا ہے۔'' کہنے لگے ان کے بیان کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا ہے؟'' چھوٹا منہ بڑی بات۔ آپ کے سامنے میں اپنی رائے کیسے پیش کروں۔'' انہوں نے نہایت پیار سے کاندھے پر ہاتھ رکھا ''نہیں! نہیں! تم ضرور بتاؤ۔ میں نے سنا ہے تم ان کے بڑے حامی ہو۔'' میں نے قدرے حجاب کے ساتھ کہا ''ان کی باتوں کو اگر دلیل کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو نہایت وزنی اور کھری معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن...... لیکن وہ غالباً یہ نہیں جانتے کہ ان غیر معمولی نظریات کو ''گروہ در گروہ'' پیش نہیں کرنا چاہئے۔ پہلے ایک نظریہ پیش کریں اور جب تک لوگ اسے اچھی طرح ہضم نہ کر لیں دوسرا نظریہ سامنے نہ لائیں اور پھر جو بات

کہیں اگر یہ ڈر ہو کہ لوگوں کو کوڑی لگے گی تو اس پر شکر کا خول چڑھا دیں۔ اس سے ان کی عظمت میں کمی نہ ہو گی۔ اضافہ ہی ہو گا۔'' اس پر خلیفہ صاحب ہنسنے لگے اور فرمایا '' بھئی میرا خیال بھی یہی ہے کہ میاں صاحب کے تعلیمی نظریات صحت مند ہیں لیکن ان کا حال اس باپ کی طرح ہے جس کا ایک جوان بیٹا تھا۔ اس نے سوچا لڑکے کا رشتہ کر دوں۔ چنانچہ ادھر ادھر گھومنے لگا۔ کبھی ایک سے بات کی کبھی دوسرے سے لیکن اسے نہ صرف ہر جگہ مایوسی کا سامنا ہوتا بلکہ کہیں کہیں پٹائی بھی ہو جاتی۔ آخر اس نے اپنے ایک دوست سے فریاد کی کہ ہر شخص لڑکے والوں کی قدر کرتا ہے لیکن میری پٹائی ہو جاتی ہے حالانکہ میرا لڑکا پڑھا لکھا ہے۔ صاحب جائیداد ہے اور برسر روزگار ہے۔ بھلا اس سے بہتر رشتہ کیا ہو گا۔ دوست نے پوچھا۔ جب تم کسی لڑکی والے کے پاس جاتے ہو تو کیا کہتے ہو۔ اس نے کہا بھلا یہ بھی پوچھنے کی بات ہے۔ بات بالکل سیدھی ہے۔ میں کہتا ہوں۔ تمہاری لڑکی جوان ہے۔ ہمارا لڑکا جوان ہے اور ازل سے ابد تک یہی رسم چلی آتی ہے کہ جوان لڑکی اور جوان لڑکے کے ملاپ سے دنیا قائم ہے۔ اس سیدھی سادی بات سے لڑکی کے باپ کی آنکھوں میں خون اتر آتا ہے اور وہ مجھ پر گالیاں کی بوچھاڑ کر دیتا ہے۔ تم ہی بتاؤ۔ آخر کیوں؟ میں نے کیا قصور کیا ہے؟ اب دوست کو معلوم ہوا کہ پٹائی کیوں ہوتی ہے۔ اس نے کہا تمہاری نیت کا قصور نہیں۔ صرف بات کا ڈھنگ غلط ہے۔ اب کسی لڑکی کے باپ کے پاس جاؤ تو پہلے ادھر ادھر کی اچھی اچھی باتیں کرو۔ پھر باتوں ہی باتوں میں اپنے لڑکے کی تعلیم، جائیداد اور ملازمت کا ذکر کر دو۔ اس کے بعد چلے آؤ۔ پھر دوسری ملاقات میں اسی طرح کی تمہید باندھو اور بڑے ادب سے کہو کہ میرے فرزند کو اگر آپ اپنی فرزندی میں لے لیں تو میرے لئے یہ سرمایہ فخر و امتیاز ہو گا۔ یہ فرما کر خلیفہ صاحب کہنے لگے۔ بس میاں صاحب کو یہی طرز عمل اختیار کرنا چاہیئے۔

لاہور میں تو خلیفہ صاحب سے چند ملاقاتیں ہوئیں اور وہ بھی ان کی زندگی کے آخری دنوں میں۔ لیکن مری میں چونکہ مال روڈ سب کی ملاقات کا اڈہ ہے۔ اس لئے وہاں ان سے سرراہے کئی بار ملاقات ہوتی تھی اور ہمیشہ ایک آدھ لطیفہ ہو جاتا تھا۔ مری کی ادبی اور ثقافتی زندگی کے وہ دولہا تھے۔ مری لٹریری یونین جب ''لن ٹاٹ'' رستوران میں کوئی خصوصی

تقریب منعقد کرتی تو خلیفہ صاحب ضرور مدعو ہوتے اور اپنی شخصیت کے حسن اور کشش سے ساری محفل پر چھا جاتے اور لطائف وظرائف کا ایک دریا تھا کہ مسلسل بہا جاتا تھا۔ انہی محفلوں میں مجھے معلوم ہوا کہ وہ اعلیٰ پائے کے شاعر بھی ہیں۔ بیاض لے آتے تھے اور سنانے پر آتے تو احباب کی فرمائش پر غزلیں اور طویل نظمیں پڑھتے اور حاضرین کی پیاس تھی کہ مٹنے میں نہ آتی تھی۔

وفات سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ایک نجی کام کے سلسلے میں ان کے دولت کدے پر گیا۔ بات لمبی ہو گئی اور میں نے سگریٹ پینا چاہا۔ بزرگوں کے سامنے سگریٹ پینے میں مضائقہ نہیں سمجھتا کہ والد صاحب کے سامنے بھی ایسا کوئی حجاب نہیں تھا۔ لیکن میں نے دیدہ و دانستہ سگریٹ کیس نہ نکالا۔ وجہ یہ تھی کہ میں قینچی کا سگریٹ پینے کا عادی تھا اور ہوں۔ لیکن میں نے سوچا۔ اگر ان کے سامنے سگریٹ کیس کھولا۔ تو انہیں بھی سگریٹ پیش کرنا ہو گا اور وہ تو اسٹیٹ ایکسپریس پیتے ہوں گے۔ ایسے میں قینچی کا سگریٹ پیش کرنا زیادتی ہو گی۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ انہوں نے اپنی جیب سے قینچی کی ڈبیا نکالی اور سگرٹ سلگا کر پینے لگے۔ اس سے میرا حجاب ٹوٹ گیا اور میں نے بھی اپنا سگریٹ سلگا لیا۔ بعد میں والد صاحب سے معلوم ہوا کہ خلیفہ صاحب مستقل طور پر اسی سگریٹ کے عادی ہیں۔

ان کی زندگی میں سے صرف چند دن باقی تھے کہ مجھے ان سے ایک ادبی کام کے سلسلے میں ملنے کا اتفاق ہوا۔ ان دنوں والد صاحب بیماری قلب کے ایک شدید حملے سے بچ گئے تھے۔ خلیفہ صاحب ہمیشہ پہلے ان کا حال پوچھتے۔ اس دفعہ بھی ان کا حال پوچھا اور پھر کہنے لگے ان کی عمر کیا ہو گی؟ میں نے کہا چونسٹھ برس۔ تو ہنس کر کہنے لگے کہ بھئی اب اتنی عمر میں تو ایسے عوارض لاحق ہوتے ہی ہیں۔ اب تو ہم لوگوں کا چل چلاؤ ہے اور کسے معلوم تھا کہ یہ سرخ و سفید چہرہ جو عمر کی پختگی کے باوجود جوانوں سے بہتر نظر آتا تھا۔ چند روز بعد اپنی تمام مسکراہٹوں، لطیفوں، شگفتگیوں کو لے کر وہاں چلا جائے گا جہاں پہنچ کر کوئی نہیں لوٹا۔

خلیفہ صاحب کی شخصیت کے پہلو بے شمار ہیں۔ ان کے علم و فضل سے ایک دنیا نے فائدہ اٹھایا۔ دینی مسائل سے ان کی آگہی نے بے شمار ایسے نوجوانوں اور بڑے بڑے پڑھے لکھوں کو اپنے دین کے قریب کر دیا جن کے ذہن ہلے ہوئے تھے اور خیالات متزلزل

تھے۔ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھ کر انہوں نے ایک ایسا سلسلہ جاری کر دیا جس سے ہمارا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ ذہنی طور پر اسلام کے زیادہ قریب آ رہا ہے۔ آخری عمر کی بے پناہ محنت کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہمارے پاس ان کی زندگی بھر کے حاصل کیے ہوئے علم کا نچوڑ موجود ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری خدمات ایسی ہیں جن کا صحیح اندازہ عالم و فاضل شخصیتیں ہی کر سکتی ہیں۔ میں اس کے سوا کیا کر سکتا ہوں کہ عقیدت کے پھول پیش کر دوں۔

15

خلیفہ مرحوم کی زندگی کا یادگار دور

ڈاکٹر انور اقبال قریشی

خلیفہ عبدالحکیم صاحب سے میری پہلی ملاقات عثمانیہ یونیورسٹی کے کلب میں 21 جون 1937ء کی شام کو ہوئی۔ موسم گرما کی تعطیلات کے بعد یونیورسٹی کے کھلنے کا یہ پہلا دن تھا اور یونیورسٹی میں میری ملازمت کا بھی روز اوّل تھا۔ میرا تقرر بطور صدر شعبہ معاشیات عمل میں آیا تھا اور میں اسی روز سیدھا جالندھر سے حیدر آباد پہنچا تھا۔ لیکن میری ''شہرت'' میرے آنے سے بہت پہلے پہنچ چکی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میری آمد کے خلاف جامعہ میں اچھا خاصا محاذ قائم کر دیا گیا تھا۔ ایک تو اس زمانہ میں ملکی اور غیر ملکی کا مسئلہ اس قدر شدت اختیار کر چکا تھا کہ کسی غیر کا تقرر یوں ہی ممکن نہ تھا اور میری یہ بھی بدقسمتی تھی کہ خود جامعہ کے اندر چند نہایت با اثر اساتذہ کے حقوق میرے تقرر سے متاثر ہوئے تھے۔ ان لوگوں کو دربار تک رسائی حاصل تھی لہٰذا انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگایا کہ میرا تقرر عمل میں نہ آئے۔ ملکی

تحریک کی شدت کے باوجود خود ملکی حلقوں میں اس بات کا احساس تھا کہ جامعہ میں بہترین استادوں کا تقرر ہونا چاہئے۔ اس وقت حکومت کی باگ ڈور سر اکبر حیدری کے ہاتھوں میں تھی اور انہی کے ایما پر باوجود سخت مخالفت کے میرا تقرر عمل میں آیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یونیورسٹی کے حلقوں میں میری آمد سے پہلے میرا خاصہ چرچا ہو چکا تھا۔ جس سے خلیفہ صاحب بخوبی واقف تھے۔

اسی شام جب یونیورسٹی کلب میں ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو مجھے دیکھتے ہی خود بخود ہنس کر کہنے لگے۔ میاں تم سے تو مل کر مجھے کچھ مسرت نہیں ہوئی۔ ہم تو سمجھتے تھے کہ جو شخص ڈبلن یونیورسٹی میں لکچرار ہو اور ریزرو بنک کی جس نے افسری کی ہو وہ کوئی بہتر قسم کا آدمی ہوگا لیکن تم مجھے بالکل طفل مکتب نظر آتے ہو۔ کلب کی مجلس بھری ہوئی تھی سب لوگوں کی نظریں دفعۃً میری طرف اٹھ گئیں اور میں کچھ جھینپ سا گیا اور کوئی جواب بن نہ پڑا۔

خلیفہ صاحب بہت بامذاق آدمی تھے لیکن ان کی ہردلعزیزی کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ان کے مذاق میں طنز تو ضرور ہوتا تھا لیکن طعن کبھی نہ ہوتا۔ بات جب کرتے تھے تو چہرہ پر ہمیشہ دل کش مسکراہٹ ہوتی تھی جس میں محبت اور خلوص کا پہلو نمایاں ہوتا۔ یہی پہلا مذاق باقی عمر بھر کی دوستی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ میرے دل نے فوراً یہ محسوس کر لیا کہ سارے کلب میں یہ واحد شخص ہے جو میرے تقرر سے دلی طور سے خوش ہے اور اس بات پر مفتخر ہے کہ اس کے وطن کے ایک مسلمان نوجوان کو زندگی کے اولیں منازل ہی میں یہ اعزاز حاصل ہوا ہے۔

خلیفہ صاحب سے اگرچہ یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ لیکن ان سے غائبانہ تعارف تھا۔ وہ جامعہ کے مشہور پروفیسر تھے اور ان کی علمی شہرت حیدرآباد سے باہر پھیل چکی تھی۔ میرے ذہن میں ان کا ابتدائی تصور ایک عجیب قسم کے دبلے پتلے اور دنیا و مافیہا سے بے خبر پروفیسر کا تھا اور یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ آئی تھی کہ عبدالحکیم صاحب ایک خوش رو، خوش وضع، سرخ و سپید تنومند اور جامہ زیب اور نہایت خوش مزاج و مخلص انسان ہوں گے۔ عمر کے فرق کے باوجود اسی شام سے ان سے دوستی قائم ہو گئی اور دن بدن بڑھتی گئی اور حالات کچھ ایسے سازگار ہوئے کہ ہمارے پورے خاندان دوستی کے اس رشتہ میں منسلک ہو گئے۔ میری اکلوتی بچی بشرا ان کی بچی رفیعہ کی ہم جماعت تھی اور وہ دونوں بالکل بہنیں بن گئیں اور جب میری بیوی کی ملاقات بیگم خلیفہ سے ہوئی تو ان کی ملاقاتوں کا سلسلہ ہم سے

بھی بڑھ گیا اور بفضل تعالیٰ اب تک جاری ہے۔
عام پڑھنے والوں کو ان خانگی تعلقات سے چنداں دلچسپی نہ ہوگی اور میں ان کا ذکر بھی نہ کرتا لیکن مشکل یہ ہے کہ اگر اس ماحول کا ذکر نہ کیا جاتا تو آئندہ بعض تفصیلات کی جن کا ذکر آئے گا پوری طرح وضاحت نہیں ہو سکتی تھی۔ خلیفہ صاحب کے دوست احباب واقعی لاتعداد ہیں۔ وہ اس قدر مرنجاں مرنج آدمی تھے کہ جو شخص ایک دفعہ ان سے مل لیتا ہمیشہ ان کا دم بھرتا۔ لیکن ان لوگوں کی تعداد جو ان کی زندگی کے ہر پہلو سے آگاہ ہوں اور جنھوں نے اپنی عمر کا ایک حصہ گزارا ہو زیادہ نہیں ہے۔

جون 1937ء سے لے کر ستمبر 1946ء تک جب تک کہ میں حیدر آباد میں رہا شاید ہی کوئی صبح یا شام ایسی گزری ہو جب خلیفہ صاحب سے ملاقات نہ ہوئی ہو۔ ہمارے گھر ایک دوسرے کے بالکل قریب تھے خلیفہ صاحب کا اپنا ذاتی بنگلہ بہت شاندار تھا۔ اس وقت حیدر آباد میں جرمن ڈیزائن بنگلوں کا رواج تھا جو بہت مقبول تھے۔ لیکن میرے خیال میں یہ گھر گرم ممالک کے رہنے والوں کے لیے چنداں موزوں نہ تھے۔ خلیفہ صاحب کا مکان مجھے اس لئے پسند آیا کہ یہ مغلوں کی عمارتوں کے طرز پر بنایا گیا تھا جس میں کھلے کھلے برآمدے اور خوبصورت محراب اور ستون تھے۔ اس گھر میں آٹھ ہزار گز زمین تھی اور پانی کثرت سے ملنے کی وجہ سے ان کا خانہ باغ بہت شاداب تھا۔ یونیورسٹی ہمارے گھر سے دور تھی (ان دنوں چار میل کا فاصلہ بھی بہت دور سمجھا جاتا تھا، لہٰذا ہم دونوں باری باری ایک موٹر میں جاتے تھے اور دوسری موٹر بچوں کو سکول لے جانے یا بیگمات کے لیے مخصوص رہتی)۔ اکثر و بیشتر اہم چیزوں میں ہم دونوں کی طبیعتوں کا میلان یکساں تھا خلیفہ صاحب دوپہر کے کھانے کے بعد آرام کرنے کے ہی نہیں بلکہ سونے کے عادی تھے۔ میری یہ انتہائی کمزوری کہیئے یا راسخ عادت کہ اگر دوپہر کی نیند نہ ملے تو میں پھر کام ہی نہیں کر سکتا۔ انگلستان جیسے سرد ملک میں بھی طالب علمی کے زمانے اور سردی کے موسم میں بھی دوپہر کا سونا نہ چھوٹا۔ چنانچہ یونیورسٹی میں جب کبھی تیسرے پہر میں کوئی میٹنگ کرنے کا سوال پیدا ہوا تو میری اور خلیفہ صاحب کی رائے ہمیشہ اس کے خلاف ہوتی اور ہمیں کامیابی اس لئے ہو جاتی کہ ہم صاف کہہ دیتے کہ اس صورت میں ہم شرکت سے معذور ہیں۔ جب خلیفہ صاحب کو شروع شروع میں میری اس عادت کا پتہ چلا تو بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے میاں بس اب ہماری دوستی پکی ہو گی تم بہت

سمجھ دار آدمی معلوم ہوتے ہو۔ جو شخص دوپہر میں آرام نہیں کرتا وہ اپنی زندگی سے دشمنی کرتا ہے۔

شام کو ہم دونوں مغرب کے قریب اکٹھے یونیورسٹی کلب جایا کرتے تھے۔ خلیفہ صاحب پیدل چلنے کے چنداں شوقین نہ تھے۔ اگرچہ تھوڑا سا ٹہلنا ضرور پسند کرتے تھے۔ میں بھی اس معاملے میں سخت چور واقع ہوا ہوں۔ کلب ہمارے گھر سے تقریباً ڈیڑھ میل تھا۔ چنانچہ دستور یہ تھا کہ اکثر کلب پیدل جاتے اور واپسی کے لیے موٹر منگوا لیتے۔ موٹروں میں جانے اور آنے کا تو اکثر اتفاق ہوتا تھا لیکن دونوں طرف پیدل چلنے کا موقع کبھی نہ آیا۔

خلیفہ صاحب کا گھر بچوں اور بیگمات کیلئے کلب کا کام دیتا تھا اور وہاں کم وبیش ہر روز ان کی محفلیں جمتی تھیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کلب اپنی نوعیت کا ایک ہی کلب تھا جس کا بدل آج تک کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ حیدر آباد چھوڑنے کے بعد یہی افسوس رہا کہ اور تو سب چیزوں کی تلافی ہو گئی لیکن یونیورسٹی کلب کا نعم البدل نہیں ملا اور نہ ملنے کی توقع ہے۔ اس کلب کی سب سے نادر خوبی گپ تھی۔ گپ اور محض خالص گپ۔ لیکن اس گپ کا معیار بہت اونچا ہوتا تھا۔ بذلہ سنجی اور لطیفہ بازی کے علاوہ حالات حاضرہ پر بہت دلچسپ تبصرہ ہوتا تھا۔ تمام جنگ کے دوران میں حالات جنگ پر جو سیر حاصل تبصرہ اس کلب میں ہوتا وہ دنیا کے اچھے سے اچھے اخبار میں دیکھنے میں نہیں آیا۔ بعض زندہ دل اراکین اس کے لیے خاص طور پر تیار ہو کر آتے تھے اور دنیا بھر کے ریڈیو اسٹیشنوں سے الگ الگ خبریں اور تبصرے سنتے تھے اور پھر کلب میں اس پر تنقید ہوتی تھی۔ میں اور خلیفہ صاحب دو ایسے اراکین تھے جو اپنے گھروں میں ریڈیو بہت کم سنتے تھے اور زیادہ تر کلب کے تبصرے پر ہی اکتفا کرتے تھے۔ ہر شام کلب میں مستقل آنے والوں کی تعداد دس بارہ سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ جو لوگ محض ٹینس کھیلنے کے لیے آتے تھے وہ جلدی آتے اور جلدی چلے جاتے۔ اصل مجلس مغرب کے بعد جمتی اور شب تک ختم ہو جاتی۔ اس کلب کی ایک خاص چیز یک رکابی ڈنر تھا۔ میں نے سنا ہے کہ اس کی نقل اور جگہ بھی گئی لیکن وہ بات پیدا نہیں ہوئی۔ ڈنر والی رات تقریباً بیس اصحاب ہوتے تھے اور اس میں زیادہ تر وہی لوگ شریک ہوتے جو باقاعدہ کلب آتے تھے۔ ویسے تو کلب کے جملہ اراکین کی تعداد سو سے اوپر تھی۔ یہ ڈنر بالکل غیر رسمی ہوتا تھا اور اراکین کو اس کی اطلاع دینے کا کوئی قاعدہ نہ تھا۔ کھانے پینے کے لحاظ سے حیدر آباد کا معیار تمام

ہندوستان سے اونچا تھا۔ اچھے گھرانوں میں مختلف کھانوں کے ماہر کئی کئی باورچی رکھے جاتے تھے۔ اس بارے میں حیدر آبادی بیگمات بھی بہت سلیقہ مند تھیں اور عمدہ کھانے پکانے میں ید طولیٰ رکھتی تھیں۔ دستور یہ تھا کہ اگر بیس احباب کھانے میں شریک ہوتے تو صرف دس احباب کو کھانا لانے کی زحمت دی جاتی تھی اور باقی دس اس مرتبہ کچھ نہ لاتے تھے۔ اگلے مہینے میں دس کچھ نہ لاتے اور دوسرے دس احباب کھانا لاتے رہتے تھے۔ کھانے کا ایک باقاعدہ مینو تیار ہوتا تھا۔ کلب والوں کو خوب معلوم تھا کہ کس کے گھر میں کونسی چیز خصوصیت سے اچھی پکتی ہے اور وہی چیز اس کے ذمہ ڈالی جاتی تھی۔ خلیفہ صاحب کے ہاں شب دیگ بہت عمدہ پکتی تھی۔ دکنی گھرانوں میں میٹھوں اور حلوؤں کا معیار بہت اونچا ہوتا تھا۔ مجھے کئی بادشاہوں کے یہاں بھی کھانے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ بڑے بڑے جہازوں اور یورپ کے اعلیٰ ترین ہوٹلوں میں بھی کھانا کھایا ہے لیکن جس معیار کا ایک رکابی ڈنر عثمانیہ کلب میں ہوتا تھا ویسا ڈنر آج تک نصیب نہیں ہوا۔ کھانے کے بعد خلیفہ صاحب سے ہمیشہ شعر سنانے کی فرمائش کی جاتی تھی اور عموماً یہ محفل ایک مختصر مگر منتخب مشاعرہ کی صورت اختیار کر لیتی تھی۔

خلیفہ صاحب سے ملاقات سے پہلے مجھے یہ زعم تھا کہ میں بہت پڑھنے والے آدمیوں میں سے ہوں کیونکہ میں اوسطاً سو صفحے روز پڑھتا تھا لیکن میرا مطالعہ زیادہ تر معاشیات تک ہی محدود تھا۔ خلیفہ صاحب کا دستور یہ تھا کہ وہ صبح سویرے اٹھتے اور ناشتے تک اپنے کمرہ میں مطالعہ کرتے۔ ناشتے کے بعد وہ ایک آرام دہ کرسی پر درخت کے نیچے باغ میں بیٹھ جاتے اور ساڑھے دس بجے تک پڑھتے رہتے۔ پھر یونیورسٹی جانے کا وقت ہو جاتا۔ دوپہر میں آرام کے بعد وہ عصر کے وقت باغ میں آ کر پھر اسی کرسی پر ڈٹ جاتے اور مغرب سے ذرا پہلے تک یہ سلسلہ جاری رہتا۔ پھر کلب چلے جاتے۔ رات کا کھانا کھانے کے بعد کچھ دیر تک ڈرائنگ روم میں گپ شپ رہتی اور پھر سونے سے پہلے ایک آدھ گھنٹہ ضرور مطالعہ میں صرف کرتے۔ اتوار یا دوسری تعطیلات میں جو حیدر آباد میں کثرت سے ہوتی تھیں۔ زیادہ وقت باغ میں آرام دہ کرسی پر ہی پڑھنے میں گزارتے تھے۔ جو ملاقاتی آ جاتا وہ بھی پاس کی کرسی پر بیٹھ جاتا۔ تعطیلات کے زمانے میں پڑھنے کے لیے کافی وقت مل جاتا تھا اور ویسے بھی روزانہ اوسطاً چار پانچ گھنٹے سے کم نہ تھا۔ بظاہر یہ کوئی غیر معمولی مطالعہ نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر یہ دیکھا جائے کہ یہ اوسط سال کے 365 دن برابر جاری رہتا تھا خواہ اتوار ہو یا کوئی تہوار اور

تعطیلات کے چار مہینوں میں مطالعہ کا وقت بہت بڑھ جاتا تھا تو پھر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اس اوسط کی برابری کرنا آسان کام نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب نے پڑھنے کے مقابلہ میں لکھا بہت کم ہے۔ حیدرآباد میں قیام تک تو انہوں نے بعض کتابوں کے ترجمے اور چند علمی مقالوں کے علاوہ اور کچھ نہیں لکھا۔ ان کی تمام تر تصانیف پروفیسری سے ریٹائر ہونے کے بعد کی ہیں۔ جب کہ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کے ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ میں حیدرآباد میں برابر لکھتا رہتا تھا اور اکثر و بیشتر ان کے صلاح مشورہ لیتا تھا۔ وہ میرے مسودات بہت دلچسپی اور توجہ سے پڑھتے تھے اور اکثر میرے قلم کی سختی کو نرم کر دیتے تھے۔ لیکن میں جب کبھی انہیں خود لکھنے پر اصرار کرتا تو وہ نہایت عمدگی سے ٹال دیتے اور کہتے میاں تمہارا مضمون دال روٹی کا ہے اور تم سبزی ترکاری کے بھاؤ لکھ کر آسانی سے چھوٹ جاتے ہو۔ دراصل ان کی نظر اتنی وسیع اور ان کا اپنا معیار اس قدر بلند تھا کہ وہ کوئی ایسی چیز لکھنے پر آمادہ نہ ہوتے تھے جو خود ان کے معیار کے مطابق نہ ہو۔ خلیفہ صاحب کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کی نظر بہت عمیق تھی۔ وہ صحیح معنوں میں ان معدودے چند آدمیوں میں سے تھے جو مفکر کہلا سکتے ہیں اور یہ کہنا غلط نہیں کہ وہ اس زمانے میں ہندوستان و پاکستان کے سب سے زیادہ پڑھے لکھے آدمی تھے۔

1956ء کے شروع میں امریکہ کی انڈیانا یونیورسٹی نے خلیفہ صاحب کو کنووکیشن ایڈریس پڑھنے کی دعوت دی تھی اور امریکہ کے علمی حلقوں میں اس ایڈریس کو بہت اہمیت دی گئی۔ میں ان دنوں واشنگٹن میں مقیم تھا۔ اسی دوران میں انہوں نے امریکہ کا دورہ کیا اور جابجا لکچر دیئے۔ واپسی پر میرے پاس ٹھہرے اور امریکہ میں حیدرآباد کی یاد تازہ ہو گئی۔ میں نے امریکہ کے متعلق ان کے تاثرات دریافت کئے تو کہنے لگے ان لوگوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے۔ دوپہر کے کھانے کی دعوت دیتے ہیں اور کھانے کے بعد آرام کی بجائے لکچر دینے پر مجبور کرتے ہیں۔ ان داموں پر یہ سودا مہنگا ہے۔ اس لئے میں جلدی واپس آ گیا ہوں تاکہ تمہارے ہاں دوپہر کے کھانے کے بعد کم سے کم آرام تو کر سکوں۔

16

خلیفہ عبدالحکیم کی زندگی کا آخری دن

ممتاز حسین

جمعے کا دن تھا اور جنوری کی ۳۰ تاریخ (۱۹۵۰)۔ ۱۲ بجے کے لگ بھگ میں دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ خلیفہ صاحب میرے کمرے میں آئے اور آتے ہی انہوں نے اپنے مخصوص اور بے تکلفانہ انداز میں السلام علیکم کہا اور چند کاغذوں کا ایک فائل نما پلندا جو وہ کسی کانفرنس سے لائے تھے میری میز کے ایک کونے پر پھینک دیا۔

مجھے ان کی تشریف آوری کی توقع تھی لیکن اطلاع نہیں تھی۔ ایک ہفتہ پہلے جب میں لاہور میں تھا تو ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ یہ ملاقات کیا تھی ایک یادگار صحبت تھی۔ میں نے ان سے درخواست کی تھی کہ وہ مجھ سے تصوف پر گفتگو کریں۔ اس موضوع پر ان کا علم بھی غیر معمولی تھا اور عرفان بھی۔ اس صحبت میں انہوں نے گفتگو کے ساتھ کھانے کی دعوت بھی دے رکھی تھی۔ میں وارث روڈ پر ان کے یہاں پہنچا تو میاں بشیر احمد، پروفیسر حمید احمد خاں،

شاہ محمد جعفر پھلواروی، سید رئیس احمد جعفری اور بشیر احمد ڈار جیسے سربرآوردہ علماء پہلے سے ہی موجود تھے۔ دیر تک صحبت رہی۔ اس گفتگو کا حال بشیر احمد ڈار مفصل طور پر لکھ چکے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے خلیفہ صاحب کے ساتھ کھانا کھایا۔ کھانا حسب معمول پر تکلف تھا۔ سادہ کھانا ان کے اور ان کے مہمانوں کی قسمت ہی میں نہ تھا۔ رات گئے جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو انہوں نے کہا کہ اب کراچی میں ملاقات ہوگی۔ میں اسی ملاقات کا منتظر تھا۔

خلیفہ صاحب سے جب بھی ملاقات ہوتی ایک اور ملاقات کی خواہش پیدا ہوتی اور اس کا انتظار رہتا۔ جب بھی میرا بس چلتا میں استفادے کی غرض سے پیشتر نوٹس دے کر گفتگو کے لیے ایک موضوع متعین کروالیا کرتا تھا۔ ہماری گفتگو کی ابتداء اسی موضوع سے ہوا کرتی تھی۔ البتہ گفتگو کے دوران میں دنیا بھر کے موضوعات کسی نہ کسی صورت سے اس کی لپیٹ میں آجایا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ کراچی میں ان کے چھوٹے بھائی خلیفہ عبدالغنی صاحب کے ہاں مولانا روم کے متعلق گفتگو ہوئی۔ اقبال کے بعد اس برصغیر میں یا دنیا کے کسی اور حصے میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہوگا جو مولانا روم کی شاعری اور فلسفے کو خلیفہ صاحب کے برابر جانتا ہو۔ یہ گفتگو بڑی دلچسپ تھی۔ میں نے اس کے نوٹ لئے جواب تک میرے پاس محفوظ ہیں۔

(ب)

خلیفہ صاحب اور مجھ میں بے تکلفی تھی۔ جب چاہتے کسی اطلاع کے بغیر تشریف لاتے، جتنا عرصہ چاہتے بیٹھتے اور جب ان کا جی چاہتا اٹھ کر چلے جاتے۔ ۳۰ جنوری کو آئے تو میں محاصل سے متعلق کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ میں نے ان سے عرض کیا: آپ ایک لمحہ تشریف رکھیں، میں اس فائل کو ختم کر کے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں۔ انہوں نے کہا: کوئی جلدی کی بات نہیں، میں پہلے منہ ہاتھ دھونا چاہتا ہوں، غسل خانہ کدھر ہے۔ میں نے انہیں بتایا اور وہ غسل خانے کی طرف تشریف لے گئے۔ میں فائل دیکھتا رہا۔ اس اثناء میں غسل خانے کی جانب سے نلکا چلنے، ان کے منہ ہاتھ دھونے اور کھنکھارنے کی آواز آتی رہی۔ کچھ عرصے کے بعد وہ واپس آئے اور میری میز کے سامنے سے گزر کر دائیں ہاتھ کے کونے میں رکھے ہوئے صوفے کی طرف چلے گئے۔ میں اپنے کاغذات تقریباً سارے پڑھ

میں عرض کیا کہ یہ فائل ابھی ختم ہوئی جاتی ہے، آنکھ اٹھائے بغیر ان کی خدمت چکا تھا۔ آپ ایک لمحہ آرام فرمائیں، میں ابھی گپ شپ کے لیے آپ کے پاس بیٹھتا ہوں۔ انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ان کا خاموش رہنا اور میرے دفتری انہماک اور فنانس منسٹری کے بنیاپن کے متعلق کوئی ریمارک پاس نہ کرنا غیر معمولی تھا۔ مجھے ایک خلاء سا محسوس ہوا۔ میں نے فائل پرے رکھ دی اور ان کی طرف دیکھا۔ دیکھتے ہی میرے دل کو ایک دھکا سا لگا۔ ان کے چہرے پر حسب معمول تبسم کی بجائے کرب اور بے چینی کے آثار تھے اور وہ زور زور سے سانس لے رہے تھے۔ میں نے کہا: کیوں بھائی کیا بات ہے، کوئی تکلیف تو نہیں؟ انہوں نے انگریزی میں فرمایا: میرا دل بڑی تیزی سے دھڑک رہا ہے اور مجھے سانس لینے میں مشکل ہو رہی ہے، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا۔ میں گھبرا گیا مگر اپنی گھبراہٹ چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے ان سے کہا: یہ کوئی بات نہیں، آپ آرام سے صوفے پر بیٹھ جائیے، ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس کے بعد میں نے باہر جا کر کراچی کے سول سرجن ڈاکٹر اے۔ جے۔ خان کو ٹیلیفون کیا کہ خلیفہ صاحب کی حالت اچھی نہیں ہے، آپ فوراً آ جائیں۔ ۱۰ منٹ کے اندر اندر ڈاکٹر اے جے خان اور ان کے اسسٹنٹ ڈاکٹر قریشی مرحوم اسمبلی کی عمارت میں میرے دفتر پہنچ گئے۔ میں اس وقت خلیفہ صاحب کے پاس اپنے کمرے میں تھا اور اس چہرے پر جو مسکرانے اور ہنسنے کے لیے پیدا کیا گیا تھا بڑھتی ہوئی اداسی اور زردی دیکھ کر میری اپنی حالت غیر ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر خان نے مجھے دیکھتے ہی کمرے سے باہر چلے جانے کو کہا۔ پھر وہ میرے پاس آئے اور فرمایا کہ ان کو دل کا دورہ پڑا ہے، آپ ان کے پاس نہ رہیے کیونکہ آپ ان کے لیے کچھ نہیں کر سکتے؛ ہم سے جو کچھ ہو سکے گا ہم کریں گے۔ میں ڈاکٹر صاحب کے مشورے کے مطابق سیکرٹری کے دفتر میں آ بیٹھا اور اپنے دوست کے لیے خدا سے دعا مانگتا رہا۔ ان کے متعلق پانچ پانچ منٹ کے بعد مجھے اندر سے اطلاع ملتی رہی۔

(ج)

موت وحیات کی کشمکش زور پر تھی۔ دونوں ڈاکٹر اپنی پوری سعی اور توجہ سے ان کی جان بچانے میں کوشاں تھے۔ ان سے جو کچھ ہو سکتا تھا انہوں نے کیا، دوائیں دیں، انجکشن لگائے مگر تقدیر کے سامنے ڈاکٹری کی کچھ نہ چلی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے قریب میرے جمعدار

نے آکر مجھ سے کہا کہ ڈاکٹروں کی کوششیں بیکار ثابت ہوئیں اور جو ہونا تھا ہو گیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔ اسی وقت خلیفہ عبدالغنی، کرنل مجید ملک اور خلیفہ صاحب کے برادر نسبتی جناب حمید غنی کو اطلاع کی گئی۔ کرنل صاحب کو اطلاع کرنے میں کچھ دیر ہوئی کیونکہ ان کے دفتر میں اس روز آگ لگی تھی اور اس سلسلے میں انتظامات میں مصروف تھے۔ البتہ حمید غنی صاحب فوراً آ گئے اور انہوں نے بلا تاخیر مرحوم کے جسد خاکی کو ہوائی جہاز سے لاہور پہنچانے کا انتظام کیا۔ میں اس قابل نہیں تھا کہ کچھ بھی کر سکوں۔ میرے عملے نے کچھ مدد کی ہو تو ہو۔ پندرہ میں منٹ کے اندر گاڑی آگئی اور حمید غنی ان کا تابوت اس میں رکھ کر ہوائی اڈے پر لے گئے۔ مجھے خلیفہ صاحب کا آخری دیدار کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

یہ ہے ایک مختصر داستان اس ایک گھنٹے سے کچھ کم مدت کی جو خلیفہ صاحب نے اس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے میرے کمرے میں بسر کی۔ وہ شاید اسی لئے آئے تھے کہ مجھ سے آخری بار مل کر اپنے دائمی سفر کو روانہ ہو جائیں۔

میری ان کی دوستی ۲۰ سال سے کچھ اوپر کی تھی مگر ہمارے تعلقات کچھ اس نوعیت کے تھے کہ مجھے اکثر محسوس ہوتا تھا کہ میں اور وہ ہمیشہ سے ایک دوسرے کے دوست چلے آتے ہیں اور ہماری آخری ملاقات نے تو اس دوستی پر ایک دائمی مہر ثبت کر دی۔ ہماری طبیعتیں ہم آہنگ تھیں۔ وہ علم و دانش کا ایک سرچشمہ تھے جس پر میں ایک پیاسے کی طرح پہنچتا تھا۔ ان کی طبیعت کی شگفتگی کا یہ عالم تھا کہ گھنٹوں ان سے علمی گفتگو کیجئے، تھکن نہ انہیں محسوس ہوتی تھی نہ آپ کو۔ باریک سے باریک نکتے کو وہ اس خوبی سے بیان کرتے تھے کہ اس میں کوئی پیچیدگی باقی نہیں رہ جاتی تھی۔

ظرافت اور بذلہ سنجی ان کی طبیعت کا جزو تھی۔ وہ فلسفے جیسے ثقیل مضمون میں بھی خصوصاً مابعد الطبیعیات میں جس کی ثقالت مسلم ہے ایک لطافت پیدا کر دیتے تھے اور سننے والے اس موضوع سے دور بھاگنے کی بجائے اس کے متعلق اور سننا چاہتے تھے۔

(د)

۳۰ جنوری کو میرے پاس آنے سے پہلے وہ ایک اسلامی مذاکرے میں شامل ہوئے تھے اور جو کاغذات ایک ہلکے سبز فائل میں بندھے ہوئے وہ اپنے ساتھ لائے تھے وہ

اسی مذاکرے سے متعلق تھے۔ اس کے بعد وہ وزیر تعلیم سے ملے اور اپنے ادارے کی جو انہیں اپنی اولاد کی طرح عزیز تھا گرانٹ کے متعلق ان سے گفتگو کی۔ ان کے لاہور آنے کے بعد جب بھی میں ان سے ملا ہوں انہوں نے اپنے ادارے کی بات ضرور کی۔ اپنے رفقاء سے انہیں بے حد محبت تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے علم و فضل کا تذکرہ فخر سے کیا کرتے تھے۔ ادارے کے متعلق رات دن سوچا کرتے۔ ان کے منصوبے لمبے اور اہم تھے۔ مجھے یقین ہے کہ اگر موت انہیں کچھ بھی مہلت دیتی تو مجھ سے ادارے کی مالی ضروریات کا ضرور تذکرہ کرتے۔ اس روز میرے پاس ان کے آنے کا مقصد بھی یہی تھا۔

17

پاکستان کا ایک ممتاز فاضل

ڈاکٹر ایرک بتھ من

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم سے میری پہلی ملاقات بحمدون (لبنان) کی پہلی مسلم مسیحی کانوکیشن کے موقع پر ہوئی۔ ہمارے درمیان بہت جلد قریبی روابط پیدا ہو گئے۔ غالباً اس لئے کہ اکثر بنیادی مسائل پر ہمارے نظریات ملتے تھے۔ بعد میں دوسری ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تو اس امر کی اور بھی زیادہ تائید و توثیق ہو گئی۔ مشرقی و مغربی افکار پر ایک وسیع نظر کی بدولت ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم پر انسانی فطرت کی کمزوریوں اور حماقتوں کی حقیقت اتنی واضح ہو چکی تھی کہ جب ان کے رفقائے کار بڑھی چڑھی اور کھینچ تان کی باتیں کرتے تھے تو وہ ہلکے سے تبسم کے ساتھ ان سے صرف نظر کر لیتے تھے اور ان کی طبیعت میں کسی قسم کا میل نہیں آنے پاتا تھا۔ اُن کے مذہبی تصورات پر تعصب کا لیپ نام کو بھی نہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ لوگ جو حقائق و جذبات کے مابین بمشکل خط فیصل کھینچ سکتے تھے ان کی قوت ضبط و تحمل سے اثر پذیر

ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔

مسلم مسیحی تعاون کمیٹی کے سلسلے میں جب موصوف نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا دورہ کیا تو انہوں نے اسلام کی تعلیمات ایسے باوقار اور انسانیت پرور انداز میں پیش کیں کہ ان کے سامعین نے اچھا خاصا اثر قبول کیا۔ ان میں سے اکثر نے عمر بھر کسی مسلمان کو دیکھا یا سنا نہیں تھا۔

بلاشک و شبہ موصوف پاکستان کے ایک ممتاز فاضل تھے۔ قدرت نے ان کی شخصیت میں کچھ ایسے جوہر بھر دیئے تھے کہ وہ مذہبی تعلیمات کو ایسے خوش آئند اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے کہ دور حاضر کے جدت پسند ذہن بھی ان سے مطمئن ہو جاتے تھے۔

جب میں نے حال ہی میں یہ سنا کہ ڈاکٹر خلیفہ نے سفر آخرت اختیار کیا ہے تو غم و اندوہ سے میری طبیعت نڈھال ہوگئی۔ میں اس عظیم نقصان میں جو ان کی رحلت سے آپ کو اور آپ کے ملک کو پہنچا ہے آپ کے ساتھ برابر کا شریک ہوں۔ مجھے ذاتی طور پر بھی اس نقصان کا احساس ہے اور وہ اس لئے کہ میں اسلامی فکر سے آشنا ہونے کی خاطر اس فاضل جلیل سے مزید راہ و رسم پیدا کرنے کی فکر میں تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو پاکستان یا ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں پھر ملاقات کی صورت پیدا ہوتی۔

18

پاکستان کا ایک عظیم ترین فرزند

ڈاکٹر کچکینہ کاظمی

یہ عجیب حسنِ اتفاق تھا کہ اپریل ۱۹۵۲ء کے تیسرے ہفتے میں بین الاقوامی اپوا کانفرنس سے واپسی پر میں ایرانی مجلس خواتین کے ایک اجلاس میں پاکستان سے متعلق اپنے تاثرات کا اظہار کر رہی تھی۔ کانفرنس ہال حاضرین سے پر تھا لیکن اس میں پاکستانی سفارت کا ایک نمائندہ بھی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس اجلاس میں کسی پاکستانی کا سرے سے موجود نہ ہوتا میرے لئے ذہنی تشویش کا موجب تھا اور وہ اس لئے کہ میری تقریر کے سلسلے میں جو اہتمام کیا گیا تھا اس میں خصوصیت کے ساتھ پاکستان کے پریس اتاشی ڈاکٹر عرفانی کے تعاون کو دخل تھا اور ایرانی مجلس خواتین کے اجلاس میں پاکستان سے متعلق ایک ایرانی کی یہ پہلی تقریر تھی۔

تقریر ابھی اپنی ابتدائی منزل میں تھی اور میں پاکستان کی عام صورتحال کا نقشہ کھینچنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اس اثناء میں سامنے کے دروازے سے ڈاکٹر عرفانی ہال میں داخل

کی قدر افزائی موصوف نے جن پر خلوص احساسات کے ساتھ کی تھی ان سے میرے تاثر نے اس کمی کا کافی سے زیادہ تدارک کر دیا اور مجھے یہ موقع دیا کہ میں اس ہمسایہ ملک سے متعلق بلند تر تصورات کو اپنے دل و دماغ میں جگہ دوں۔ میں حسب منشاء ڈاکٹر خلیفہ سے رابطہ کلام کے مواقع حاصل نہیں کر سکی اور وہ اس لئے کہ موصوف کا قیام ڈاکٹر عرفانی کے پاس تھا اور وہ ایران کے ممتاز علماء و فضلا سے موصوف کی ملاقاتیں کرا رہے تھے کبھی موصوف کو اپنے ہمراہ لے جاتے اور کبھی ملاقات کے لیے ایرانی فضلا کو مدعو کرتے۔ میری انتہائی خواہش تھی کہ میں موصوف کو اپنے غریب خانہ پر مدعو کرنے کی سعادت حاصل کروں لیکن عرفانی کچھ اس بلا کی عجلت میں تھے کہ بات بنتی نظر نہیں آتی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ خدا نے یہ موقع مرحمت فرمایا ہے کہ ڈاکٹر خلیفہ کے توسط سے پاکستان اور ایران کے درمیان ادبی روابط مستحکم ہوں۔ موصوف کی تقریریں، خطابات اور رسمی گفتگو بھی دل نواز، سبق آموز اور اثر آفریں ہوتی تھی۔

ڈاکٹر خلیفہ ایران سے رخصت ہوئے لیکن خوشگوار و خوش کن یادیں وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے باقی رہ گئیں اور جیسے جیسے وقت گزرتا گیا پاکستان سے میرا ذہنی علاقہ اور قلبی رابطہ بڑھتا گیا۔ چونکہ میں بڑی غیر ادبی مذاق کی حامل ہوں اس لئے میں نے اپنے یہاں کے ہر دل عزیز انشاء پرواز سینیٹر (رکن مجلس مقننہ) حجازی سے درخواست کی کہ وہ ایران پاکستان کلچرل ایسوسی ایشن (پاک ایران ثقافتی انجمن) کا افتتاح کریں۔ انہوں نے میری تجویز سے اتفاق کیا اور میاں نسیم حسین اور ڈاکٹر عرفانی (جن کا نام اس ملک میں ہر شخص کی زبان پر چڑھا ہوا ہے) کے تعاون سے اس انجمن نے اپنا کام چالو کر دیا۔ اس انجمن کے جلسوں اور ثقافتی تقریبات کے لیے میں نے اپنے غریب خانہ کی پیشکش کی اور ہم نے ۱۹۵۵ء کے اوائل تک اپنی یہ ناچیز سرگرمیاں جاری رکھیں۔ یہ سال وہ ہے کہ ڈاکٹر عرفانی نے جوان تمام عملی سرگرمیوں کی قوت متحرکہ تھے ایران کو خیر باد کہا لیکن خوش قسمتی سے اس اثناء میں دونوں ممالک کے مابین سرکاری طور پر دوستانہ تعلقات کی پینگیں بڑھ چکی تھیں اور ایران و پاکستان زندگی کے مختلف شعبوں میں شانے سے شانہ ملا کر چل رہے تھے۔

ایک مرتبہ اور مجھے ایک عجیب قسم کی ذہنی تشویش لاحق ہوئی اور یہ اس وقت جبکہ ڈاکٹر خلیفہ کا ایک خط ملا جس میں مجھے اس غرض سے لاہور آنے کی دعوت دی گئی تھی کہ میں خصوصیت کے ساتھ خواتین کے حلقوں میں ایران کے ساتھ ثقافتی روابط کو فروغ دوں۔ میں

ہوئے اور میرا سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔ ان کی معیت میں ایک معمر شخص تھا جس کے تر و تازہ چہرے پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی اس کے بشرے پر وقار ٹپک رہا تھا اور اس کی شخصیت کچھ ایسی اثر آفرین تھی کہ ایرانی اس کی تعظیم اور پیشوائی کے لیے سروقد کھڑے ہو گئے اور اس کے لیے ایک نشست خالی کی۔ پاکستانی مہمانوں کی آمد سے قبل میں نے اپنی تقریر میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا مختصر الفاظ میں ان کا لب لباب پیش کیا اور قریب قریب ایک گھنٹے تک سادہ اور بے تکلف انداز میں اپنی تقریر کا سلسلہ جاری رکھا۔

تقریر کے بعد مجھے پاکستان کے مقتدر مہمان اور عظیم پاکستانی مفکر ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم سے متعارف کرایا گیا۔ موصوف ریاست ہائے متحدہ اور بعض دیگر ممالک کے تقریری دورہ کے بعد اپنے وطن کی جانب مراجعت فرما رہے تھے۔ پاکستان کی اس لافانی شخصیت سے میری ملاقات کا یہ پہلا اتفاق تھا اور عمر بھر مجھے اس شرف پر ناز رہے گا کہ موصوف ایسی لائق و فائق ہستی نے میری معروضات کی سماعت فرمائی۔ اس فاضل اجل اور بیدار مغز مفکر نے پورے 60 منٹ تک مجھ جیسی حقیر و عاجز مقررہ کی غیر مربوط تقریر بڑی خندہ پیشانی اور حوصلہ افزاء تبسم کے ساتھ سنی۔ ڈاکٹر خلیفہ میری تقریر سے بہت زیادہ متاثر نظر آتے تھے۔ حالانکہ یہ تقریر ان چند امور سے متعلق ایک سیدھا سادھا سا بیان تھا جن کا پاکستان میں میں نے بچشم خود مشاہدہ کیا تھا۔ میں نے اس تقریر میں نہ پرشکوہ الفاظ کا سہارا لیا تھا اور نہ فصاحت و بلاغت کے موتی بکھیرے تھے۔ موصوف نے بار بار میرا شکریہ ادا کیا اور ان الفاظ میں خراج تحسین بھی ادا فرمایا۔

"آپ نے سرزمین ایران کے باشندوں کے دل و دماغ میں خیر اندیشی و خیر سگالی کے جذبات بیدار کر دیئے ہیں۔ آپ کی پرخلوص اور بے لوث دیانت سے میں بہت زیادہ متاثر ہوا ہوں۔"

موصوف مسکرائے، ہنسے اور ایسے انداز میں بات چیت کی جس سے روحانی حرارت ٹپکی پڑتی تھی۔ کسی موضوع کی رعایت کے بغیر موصوف کی گفتگو سے ادبی اور روحانی ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ اس اجلاس میں پاکستانیوں کی عدم شمولیت کے باعث مجھے جو ذہنی تشویش ہوئی تھی اس کا احساس بالکل جاتا رہا۔ پاکستان کے ایک عظیم ترین فرزند اور علامہ اقبال کے ذاتی دوست سے میری ملاقات نے نیز پاکستان کا تعارف کرانے میں میری نیازمندانہ مساعی

نے اپنے دورہ کے پروگرام کا جائزہ لئے بغیر اس دعوت پر لبیک کہا۔ میرے لئے یہ شرف کیا کم تھا کہ خلیفہ صاحب نے مجھے مدعو کیا تھا اور یہ وہ ہستی تھی جس کی میری نظر میں بڑی قدرو منزلت تھی اور اس کے ملک سے بھی مجھے قلبی لگاؤ تھا۔

فروری ۱۹۵۷ء کے وسط میں، میں لاہور پہنچی۔ ڈاکٹر خلیفہ نے اپنی چند احباب کی معیت میں لاہور ریلوے اسٹیشن پر ذاتی حیثیت سے میرا خیر مقدم کیا۔ میری زندگی میں یہ ایک حد درجہ سبق آموز موقع تھا۔ ڈاکٹر اور بیگم خلیفہ نے مجھے اپنے کنبے کے ایک فرد کی حیثیت سے اپنے یہاں ٹھہرایا۔ اس معزز محترم جوڑے نے جس مشفقانہ التفات اور جس دوستانہ گرم جوشی سے میری خاطر مدارات کی اس نے مجھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا، مجھے کبھی کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ مجھ پر خواب و بیداری کی ملی کیفیت طاری ہے اور میں سوچتی تھی کہ:

ایں کہ می بینم بہ بیداری ست یارب یا بخواب

ڈاکٹر خلیفہ مجھے بنفس نفیس ہر جگہ ساتھ لئے لئے پھرتے تھے اور اس سے مجھ پر فرحت و انبساط کی ایسی کیفیت طاری ہوتی تھی کہ پہلے کبھی اس کی ہلکی سی پرچھائیں بھی مجھ پر نہیں پڑی تھی۔

گردو پیش کی ہر شے سے متعلق موصوف کے حکمت آمیز فقرے اور وہ اشعار جو موقع و محل کی مناسبت سے یا ایجاز و اختصار کی غرض سے آپ کبھی کبھی پڑھتے تھے میرے لئے سبق آموز بھی تھے اور دلچسپ بھی۔ آپ قریب قریب ہر موضوع پر اظہار خیال فرماتے تھے لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ میری ذہنی سطح اور میرے علمی پس منظر کا لحاظ بھی رکھتے تھے۔

ایک دن میں نے موصوف سے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ آپ ایسے فاضل اجل، مذہب اور فلسفہ مذہب کے ترجمان کی موجودگی میں مجھے اپنی کم مائیگی اور بے بضاعتی پر خفت سی محسوس ہوتی ہے۔ پدارانہ شفقت اور ہلکے سے تبسم کے ساتھ آپ نے میری بات کاٹتے ہوئے فرمایا۔

”لوگوں کا اسلام صرف زبانی اقرار تک ہے اور تمہاری زندگی اس کی تصدیق کر رہی ہے کہ تم مسلمان ہو۔“

یہ ایک عظیم ترین خراج تحسین تھا جو مجھ جیسی عورت کو جسے اہم مسائل درپیش ہیں ایسی ممتاز شخصیت نے ادا کیا جو بزرگ ترین اسلامی مملکت کے اسلامی ثقافتی مرکز کی قیادت

سنبھالے ہوئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ضمنی طور پر مجھ پر یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی کہ موصوف کی نظر کا دائرہ کتنا وسیع ہے۔ مذہب اور زندگی کے بارے میں موصوف کا حقیقت پسندانہ زاویہ نگاہ محدود نہ تھا۔ آپ کے نزدیک بہتر اور اعلیٰ زندگی روحانی تربیت کا نتیجہ ہے موصوف کے خیال میں مذہب چند تحریری قوانین اور چند عبادات پر منتہی نہیں ہوتا۔ یہ چیزیں تو بالکل ابتداء کی ہیں۔ مجھے موصوف کی معیت میں کچھ ایسا محسوس ہوا کہ روحانی، جذباتی اور ذہنی طور پر میرے تصورات ان کے تصورات سے ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔ موصوف کی مشفقانہ عنایت اور پدرانہ شفقت ہی تھی جس نے مجھے سنبھالا اور میرے اندر خود اعتمادی کی روح پھونکی۔ موصوف کی بدولت میرا یہ پختہ عقیدہ ہو گیا کہ انسان کی زندگی اتنی زیادہ المناک اور حرماں نصیب نہیں ہے جتنا کہ شعرا، مفکرین اور صوفیہ نے ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اگر کوئی اپنا زاویہ نظر بلند کر سکے تو اس سے زیادہ فرحت وانبساط کی اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ میں نے بھی دوسروں کی طرح لوگوں کو اولیاء اللہ اور ان کے خوارق عادات کا تذکرہ کرتے سنا ہے لیکن ان کا تعلق ماضی بعید سے ہوتا ہے یا مرحومین اور ان کے واقعات سے۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے ایک زندہ ولی کی زیارت کی ہے، ایسے ولی کی زیارت جو ایک عام انسان کی طرح اپنی زندگی بسر کرتا اور اسی فضا میں سانس لیتا ہے۔ یہ ولی ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم تھے ایک عظیم فلسفی، ایک فاضل اجل، ذہین وفطین عالم۔ آپ اتنی عظیم الشان شخصیت کے حامل تھے کہ آپ نے اپنے شجر علمی کی بدولت یہ جان لیا تھا کہ زندگی کی حقیقی قدریں موشگاف یا جوہر پاش فلسفہ سے متعین نہیں ہو سکتیں بلکہ ان کا تعین ایک سادہ اور ابتدائی پیمانہ، قلب انسان سے ہو سکتا ہے۔

موصوف کی رحلت پاکستان اور ایران کے لیے ایک عظیم قومی نقصان ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو موصوف سے راہ و رسم رکھتے تھے یہ ایک ذاتی نقصان بھی ہے۔ مجھے بھی مرحوم سے ملاقات کا شرف حاصل رہا ہے۔ یہ نقصان عظیم بھی ہے اور المناک بھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نقصان نے یہ حقیقت آشکار کر دی ہے کہ ایسی اخوت انسانی سے تعلق بہت بڑا اعزاز ہے جو خلیفہ عبدالحکیم جیسے انسانوں کو جنم دیتی ہے۔

ہے۔ اتنی بے پناہ دولت و ثروت ان ممالک کے حصے میں آتی ہے جو کبھی ختم ہونے میں نہیں آتی۔ قدرت انہیں سلطنت کا تحفہ اور ہیشگی کا تمغہ عطا کرتی ہے۔ جن ممالک میں چیدہ و برگزیدہ ہستیاں رونق افروز ہوتی ہیں، تعمیر و ترقی کی راہیں ان کے لیے کھل جاتی ہیں۔

اس نوع کی ایک اعلیٰ مثال خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کی شخصیت ہے جس کے وجود سے حیات اور توانائی کے شعلے بھڑکتے تھے۔ اسے ادب و کمال کے ایک مثالی پیکر سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ شخصیت ایک ایسا روشن صفحہ تھی جس کی حکمت کے نور سے زندگی کی راہیں چمک اٹھتی تھیں۔ اُس نے کردار، گفتار اور قلم کی طاقت سے جہالت کا سختی سے مقابلہ کیا اور باطل کو اپنے دبدبہ و جلال سے اس نے مرعوب کر دیا تھا۔ قدرت نے مجھے اور مرحوم کو اس دینی جہاد میں یکجا کر دیا تھا جو موتمر اسلامی و مسیحی میں پیش آیا تھا۔ یہ ایک عظیم ترین دینی موتمر تھی۔ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار مرحوم سے ملاقات کی۔ میں نے مرحوم کو مکارم و فضائل کا مجموعہ اور اعلیٰ ترین عادات و اطوار کی ایک دنیا پایا۔ موصوف کی شخصیت گویا تنویر علم اور کمال منطق یا بالفاظ دیگر علم و منطق کا ایک حسین امتزاج تھی۔ میں نے موصوف کی تالیفات و تصنیفات میں عمق فکر، کمال علم اور بلاغت تحریر کی نمایاں خصوصیات دیکھی ہیں۔ مرحوم کی بقاء کے لیے آثار علم اور صالح اعمال کا ترکہ کافی ہے۔ اگر آج ہم مرحوم کی رحلت پر اظہار تاسف کرتے ہیں تو صرف اس لئے کہ آپ ایک فقید المثال فلسفی اور ایک عدیم النظیر حکیم تھے۔ مرحم کی جدائی کا قلق شدید ہے اور دل و دماغ اس سے بے حد متاثر ہوئے ہیں۔ لیکن کیا کیا جائے کارکنان قضا و قدر جسے چاہتے ہیں منتخب کر لیتے ہیں اور انہیں اس بات کی مطلق پروانہیں ہوتی کہ اس انتخاب سے ابنائے آدم کتنے عظیم نقصان سے دوچار ہوں گے۔

19

ایک باکمال شخصیت

شیخ علی کاشف الغطاء

حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے ممالک اپنے مادی وجود، اپنی صنعتی و صناعتی عظمت اور اپنے طبیعی حسن و جمال پر ہی فخر نہیں کرتے بلکہ ان کے علاوہ بھی اگر وہ نازاں ہیں تو اپنی اس دولت پر جسے رفعت فکر، عظمت ادب اور کمال علم و فضل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ علم و فضل کا وہ چشمہ جس سے دنیا میں یمن وسعادت کے سوتے پھوٹ نکلتے ہیں اور گلستان ادب کا وہ پھول جو تعمیر و ترقی کی ہوا کے جھونکوں سے کھلتا اور جس کی مہک لہک سے انسانی معاشرہ کی روح اہتزاز کرتی ہے، گھنے باغوں، زمین پر نور چھڑکتے ہوئے سبزہ زاروں، دبے ہوئے خزانوں اور بیش قیمت وسائل حیات سے بھرپور زمین کے خطوں سے کہیں بہتر ہیں...... وہ ممالک قابل قدر ہیں جو ایسے ممتاز افراد پر ناز کرتے ہیں جن کے بل بوتے پر انہیں عروج و کمال کی سعادتیں نصیب ہوتی ہیں نہ صرف یہ بلکہ صفحہ تاریخ پر ان کے خلود و دوام کی مہر ثابت جاتی

21

یادگار ملاقاتیں

ڈاکٹر جوزف شاخت

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے میں صرف ایک ہی مرتبہ ملا اور یہ موقع بین الاسلامی مجلس مذاکرہ کا تھا۔ جو دسمبر 1959ء جنوری 1960ء میں لاہور میں منعقد ہوئی تھی۔ کاش مجھے ان سے پھر ملنے کے مواقع ملتے۔ میرے دل میں ان کی یاد اور قدر و منزلت ہمیشہ باقی رہے گی اور میں اس یادگار استقبالیہ کو بھی فراموش نہیں کر سکتا جو انہوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ترتیب دیا تھا۔

22

خلیفہ عبدالحکیم کی صداقت شعاری

ڈاکٹر لوئی مارسینو

اقبال سے میرے دوستانہ مراسم کے طفیل اور اس رابطہ اتحاد کی بدولت جو ہمیں مسلم مسیحی تعاون کے سلسلے میں گارلینڈ ایوانز ہاپکنسن کی مساعی جلیلہ سے تھا مجھے لاہور میں اسلامی مذاکرہ کے دوران ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم سے ملنے اور ملاقات کے ساتھ ہی ساتھ ہی یہ جائزہ لینے کے مواقع حاصل ہوئے کہ موصوف نے اس بین الاقوامی نصب العین کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کیا کچھ خدمات انجام دی ہیں۔ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اس ملاقات کے دوران اس فاضل اجل کی شخصیت نے میرے ذہن پر اچھا خاصا اثر چھوڑا ہے۔

چونکہ جدید سائنسی ترقی کا موصوف نے قریب سے جائزہ لیا تھا اس لئے وہ میرے خیال کے مطابق بعض اوقات بڑی تیزی سے قدم اٹھاتے تھے کیونکہ راسخ العقیدہ قدامت پرست افراد کی دخل اندازی انہیں پیش قدمی سے روکتی تھی۔ لیکن موصوف کا دل انسانی ہمدردی

کے جذبات سے لبریز تھا اور ہر قیمت پردہ تحقیق حق کے درپے تھے چنانچہ اس خیال کے باوجود کہ وہ اپنے مقاصد کی تکمیل میں کسی قدر عجلت پسند واقع ہوئے تھے، ان کی روشن خیالی اور صداقت شعاری کی قدر و منزلت کا اعتراف ناگزیر ہے۔

میں اس احساس غم واندوہ کا دلی احترام کرتا ہوں جو ان کے اعزہ اقربا اور احباب کو دامن گیر ہے۔ اللہ اکبر۔

23

ایک روشن خیال مفکر اسلام

ڈاکٹر صادق رضا زادہ شفق

مسلم مسیحی تعاون کے سلسلے میں بیروت (لبنان) میں جو کانفرنس ۱۹۵۷ء میں منعقد ہوئی تھی مجھے اس کے اجلاس میں اپنے مرحوم دوست خلیفہ عبد الحکیم سے ملاقات کا اعزاز حاصل ہوا۔ پہلی چند ملاقاتوں میں ہمارے درمیان دوستانہ روابط کی بنیاد پڑ گئی کیونکہ انہوں نے ایسا مزاج پایا تھا جو دوستی کے لیے بے حد سازگار تھا۔ ملاقات کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ موصوف وسیع المعلومات شخصیت کے حامل اور سرتاپا ثقافت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ موصوف صحیح معنی میں ایک جدید الخیال مفکر اسلام تھے۔ میرے خیال میں ان کی اہم اور امتیازی خصوصیت یہ تھی کہ وہ رواداری کا جذبہ رکھتے تھے اور دوسرے اشخاص کے خیالات کی قدر و منزلت کا احساس بھی ان کے اندر کچھ کم نہ تھا۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں بمقام لاہور جو اسلامی مذاکرہ ہوا تھا اس میں انہوں نے اپنے رجحانات بڑی خوبصورتی سے پیش کیے تھے۔

گرما گرم بحثوں میں جو تعصب سے خالی نہ ہوتیں، میں نے انہیں اعتدال پسند پایا۔ وہ ہمیشہ اپنے مسیحی احباب کو دینی مسائل پر اظہار خیال کا بڑی فراخ دلی سے موقع دیتے تھے۔ چونکہ موصوف نے آفاقی ذہن پایا تھا اس لئے انہوں نے قرآن حکیم کی تعلیمات میں بھی آفاقی رجحانات کی سراغ رسانی کی تھی۔ موصوف کی تصنیف اسلامک آئیڈیالوجی میں یہ حقیقت واشگاف نظر آتی ہے۔ یقیناً وہ ایک منور الفکر عبقری اور ایک ایسے حقیقت پسند مفکر تھے جو حقیقت کبریٰ پر پُرخلوص ایمان رکھتے تھے۔ ان کی دلی اور مخلصانہ کوشش یہ تھی کہ ارباب عقل و دانش اس صراط مستقیم پر گامزن ہوں جس کی نشاندہی مذہب نے کی ہے۔ وہ ایسے مذہب کے قائل نہ تھے جس کا دائرہ تعصّبات وتوہمات نے تنگ کر دیا ہے۔ موصوف نے یہ حقیقت واضح کرنے کی سعی بلیغ کی کہ اسلام وہ دین ہے جس نے عالمگیر صداقت کا درس دیا ہے اور اس کا مقصد وحید یہ ہے کہ نسل انسانی تعصب، جہالت، افتراق اور عقل دشمن خیالات سے دامن کش ہو۔ موصوف نے اپنی تصنیفات میں اپنے عقیدہ کی شرح و بسط کے ساتھ وضاحت کی ہے۔ ان بین الاقوامی اجتماعات میں جہاں مجھے بھی رفاقت کی سعادت نصیب ہوئی ہے میں نے کھلی آنکھوں دیکھا کہ وہ اپنے نصیب العین پر بڑی مضبوطی کے ساتھ کاربند ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ تعاون کے حقیقی جذبہ کے ساتھ صداقت کی دیانتداری سے جستجو کی جائے۔ آخر میں یہ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ موصوف کے اندر ظرافت کوٹ کوٹ کے بھری ہوئی تھی اور ان کے احباب و رفقا ان کی بذلہ نجی اور خوش طبعی سے لطف اندوز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ ہر شخص کے دل میں گھر کر لیتے تھے۔

24

خلیفہ عبدالحکیم کے مذہبی خیالات

فری لینڈ کے۔ ایبٹ

میرے لئے یہ امر اعزاز و شرف کا موجب ہے کہ میں نے قریب قریب ایک سال کی مدت خلیفہ عبدالحکیم کی معیت میں طالبعلمانہ حیثیت سے بسر کی ہے۔ وہ ادارہ ثقافت اسلامیہ کے احاطہ باغ میں اور کبھی اپنے دار المطالعہ میں رونق افروز ہوتے تھے۔ کبھی ہنسی خوشی باتیں کرتے اور کبھی صبر آزما انہماک کے ساتھ وہ مسائل حل کرتے جو میری ذہنی تشویش کا سبب بنے ہوئے تھے۔ وہ یہ شک رفع کرنے کے لیے کہ انہوں نے کہیں کھینچ تان کر تو مطلب نہیں نکالا ہے عربی لفظ کی خوب چھان پھٹک کرتے تھے۔ وہ قرآن کریم کا عمیق مطالعہ کرتے تھے اور یہ اس لئے کہ انہیں یہ پختہ یقین تھا کہ نزول قرآن کا منشاء ہی یہ ہے کہ اسے پڑھا جائے۔ ان کے ایمان باللہ کا تصور یہ تھا کہ اس کی ذات حدود و قیود سے ماورا ہے۔ اس کی حکمت و مؤدت کا دائرہ بھی لامحدود ہے۔ زہد و کشف کے جو ضابطے اس کی ذات سے

منسوب ہیں ان سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کو ہمیشہ اس بات کا خیال رہتا تھا کہ ان کی باتیں سمجھنے میں کہیں کسی کو کوئی الجھن تو نہیں ہے، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ان کی باتیں عقل کی کسوٹی پر پوری نہ اترتی ہوں۔ بالعموم وہ یہ فرمایا کرتے تھے "کیا یہ مسئلہ واضح نہیں ہو گیا؟" "کیا اس کا مفہوم کچھ اور بھی ہے؟" یہ وہ مستقل سوالات تھے جو قرآنی عبارات اور ان کی تصریحات سے متعلق اکثر دریافت کیا کرتے تھے۔

وہ انتہا درجے کے مذہبی انسان تھے لیکن ان کا اندازِ فکر فلسفیانہ تھا۔ لفظی موشگافی سے ان کی طبع سلیم ہمیشہ ابا کرتی تھی۔ مذہب سے متعلق ان کا تصور کچھ اس انداز کا تھا کہ وہ کوئی ایسی بات گوارا نہیں کرتے تھے جس سے شان الوہیت دوبالا نہ ہوتی ہو۔ اصول پرستی اور رسوم و قیود کے محلات میں وہ خدا کو محصور کر دینا نہیں چاہتے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ حقیقی مذہب وہ ہے جس کا پیغام آفاقی ہو اور ہمیشہ ان کی نظر آفاقیات ہی پر رہتی تھی۔ وہ فرمایا کرتے کہ محض زبانی اقرار کر لینے سے قرآن حکیم کو ذکر للعالمین نہیں کہا جا سکتا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے ان مفاہیم و مطالب کا استقصا کیا جائے جن پر آفاقیت کی چھاپ ہو۔ اس قسم کی دریافت ہر مسلمان کے فرائض و حقوق میں داخل ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم سید احمد خاں کے مکتب خیال کی پیروی کرتے تھے۔ سر محمد اقبال کے کلام اور پیغام پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ وہ سلیم الطبع مفکر اور ایک ایسے محقق تھے جنہیں ہمیشہ حق و صداقت کی جستجو رہتی تھی۔ اس اعتبار اور اس لحاظ سے ان کی گرم جوش شخصیت کی یاد میرے ذہن اور حافظے میں تازہ رہے گی۔

ودیعت کی ہیں اور مزید برآں دینی اقدار کی قدر و منزلت کا شدید احساس بھی ان پر غلبہ پائے ہوئے ہے۔

میں موصوف کی تقریر سے بہت زیادہ متاثر ہوا تھا اور اس تاثر کا سبب یہ تھا کہ مجھے پہلی بار یہ علم ہوا کہ اسلام اور مسیحیت کے اصولوں میں کتنی ہم آہنگی ہے۔ میرے لئے انکشاف حیرت و استعجاب کا موجب تھا کہ وہ ان امتیازات و اختلافات کی سطح سے کتنے بلند ہیں۔ جنہوں نے انسانی معاشرہ کا شیرازہ منتشر کر دیا ہے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنے اعلیٰ تصورات کے حامل ہیں کہ ان کی نظر عصر حاضر کے دھندلکوں کا دامن چاک کرتی ہوئی روشن مستقبل کے دریچوں پر دستک دے رہی ہے۔ موصوف نے فرمایا کہ قدرت کا ہم سے یہ مطالبہ ہے کہ ہم دنیا کو اپنی کوششوں سے بہشت منظر بنانے میں اس کے ساتھ تعاون کریں۔ بعد میں ہماری ملاقاتیں امریکہ اور دنیا کے مختلف حصوں میں ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ وہ ان عوائق و موانع کے باوجود جو پست سطح کے اشخاص کی رفتار ترقی روک دیتے ہیں قدرت کے ساتھ رضا کارانہ تعاون میں پیش پیش نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم سے چند سال قبل پرنسٹن یونیورسٹی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ یہاں میں ان ایام میں جب کہ موصوف ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے عظیم ثقافتی مراکز کے دورہ پر تھے علوم مشرقیہ کے شعبہ میں معلمانہ فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ اس شعبہ کے چیئرمین کو اور مجھے ان کے ساتھ شرکت طعام کا اتفاق ہوا اور اس کے بعد فیکلٹی لونج کے پرسکون گوشے میں قہوہ پینے کے لیے رخصت ہوئے جہاں ہم نے کچھ دیر لمبی بحث ونظر میں حصہ لیا۔ موصوف کی اثر آفریں شخصیت نے ہم سے خراج تحسین وصول کیا۔ اس وقت سے ان کی یاد کے نہ مٹنے والے نقوش میرے لوح دماغ پر مرتسم رہے ہیں۔ میں موصوف سے اپنے روابط کی تجدید چاہتا تھا کہ بصد حسرت وغم مجھے یہ اطلاع ملی کہ موصوف راہگرائے عالم بقاء ہو گئے ہیں۔ ان کے ملک، مشرقی ثقافت اور تمام عالم میں پھیلے ہوئے ان کے احباب کے لیے یہ نقصان کتنا عظیم نقصان ہے!

25

ڈاکٹر خلیفہ کے حکیمانہ تصورات

ڈاکٹر عزیز ایس۔ عطیہ

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم مرحوم سے اگرچہ مجھے دیرینہ نیاز حاصل نہیں رہا اور اس اعتبار سے مجھے اُن کے قدر دانوں کی صف اوّل میں جگہ نہیں مل سکتی، تاہم مجھے اس چیز کا اعتراف ہے کہ ڈاکٹر حکیم کے ان تھک جذبہ خیر اندیشی اور روح اسلام سے متعلق ان کی فراخدلانہ اور انسانیت نواز تصریحات کے مثالی انداز نے نہ صرف میری معلومات میں قیمتی اضافہ کیا ہے بلکہ میرے اکثر ارباب وطن کو اپنا گرویدہ بنالیا ہے۔

مجھے خوب یاد ہے کہ 1957ء میں بمقام بجمدون (لبنان) پہلی مسلم مسیحی کانوکیشن کے دوران ڈاکٹر حکیم سے میری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ اس کانوکیشن میں موصوف نے اس موضوع پر اظہار خیال کیا تھا کہ نئی پود میں روحانی قدریں اجاگر ہونی چاہئیں۔ ان کی شخصیت اور ان کی تقریر کا انداز یہ کہے دے رہا تھا کہ ان میں ایک معلم کی اعلیٰ صفات قدرت نے

26

خلیفہ صاحب کی علمی زندگی

پروفیسر حمید احمد خان

24 جنوری 1959ء کی شام کا ذکر ہے کہ وارث روڈ (لاہور) کے ایک پُرسکون مکان میں چند اہل علم اور کچھ اہل ذوق لوگ شام کے کھانے پر جمع تھے۔ مجمع مختصر تھا مگر منتخب اور منتخب کیوں نہ ہوتا جب میزبان ادارہ ثقافت اسلامیہ کے ڈائریکٹر جناب ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم تھے۔ خلیفہ صاحب کے مہمان نام کو دعوت طعام پر مگر دراصل خلیفہ صاحب کے لطف کلام سے بہرہ اندوز ہونے کے لیے یہاں پہنچے تھے۔ موضوع گفتگو اس قسم کے سوالات تھے کہ تصوف کیا ہے؟ تصوف اور دین میں کیا رشتہ ہے؟ سائنسی انکشافات کی روشنی میں تصوف کی واردات کی کیا حقیقت ہے......؟ یہ اور اس قسم کے اور بہت سے سوالات کئے گئے مگر اس خصوصیت کے ساتھ کہ ہر ایک سوال کا رخ صاحب خانہ کی طرف تھا۔ خلیفہ صاحب نے ان مسائل پر روشنی ڈالنے کے لیے بڑی مبسوط، بڑی مدلل، بڑی حکیمانہ تقریر کی۔ پوچھنے والے اور

بھانے والا دوران گفتگو ایک استغراق کے عالم میں تھے۔ ایک گھنٹہ گزر گیا [illegible] گھنٹہ۔۔۔۔ دو ڈھائی گھنٹے۔۔۔۔ علم و فضل کا وہ [illegible] اسی طرح اہل [illegible] رواں تھا [illegible] مادی دنیا کے ہنگامے سے بالکل الگ اور مستغرق [illegible] صرف علم [illegible] کچھ پہلے یہ محفل برخاست ہوئی تو ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم کے یہاں [illegible] آپ سے ایک سوال کر رہے تھے۔ کیا ہزار برس پہلے عہد عباسیہ کے بغداد کے علماء [illegible] میں ایسی محفلیں قائم نہیں کرتے تھے؟ کیا ڈھائی ہزار برس پہلے یونان کے فلسفی [illegible] یہاں اسی لہجے میں اہل ذوق کو نہیں جانچا کرتے تھے؟ اور اس سوال کا جواب ہر [illegible] اثبات میں دے رہا تھا۔ سچ یہ ہے کہ وہ شام خلیفہ صاحب کے ذہن کی بلندی اور گہرائی اور ان کی گفتگو کی روانی اور برجستگی رہ رہ کر خود اپنے آپ پر سبقت لے جا رہی تھی۔

اس ہمیشہ یاد رہنے والی شام کو ابھی پورا ایک ہفتہ نہیں گزرنے پایا تھا کہ دنیا کی بے ثباتی نے اعلان کیا کہ علم و حکمت کا آفتاب غروب ہو گیا۔ زندگی کی مضطرب لہر ایک دم ساحل سے لگ کر سو گئی۔ تبسم کی ہلکی سی لرزش ان ہونٹوں پر جم کر رہ گئی جو انسانی بات چیت کے لیے اب کبھی حرکت میں نہ آئیں گے۔۔۔۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم 26 جنوری کو اسلام کے متعلق ایک علمی مذاکرے میں شرکت کے لیے لاہور سے کراچی روانہ ہوئے۔ کراچی پہنچ کر وہ حسب معمول ملاقاتوں، لطیفوں اور نکتہ سنجیوں میں گھرے رہے۔ اسی حالت میں 30 جنوری کو دن کے ایک بجے انہیں دل میں کچھ گھبراہٹ سی معلوم ہوئی اور سوا بجے وہ تمام تمام گھبراہٹ کی آلائش سے پاک ہو کر صرف اپنے نفس مطمئنہ کو لیے دارالبقاء میں جا پہنچے۔

خلیفہ عبدالحکیم خود اپنے قول کے مطابق 1894ء میں لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد خلیفہ عبدالرحمن پشمینے کے تاجر تھے اور اپنی اولاد میں خلیفہ عبدالحکیم کو ان کی ذہانت اور شوق مطالعہ کے باعث سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ عبدالحکیم شیراں والے دروازے کے اسلامیہ ہائی سکول میں داخل ہوئے۔ یہاں عمر کے بارھویں برس میں تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ اسی مدرسے سے 1911ء میں پنجاب یونیورسٹی کا میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسی سال علی گڑھ جا کر ایف۔ اے میں داخل ہوئے۔ اس وقت تک انہیں تقریر کا بہت اچھا ملکہ حاصل ہو چکا تھا۔ ابھی سال اوّل میں تھے کہ ایم۔ اے۔ او کالج کے ایک تقریری مقابلے میں حصہ لیا۔ اس مقابلے میں بی۔ اے کے طلبہ بھی شامل تھے مگر خلیفہ عبدالحکیم کو پہلا انعام حاصل ہوا۔

1913ء میں الہ آباد یونیورسٹی سے ایف۔ اے کے امتحان میں کامیاب ہوکر دلی چلے گئے۔ اب انہیں فلسفے سے انتہائی شغف پیدا ہو چکا تھا اور فلسفے کا حسب دلخواہ استاد سینٹ اسٹیفنز کالج دلی میں تھا۔ چنانچہ 1915ء میں سینٹ اسٹیفنز کالج سے پنجاب یونیورسٹی کا بی۔ اے اور بعد میں اسی کالج سے فلسفے میں ایم۔ اے کیا۔ ان کے ایم۔ اے کے ممتحنوں میں علامہ اقبال بھی ایک ممتحن تھے اور خلیفہ صاحب ہمیشہ اس بات پر فخر کرتے رہے کہ اس خاص پرچے میں انہوں نے اونچے نمبر پائے تھے۔

دلی سے ایم۔ اے کر کے خلیفہ عبد الحکیم لاہور چلے آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ایل ایل۔ بی کی سند حاصل کی۔ مگر وکالت کا کام شروع نہیں کیا۔ کچھ عرصہ خواجہ احد شاہ کے انگریزی اخبار ''پنجاب آبزرور'' کی ادارت سے منسلک رہے۔ ابھی وہ کسی مستقل کام کی تلاش ہی میں تھے کہ اگست 1919ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کالج قائم ہوا اور وہ اس کالج میں فلسفے کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہو کر حیدر آباد دکن چلے گئے۔ اس کے بعد ان کی زندگی کا بہت بڑا حصہ وہیں گزرا۔ لیکن بیچ میں مختلف قسم کے وقفے بھی آتے رہے۔ سب سے پہلے وہ 1922ء میں یورپ گئے۔ وہاں انہوں نے فلسفۂ رومی پر تحقیقی کام کیا اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری لی۔ 1925ء میں ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم بن کر حیدر آباد واپس آئے اور واپسی پر عثمانیہ یونیورسٹی کالج کے پروفیسر اور صدر شعبہ فلسفہ مقرر ہوئے۔

یورپ سے واپس آنے کے بعد خلیفہ صاحب نے اٹھارہ برس کا عرصہ علمی اور تعلیمی مشاغل میں صرف کیا۔ جو لوگ اس زمانے میں ان کے درس سے فیض یاب ہوئے ان میں شامل ہونے کی عزت مجھے بھی حاصل ہوئی۔ بی۔ اے میں تاریخ فلسفہ کا بڑا حصہ میں نے خلیفہ صاحب سے پڑھا۔ اسی زمانے میں انہوں نے ویبر کی ''تاریخ فلسفہ'' کا اُردو ترجمہ کیا۔ عثمانیہ یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم اردو تھا۔ اسی لئے خلیفہ صاحب کے لکچر اردو میں ہوئے تھے۔ لیکن اردو کی درسی کتاب میں نے کبھی ان کے سامنے نہیں دیکھی۔ مجھے کانٹ پر ان کے لکچر خصوصیت سے یاد ہیں۔ THE CRITIQUE OF PURE REASON کا اصل جرمن ایڈیشن ان کے سامنے پڑا رہتا تھا۔ جرمن عبارت کو وہ برجستہ اردو میں منتقل کر کے کانٹ کے مطلب کی تشریح کرتے تھے اور اس تشریح میں ایک خاص لطف یہ ہوتا تھا کہ خلیفہ صاحب نہ صرف کانٹ میں بلکہ خود اپنے آپ میں ڈوب کر بات کرتے تھے۔ رومی اور

سعدی، حافظ، غالب اور اقبال کے بے شمار اشعار انہیں یاد تھے۔ کانٹ کے مابعد الطبعی فلسفے کی شرح ''در حدیث دیگراں'' سن کر ایک عجیب کیفیت پیدا ہوتی تھی اور خود خلیفہ صاحب اس کیفیت میں سرشار نظر آتے تھے۔

1943ء میں خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے حیدر آباد دکن سے عارضی رخصت لی اور عثمانیہ یونیورسٹی میں اپنی واپسی کا حق برقرار رکھ کر کشمیر چلے گئے۔ یہاں پہلے امر سنگھ کالج سری نگر کے پرنسپل اور پھر ریاست کے ناظم تعلیمات مقرر ہوئے۔ خلیفہ صاحب کا ارادہ کشمیر میں مستقل سکونت اختیار کرنے کا تھا چنانچہ انہوں نے سری نگر میں نسیم باغ کے قریب اپنے لئے ایک مکان تعمیر کیا۔ لیکن جس طرح آباؤ اجداد ہجرت کر کے لاہور پہنچے تھے اسی طرح خلیفہ صاحب نے بھی 1947ء میں کشمیر سے ہجرت کی اور دوبارہ حیدر آباد دکن آ گئے۔ 47ء میں عثمانیہ یونیورسٹی کے میر شعبہ فنون DEAN OF THE FACULTY OF (ARTS) مقرر ہوئے۔ 49ء میں پاکستان چلے آئے۔

49ء سے 59ء تک ان کی زندگی کا آخری اور شاید سب سے زیادہ گراں بہا دور ہے۔ انہوں نے لاہور میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم کیا اور اس ادارے کی تنظیم و ترقی میں کوشاں رہے۔ اس دوران میں ان کے قلم سے انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں نہایت بلند پایہ علمی و ادبی کتابیں نکلیں۔ ISLAMIC IDEOLOGY خصوصیت سے مقبول ہوئی۔ 'فکر اقبال' اس خاص موضوع پر ہمیشہ مستند کتاب مانی جائے گی۔ افکار غالب نے غالب کے مضامین کی شرح ایک نئی طرز پر کی۔ حکمت رومی مولانائے روم کے افکار اور نظریات کی بڑی دلکش اور حکیمانہ تشریح ہے۔ خلیفہ صاحب نے ولیم جیمز کی VARIETIES OF RELIGIOUS EXPERIENCE کا شستہ ترجمہ بھی بڑی محنت سے مکمل کر کے شائع کیا۔

عالم فکر و تحریر کی ان کاوشوں کے ساتھ دینی، علمی اور قومی خدمت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ فقہی مسائل پر حکومت کی طرف سے جو کمیشن مقرر ہوتے رہے خلیفہ عبدالحکیم صاحب اپنے تفقہ، تحکیم اور وسیع النظری کی بناء پر ان میں شامل کئے جاتے رہے اور مفید خدمت انجام دیتے رہے۔ ثقافتی موضوعات پر خطبات دینے کے لیے امریکہ بھیجے گئے اور کامیاب واپس آئے۔ اس عرصے میں وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی کے عہدے کی پیشکش دو تین مرتبہ

ہوئی۔ لیکن اپنے علمی مشاغل کے ساتھ اس منصب کے فرائض کو ہم آہنگ کرنا خلیفہ صاحب کو مشکل نظر آیا۔ 1957ء کے کانووکیشن میں یونیورسٹی نے انہیں ایل ایل ڈی کی اعزازی ڈگری دی اور حقیقیت یہ ہے کہ اس طرح خود اپنا وقار بڑھایا۔ خلیفہ عبدالحکیم صاحب بطور ایک عالم کے وسعت مشرب کے لیے اپنی مثال آپ تھے۔ دین اسلام سے دلی محبت رکھنے کے باوجود دوسرے مذاہب کی خوبیوں کے منکر نہ تھے۔ سچے پاکستانی تھے مگر دنیا کے تمام ممالک کے لیے ہمدردانہ جذبہ رکھتے تھے۔ ان کی انسانی دوستی اور سلامت طبع کا یہ عالم تھا کہ کٹر ملائیت اور حد سے بڑھی ہوئی مغرب پسندی دونوں کبھی کبھی ان کے مسلک پر ناک بھوں چڑھاتی تھیں۔ لیکن وہ ایک آفاقی شخصیت تھے، جسے ان جھگڑوں سے سروکار نہ تھا:

درویش خدا مست نہ مشرقی ہے نہ غربی

خلیفہ صاحب کی ہمہ دانی، ہمہ گیری، ہمہ شناسی کے سامنے ان کی ذاتی محبت و شفقت کبھی ماند نہ پڑی۔ اتنی گہری علمیت کے ساتھ اتنی شفقت شاذونادر جمع ہوتی ہے۔ بہت کم لوگوں نے ان کو غصے کی حالت میں دیکھا۔ ان کا تبسم ان کی فطرت کا ایک بنیادی رنگ تھا اور ان کی خوش مزاجی سے بعض دفعہ لوگ گھبرا اٹھتے تھے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ خلیفہ صاحب کو انسان دوستی اور خیر سگالی کا ایک نہ ختم ہونے والا خزانہ ملا تھا جسے وہ بڑے اسراف سے لٹاتے تھے لیکن اس میں پھر بھی کمی نہ آتی تھی۔

27

خلیفہ صاحب کی علمی خدمات

بشیر احمد ڈار

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم کشمیریوں کے ایک متوسط خاندان میں گیارہ جولائی 1894ء کو لاہور میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا جو کشمیر سے ہجرت کر کے لاہور میں آباد ہوئے تھے پشمینہ کا کام کرتے تھے۔ گھر کا ماحول مذہبی تھا اور ان کی وابستگی کا مرکز چیپیانوالی مسجد تھی۔

خلیفہ صاحب نے ابتدائی تعلیم اسلامیہ ہائی سکول شیرانوالہ دروازہ، لاہور میں حاصل کی۔ اس کے بعد دو سال تک علی گڑھ میں تعلیم پائی اور پھر سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل ہوئے جہاں سے انہوں نے 1917ء میں فلسفہ میں ایم۔ اے کیا اور پنجاب بھر میں اوّل رہے۔ امتحان میں انہوں نے جو مقالہ پیش کیا وہ رومی کے فلسفہ سے متعلق تھا جس کی ایک کاپی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ رہے۔ 1919ء میں انہوں نے ایل ایل۔ بی پاس کیا اور اُسی سال عثمانیہ یونیورسٹی میں بطور لیکچرار فلسفہ ان کا تقرر ہو گیا۔ 1922ء میں وہ

اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ گئے اور ہائیڈل برگ یونیورسٹی سے پی۔ ایچ ڈی حاصل کی۔ ان کا مقالہ ''مابعد الطبیعیات رومی'' مولانا روم کے فلسفہ پر بہترین کتاب ہے جو بعد میں 1933ء میں پہلی بار لاہور سے شائع ہوئی۔ ان کی عمر کا بہترین حصہ حیدر آباد دکن کی علمی فضا میں گزرا جہاں وہ سیاست سے بالکل الگ تھلگ علم کی تحصیل و ترویج میں مشغول رہے۔ 1943ء میں وہ ریاست جموں اور کشمیر میں بطور ڈائریکٹر تعلیمات مقرر ہو کر گئے۔ لیکن جلد حیدر آباد واپس پہنچ گئے۔ جہاں سے وہ 1946ء میں ریٹائر ہو گئے۔

خلیفہ مرحوم نے فیصلہ کیا کہ باقی ماندہ زندگی کشمیر کے پر فضا ماحول میں بسر کی جائے۔ چنانچہ انہوں نے نسیم باغ میں کافی وسیع و عریض زمین خرید کر ایک دلکش بنگلہ تعمیر کرایا۔ لیکن 1947ء کے بعد سیاسی حالات بگڑنے کے باعث وہ لاہور میں آ کر آباد ہو گئے۔ بعد میں جب کبھی وہ اس ترک مکانی کا ذکر کرتے تو انہیں اس مکان کے نقصان سے زیادہ اس لائبریری کے ضائع ہونے کا غم تھا جس کو وہ اپنی ساری علمی زندگی کا سرمایہ سمجھتے تھے۔

مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کا صحیح اور اصلی مقصد یہ تھا کہ اسلامی نظریات کو عملی شکل دینے کی کوشش کی جائے اس مقصد کے حصول کے لیے بقول اقبال تطہیر فکر کی انتہائی ضرورت تھی۔ مغربی علوم کی ترویج سے مسلمان نوجوان کا ذہن لادینیت سے مسموم ہو چکا تھا اور اس لئے اسلام کی قدیم تعبیر اس کے لیے بے کار ہو چکی تھی۔ اسلام کی خوبیوں کے نظری اعتراف کے باوجود اس کے عملی فوائد سے مایوس ہو چکا تھا۔ اس ذہنی انقلاب کو پیدا کرنے کے لیے لاہور میں 1950ء میں ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی گئی اور اس کے پہلے ڈائریکٹر خلیفہ عبدالحکیم مقرر ہوئے۔ انہوں نے اس عظیم الشان مقصد کو پیش رکھتے ہوئے سب سے پہلے انگریزی میں ایک کتاب ''اسلام کا نظریہ حیات'' لکھی۔ یہ کتاب اپنے موضوع کے لحاظ سے پاکستان میں سب سے پہلی کامیاب کوشش تھی۔ جس میں اسلام کے بنیادی اصولوں کو جدید فکر و فلسفہ کی روشنی میں پیش کیا گیا تھا۔ اس کی زبان بالکل سادہ تھی اور اس کا اولیں مخاطب وہی مغربی تعلیم یافتہ گروہ تھا جس کے قلب کے اندر اسلام سے وابستگی ضرور موجود تھی لیکن جو اسے جدید سائنسی طرز فکر کی اصلاحات کے بغیر عقلی طور پر ماننے کے لیے تیار بھی نہ تھا۔ اسلامی اصولوں کی بنیاد پر جو اخلاقی، اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی تخیلات اور عوامل بروئے کار آ سکتے تھے ان کی بھی مفصل وضاحت کر دی گئی۔

لیکن جدید زمانے میں نہ صرف اسلام بلکہ ہر ایسے نظام فکر کے لیے جس کی بنیاد خدا پر ایمان اور چند اخلاقی اور روحانی اقدار کے اقرار پر مبنی ہے، اشتراکیت سے بڑھ کر کوئی بڑا خطرہ نہیں۔ اشتراکیت خدا اور روحانی و اخلاقی اقدار کے مکمل انکار کے ساتھ ساتھ انسان کے عقلی اور ارادی پہلو کو پورے طور پر معاشی عوامل کا پابند بنا کر اس کی انفرادی آزادی کو ختم کر دیتی ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے آخری باب میں خلیفہ صاحب نے اشتراکیت اور اسلام کا موازنہ کر کے اوّل الذکر کی خامیوں کی نشاندہی کی ہے۔ مگر اس موضوع کی وسعت اور اشتراکیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے پیش نظر جلد ہی انہوں نے ایک علاحدہ مفصل کتاب ''اسلام اور اشتراکیت'' کے نام سے انگریزی میں لکھی۔ اس میں انہوں نے اشتراکیت کے بنیادی نظریات کا معروضی طور پر جائزہ لیا اور اس کے مابعد الطبیعی، اخلاقی اور معاشی نتائج کو روسی معاشرے کی تشکیل کی عملی شکل میں پیش کر کے اس کی کمزوریوں کی نشاندہی کی۔ اس کے بعد اسلام کے معاشرتی اور اقتصادی اصولوں کی وضاحت کرتے ہوئے اسلامی جمہوری نظام اور اسلامی نظام معیشت کا ایک عملی نقشہ پیش کرنے کی کوشش بھی کی۔

اشتراکیت اور مادیت کے اس خوفناک حملے سے متاثر ہو کر مغربی ممالک کے عیسائیوں نے کوشش کی کہ دنیائے اسلام کے مفکرین کے ساتھ مل کر اس لادینی نظام فکر کا مقابلہ کریں۔ جب ان کی طرف سے اس قسم کی پیشکش کی گئی تو مسلمانوں نے اسے قرآن مجید کی دعوت سمجھ کر فوراً دست تعاون بڑھایا۔ قرآن حکیم نے آنحضرت کو حکم دیا کہ آپ ﷺ اہل کتاب کو دعوت دیجئے کہ ہم میں اور آپ میں جو چیز مشترک ہے یعنی خدائے واحد پر ایمان اس کی بناء پر ہم مل کر کام کریں اور ان لوگوں کو جو اس سے منکر ہیں اس حقیقت مطلقہ کی طرف دعوت دیں۔

(ترجمہ): آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب! ایک ایسی بات کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے یہ کہ اللہ کے سوائے ہم کسی اور کی عبادت نہ کریں اور کسی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو خدا کے سوا اپنا رب نہ بنائے۔ (۳:۶۴)

قرآن کی یہ دعوت اتحاد اور اشتراک عمل صدیوں تک عیسائی دنیا کے سامنے رہی لیکن کسی نے اس آواز پر لبیک نہ کہا۔ جب اشتراکی مادیت سیاسی طور پر مغربی ممالک کی سلامتی کے لیے ایک خطرہ بن گئی تو انہوں نے مسلمانوں کو اشتراک عمل کی دعوت دی۔ چنانچہ

1954ء میں لبنان کے ایک شہر بحمدون میں ایک بین الاقوامی مجلس مذاکرہ کا پہلا جلسہ ہوا جس میں خلیفہ عبدالحکیم نے بھی شرکت کی۔ انہوں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ میں ایک ایسے مذہب سے وابستہ ہوں جس کی تعلیم یہ ہے کہ دنیا کی ہر بڑی چھوٹی قوم کے پاس خدا کے پیغمبر خدا کا پیغام لے کر آتے رہے اور ان تمام پیغمبروں، ان کی کتابوں اور ان کی تصدیق اور توقیر میرے قلب و ذہن میں اس وقت جاگزیں تھی جب شاید میں اس مذاہب قابل نہ تھا کہ دین کی صحیح حقیقت کو پا سکتا۔ اس اجتماع میں انہوں نے ایک بہت اہم مسئلے پر تقریر کی: اسلام کس طرح نئی پود تک اپنے روحانی اور اخلاقی اقدار کو پہنچا سکتا ہے؟ ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد اسی مقصد کے حصول کے لیے ڈالی گئی تھی۔ خلیفہ مرحوم نے فرمایا کہ اس معاملہ میں اسلام دوسرے مذاہب کے مقابلے پر زیادہ خوش قسمت ہے اور اس میں اس کام کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے کہ وہ نئی نسل کے سامنے اپنے نظریہ حیات کو بہترین شکل میں اور موجودہ حالات کے تقاضوں کے مطابق پیش کر سکے۔ اگر ہم نے پوری کوشش کی تو بہت جلد مسلمان تہذیب و تمدن کے علمبردار بن سکتے ہیں اور باقی اقوام کے ساتھ امن، انصاف اور دوستی کی بنیاد پر نئی زندگی کی شمع روشن کر سکتے ہیں۔

اس کے دو سال بعد لبنان کے اسی شہر میں انجمن کا دوسرا اجلاس ہوا۔ جہاں فیصلہ ہوا کہ اس انجمن کے نمائندے کے طور پر خلیفہ عبدالحکیم اور شیخ بہجت بیطار اضلاع متحدہ امریکہ اور کینیڈا کا دورہ کر کے وہاں کے لوگوں کے سامنے اسلامی دنیا کے نقطہ نظر کی تشریح کریں اور اسلام کے نظریہ امن و آشتی کا پیغام ان تک پہنچائیں۔ یہ دورہ چھ ہفتے کا تھا اور اس دوران میں دونوں ملکوں کے دور دراز علاقوں تک ان دونوں نے اسلام کا پیغام پہنچایا۔ اس کے قبل 1952ء میں مشہور نوٹرے ڈیم یونیورسٹی کی دعوت پر بھی وہ امریکہ گئے تھے۔ جہاں انہوں نے ایک مشہور مذاکرے میں حصہ لیا تھا۔ ان کا موضوع تھا: اسلام میں تصور قانون جو بعد میں دوسرے اراکین کی تقریروں کے ساتھ ایک کتابی شکل میں شائع ہوا تھا۔

ایک بین الاقوامی ادارہ ”انسانی اخوت“ (HUMAN BROTHERHOOD) کے نام سے قائم ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ تمام انسانوں کو ملک، مذہب، ملت، رنگ، زبان کے امتیازات سے بالاتر ہو کر ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے اور اس طرح خالص انسانی نقطہ نظر پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ درحقیقت یہ کوشش

اسلامیہ کی تمام سرگرمیاں اسی مقصد کے حصول کے لیے تھیں۔

خلیفہ صاحب مرحوم کو فارسی اور اردو ادب سے بڑا شغف تھا۔ ان کو ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے اور اکثر خالص فلسفیانہ اور مذہبی مباحث کے دوران میں وہ اشعار کو بطور مثال اس طرح پیش کرتے کہ تمام مسئلہ واضح ہو جاتا۔ حافظ شیرازی سے ان کی عقیدت بہت زیادہ تھی۔ وہ اکثر بڑے ذوق وشوق سے اپنی زندگی کے بے شمار واقعات سنایا کرتے جب انہوں نے اس لسان الغیب سے رہنمائی حاصل کی تھی اور اس سلسلے میں ان کے قصے ایک تاریخی حیثیت رکھتے تھے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں کوئی اہم فیصلہ کرتے وقت یا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے وہ ضرور دیوان حافظ سے فال دیکھتے۔ جب کبھی کوئی معاملہ انہیں غیر معمولی طور پر پریشان کرتا اور وہ کسی فیصلہ کن نتیجہ پر نہ پہنچ سکتے تو فوراً حافظ کی طرف رجوع کرتے اور ان کا کہنا تھا کہ جو قدم انہوں نے اس فال کی بناء پر اٹھایا وہ کبھی غلط ثابت نہیں ہوا۔

غالب کی فارسی اور اردو شاعری سے بھی ان کا شغف بہت گہرا اور دیرینہ تھا۔ انہوں نے ''افکار غالب'' میں اس کے فلسفیانہ اشعار کی بہت عمدہ تشریح پیش کی جس کو ہر جگہ پسند کیا گیا۔ لیکن سب سے بڑھ کر انہیں اقبال اور رومی سے عشق تھا۔ اقبال کے متعلق ان کا سب سے پہلا مضمون اقبال ''نٹشے اور رومی'' تھا۔ جس میں انہوں نے اقبال کے فکر کے مشرقی اور مغربی ماخذوں کا تنقیدی جائزہ لیا تھا۔ ان کی کتاب ''فکر اقبال'' اپنی معنوی خوبیوں کے لحاظ سے اقبالیات میں ایک بلند ترین مقام رکھتی ہے۔ اس میں انہوں نے اقبال کے فلسفہ کے تمام پہلوؤں پر سیر حاصل بحث کی۔ ان کے بنیادی فلسفہ اور اس سے مستنبط اقتصادی، سیاسی، معاشرتی اور دینی نظریات کو بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ اس کے آخر میں علامہ اقبال کے انگریزی لیکچروں تشکیل جدید کے ہر باب کا ایک بہت عمدہ خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ علامہ اقبال کے زیر اثر خلیفہ عبدالحکیم مرحوم رومی کے کلام اور فلسفہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ سب سے پہلے 1917ء میں انہوں نے رومی پر مقالہ لکھا۔ 1922ء میں ان کی انگریزی کتاب ''رومی کی مابعد الطبیعیات'' تیار ہوئی جو 1933ء میں چھپی۔ آج تک اس موضوع پر کوئی اور کتاب نہیں لکھی گئی۔ 1935ء میں حکمت رومی طبع ہوئی جس میں انہوں نے مولانا روم کے فلسفہ پر ایک نئے انداز میں سیر حاصل بحث کی۔ ان کی آخری کتاب ''تشبیہات رومی'' اپنے موضوع کے لحاظ سے ایک اچھوتی کوشش ہے۔ اس میں بسط و تفصیل سے انہوں نے بتایا کہ

خالص اسلامی تھی۔ قرآنی نظریہ حیات کے مطابق اسلام تمام بنی نوع انسان کی فلاح کا ذمہ دار ہے اور اس کا پیغام بلا امتیاز تمام انسانوں کے لیے ہے۔ یہی ایک دین ہے جس نے صحیح معنوں میں ایک ایسے معاشرے کی تکمیل کی جس میں نسل، زبان، رنگ کے امتیازات بالکل کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ موجودہ دور کا اسلامی معاشرہ اپنے دوسرے نقائص کے باوجود اس معاملہ میں نمایاں حیثیت کا حامل ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اس بین الاقوامی ادارہ کے سرگرم رکن تھے۔ ان کا دل ہر قسم کے تعصبات سے خالی تھا اور وہ دوسرے مذاہب اور ان کے پیروؤں کے متعلق انسانی نقطہ نگاہ سے سوچتے تھے۔ ان پر تصوف کا رنگ بہت زیادہ نمایاں تھا اور شاید یہ تصوف ہی کا اثر تھا کہ دوسرے انسانوں سے ملتے وقت ہمیشہ وہ انسانی نقطہ نگاہ سامنے رکھتے اور کبھی اختلاف مذہب وملت کو درمیان میں نہ لاتے تھے۔

حکومت پاکستان نے اسلامی قوانین کو جدید زمانے کی نئی معاشرتی ضروریات کے مطابق تشکیل دینے کے لیے زکوٰۃ کمیشن بٹھایا جس کے صدر خلیفہ عبدالحکیم تھے۔ اس کمیشن کا مقصد یہ تھا کہ زکوٰۃ کو اس طرح منظّم کیا جائے کہ اس سے معاشرتی فلاح و بہبود کا کام لیا جا سکے۔ زکوٰۃ کے مصرف میں مثلاً ابن السبیل کی مدد بھی شامل ہے۔ جدید رجحان کے علماء نے یہ رائے دی کہ موجودہ زمانے میں سڑکوں کی توسیع و مرمت، ریلوے، تار و ڈاک خانہ، ہوائی جہاز اور بحری جہاز وغیرہ کے محکمہ ابن السبیل کی مدد کے مترادف ہیں۔ کیا ان محکموں پر روپیہ خرچ کرنا زکوٰۃ کے مصرف میں شامل نہیں ہوسکتا؟ قدیم مکتب خیال کے علماء جو اس کمیشن کے ممبر تھے اسلام کے اقتصادی اصولوں کی اس جدید اور جائز توسیع سے متفق نہ ہو سکے اور اس طرح ایک عمدہ کام سرانجام نہ پا سکا۔ کچھ عرصے بعد حکومت نے عائلی کمیشن کی تشکیل کی اور خلیفہ عبدالحکیم اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ لیکن اس قدیم و جدید کی کشمکش کے باعث اس کمیشن کی سفارشات پر بھی عملدرآمد نہ ہو سکا۔

قدیم اور جدید مکاتیب فکر کی یہ کشمکش موجودہ دور کی اسلامی دنیا کا ایک اہم مسئلہ ہے اور ہر اسلامی ملک میں اس اختلاف نے بعض دفعہ افسوسناک صورت اختیار کر لی ہے۔ پاکستان میں کوشش کی جا رہی ہے کہ اس الجھن کو عمدگی اور خوش اسلوبی سے رفع کیا جائے۔ یہ ہمارا فرض ہے کہ اسلامی نظریہ حیات کو لوگوں کے سامنے اس طرح پیش کیا جائے کہ جدید علوم وفنون اور صحت مند معاشرتی اور اقتصادی تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا ہو سکے۔ ادارہ ثقافت

28

مرحوم ڈاکٹر خلیفہ کا حکیمانہ ادب

ڈاکٹر سیّد عبداللہ

ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم ان اساتذہ کبار میں سے تھے جن کی تحریر اور تقریر، تصنیف و گفتگو یکساں طور پر علم وفکر سے لبریز و معمور تھی۔ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں میں برابر کی روانی و قدرت انہیں حاصل تھی۔ ان کا دائرہ عمل بھی اسی طرح وسیع تھا اور ان کے موضوعات میں نتیجہ خیز تنوع پایا جاتا تھا۔ فلسفہ ان کا موضوع اصلی تھا مگر فارسی اور اردو کی کلاسیکی اور نئی شاعری پر ان کو ایسا عبور حاصل تھا جو حیرت افزا تھا۔ پھر اقبالیات و اسلامیات میں ان کی تحقیق بذات خود اتنی پائیدار اور عالمانہ تھی کہ ان مضامین میں بھی ان کو بلند مقام دیئے بغیر چارہ نہیں۔ مذہبی موضوعات پر انہوں نے تفکر اور اس میں سوچ کی نئی صورتیں پیدا کیں۔ چنانچہ ان کی فکریات کو جدید علم کلام کے سلسلے کی ایک اہم کڑی کہا جا سکتا ہے۔ ان سب پر مستزاد یہ کہ وہ اردو کے شاعر بھی تھے اور فلسفیانہ نظم گوئی میں ان کو نظر انداز کرنا مشکل ہے۔

رومی سا نباض فطرت معمولی تشبیہوں سے کام لے کر فلسفہ حیات اور کائنات وانسان کے اسرار وغوامض کس آسانی سے حل کر دیتا ہے۔

لیکن خلیفہ عبد الحکیم کے صحیح علمی مقام کا اندازہ ان کی ان تصنیفات سے کہیں زیادہ ان کی گفتگو سے مل سکتا تھا۔ جب وہ کسی مسئلہ پر گفتگو کرتے تو ہر شخص ان کے طرز تکلم سے مسحور ہو جاتا۔ ان کے پاس لوگ ہر قسم کے مسائل لے کر آتے۔ ان میں سے بعض تو خدا تک کے منکر ہوتے تھے۔ لیکن خلیفہ صاحب کی زبان میں اتنی چاشنی ہوتی تھی اور ان کے علم وفکر کی گہرائی اتنی عمیق ہوتی تھی کہ ہر شخص مطمئن ہو کر جاتا تھا۔ وہ ہر شخص سے اس کے مبلغ فکر کے مطابق بات کر سکتے تھے۔ وہ گھنٹوں باتیں کرتے رہتے لیکن کوئی شخص اکتاتا نہ تھا۔ کبھی دقیق مسائل پر گفتگو ہو رہی ہے، کبھی شعر وشاعری کا ذکر ہو رہا ہے۔ کبھی لطائف وظرائف آموجود ہوتے۔ غرض وہ اپنی مجلسوں میں کئی رنگوں کا مرقع تھے۔

تصوف اور شاعری کے اس ذوق کے باعث وہ دل کے بہت نرم تھے۔ ہمدردی اور سخاوت میں وہ اپنی مثال آپ تھے۔ جہاں انہیں معلوم ہوا کہ کسی شخص کو ضرورت ہے فوراً اس کی حاجت سے بڑھ کر اس کی مدد کیلئے تیار ہو جاتے۔ اسلام اور آنحضرتؐ سے ان کی شیفتگی عشق کی حد تک تھی۔ جب کبھی کسی عیسائی کی طرف سے کوئی اعتراض ہوتا تو وہ اس طرح مداخلت کے لیے تیار ہو جاتے کہ دیکھنے والے حیران ہو جاتے تھے۔ گویا وہ عجیب و غریب شخصیت کے مالک تھے اور دوست اور دشمن دونوں ان کی صلاحیتوں کے قائل تھے۔ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا۔

❀ ❀ ❀ ❀ ❀

ڈاکٹر خلیفہ صاحب کی جو کتابیں انگریزی میں ہیں ان پر اس مضمون میں تفصیل گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ مگر ان کا تذکرہ نظرانداز بھی نہیں ہو سکتا۔ ان کا اہم کام انگریزی کی کتاب اسلامک آئیڈیالوجی (Islamic Ideology) اور اسلام اینڈ کیمونزم (Islam and Communism) ہے۔ اوّل الذکر کتاب میں انہوں نے اسلامی عقائد و افکار کو نئی شعوریات کے ماحول میں دیکھنے کی کوشش کی ہے اور دوسری میں کیمونزم کے اچھے اور برے پہلوؤں کا تجزیہ کر کے اسلام کو مسلک اعتدال قرار دیا ہے۔ اگر ڈاکٹر خلیفہ صاحب کے مذہبی فلسفہ کا تجزیہ کیا جائے تو اس کا خلاصہ یہ ہوگا کہ وہ اسلامی تعلیمات میں سادگی اور فلسفیانہ معقولیت کے جویندہ تھے۔ عقل و الہام میں ارتباط ان کے نزدیک دائرہ امکان کے اندر ہے اور الہام یا وجدان بھی ان کے خیال میں شعور کی ایک برتر مختص النوع چیز ہے۔ چنانچہ عقل و الہام کی تفریق و جدائی ان کے نزدیک حقیقت ناشناسی کی علامت ہے۔

جیسا کہ آج کل یہ خیال عام ہے، اجتہاد کی ضرورت کو خلیفہ صاحب نے بھی تسلیم کیا ہے مگر خلیفہ صاحب کا فلسفیانہ تعقل یا طریق کار ان کا رفیق و ہمسفر رہتا ہے۔ خلیفہ صاحب اجتہاد میں عقلی استعداد اور علمی بصیرتوں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جدید دنیا کا کوئی مجتہد سائنسی افکار کے علم فراواں کے بغیر مسند اجتہاد پر نہیں بیٹھ سکتا۔ اس سلسلے میں یہ بات کبھی کبھی کھٹکتی ہے کہ خلیفہ صاحب نے فکر اسلامی کے عظیم ماضی کے متعلق وسعت تحقیق پر اتنا زور نہیں دیا جتنا ضروری ہے...... اور یہ طریقہ کار خلیفہ صاحب کے علاوہ چند اور فلاسفہ مذہب نے بھی جدید دور میں اختیار کیا ہے۔ تاہم خلیفہ صاحب نے ان کے مقابلہ میں اعتدال و توازن کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

فکریات مذہبی میں (یعنی مذہب کا فلسفیانہ تجزیہ کرنے والوں میں) خلیفہ صاحب کا درجہ اس لئے بلند ہو جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے طریق بحث میں تسہیل وتشریح کا ایسا رنگ اختیار کیا ہے جس سے مغربی انداز میں سوچنے والا یا مغرب کا کوئی حقیقت طلب شخص مطمئن ہو سکتا ہے۔ یہ دراصل خلیفہ صاحب کی فلسفیانہ تعلیم و مطالعہ کا اثر ہے جس کی مدد سے وہ مذہب کی حقیقتوں کو کامیاب طریق سے واضح کر سکے ہیں۔ مگر ایسے طریق کار میں یہ کمزوری ضرور پیدا ہو جایا کرتی ہے کہ مذہب کے مابعد الطبیعیاتی امور میں بھی جھکاؤ عقل کی طرف زیادہ ہو جاتا ہے۔

با ایں ہمہ خلیفہ صاحب کی بحر و عقل پسندی کے سامنے ایک صورت حال نے بند باندھ دیا۔ مرحوم اپنی آخری عمر میں فرمایا کرتے تھے کہ میں اب صوفی ہوتا جا رہا ہوں۔ ایک صوفی اور فلسفی میں فرق یہی ہے کہ ایک مفکر صوفی بالآخر وجدان و ایمان کے سامنے ہتھیار ڈال دیا کرتا ہے اور نرا فلسفی آخری وقت تک منطق کے چکر میں پھنسا رہتا ہے۔ ولیم جیمز کی واردات روحانی کے ترجمہ اردو کے زمانے میں خلیفہ صاحب نے فلسفے کی صوفیانہ قسم سے (جو مذہب سے وابستہ ہے) کچھ زیادہ ہی وابستگی اختیار کر لی تھی۔ یوں اس کے علاوہ بھی فارسی اردو کے صوفی شاعروں سے ان کو عقیدت تھی اور فلسفہ کے عارفانہ طریق تفکر کے پہلے سے بھی قائل تھے۔ فلسفیانہ مسلک میں وہ اس Idealism یعنی مثالیت یا عینیت کے دلدادہ تھے جس کو اختیار کرنے کے بعد ایک فلسفی اور ایک مومن میں بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔

میں خود فلسفے کا طالب علم نہیں ہوں اس لئے خلیفہ صاحب کے فلسفیانہ کام کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ وہ کام کسی فلسفی کا ہے مگر میں انہیں صوفی فلسفی کی حیثیت سے جاننے کا قدرے مدعی ہوں اور اس دعویٰ کا سبب میرا وہ مطالعہ ہے جو میں نے ان کے سلسلہ رومیات کے متعلق کیا ہے۔

رومی سے خلیفہ صاحب کا تعلق بلا واسطہ بھی ہے اور اقبال کے واسطے سے بھی ہے۔ ان کی ایک کتاب حکمت رومی پرانی ہے اور تشبیہات رومی آخری زمانے میں لکھی ہوئی چیز ہے۔ حکمت رومی اگرچہ رومی کے اسرار کو آشکار کرنے کی سعی ہے مگر اس میں بھی خلیفہ صاحب کا اپنا میلان فکر نمایاں ہو جاتا ہے۔ مثنوی رومی کو قرآں در زبان پہلوی قرار دیا گیا ہے اور اس معنی میں اس میں قرآن اور دین ہی کے معارف بیان ہوئے ہیں۔ مگر خلیفہ صاحب کا طریقہ کار یہ بتاتا ہے کہ وہ رومی کے افکار کے عقلی عنصر کو نمایاں کر رہے ہیں۔ چنانچہ ایک مقام پر لکھا ہے:

''استقرائی اور استدلالی علم ایک تنظیمی قوت ہے جو محسوسات و مظاہر و حوادث میں ربط تلاش کرتی ہے۔ کائنات کے تمام مدارج میں نظم موجود ہے، اس لئے ہر درجے میں اس درجے کی عقل پائی جاتی ہے...... اولیاء کرام نے عقل نبوی اور عقل ایمانی کا بھی ذکر کیا ہے۔''

اس طرح ان کے یہاں عقل کی برتری یا احاطہ کلی کی ایک صورت نمایاں ہے......

خیر اس کو عقل کہئے یا ایمان (ناموں میں آخر کیا پڑا ہے) خلیفہ صاحب نے رومی کے عقلی عنصر

عمدہ اشعار کا ایک معقول انتخاب تیار ہو سکتا ہے۔ ان کے لطائف میں ان کی ظرافت کا رنگ خاص اور ان کے اشعار میں ان کے ذوق ادبی کی دلکش تصویر جلوہ آرا ہے۔

لطائف و اشعار سے ان کی تحریر کو فائدہ بھی پہنچا ہے اور نقصان بھی۔ بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ بعض اوقات تحریر میں طوالت بے جا کا عیب پیدا ہو گیا ہے۔ مگر یہ فائدہ بھی ہوا ہے کہ لوگ ان کے فلسفیانہ مضامین و تصانیف کو دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

مجھے ان کی فلسفیانہ نثر میں سب سے زیادہ ان کی کتاب 'داستان دانش' سے دلچسپی ہے۔ اس میں طوالت، اطناب، تشریحی لطیفہ بازی، اشعار کے اضافے کم سے کم نظر آئے ہیں اور حکمت اور انشاء پردازی کا ایسا اجتماع پیدا ہو گیا ہے جو مصنف کو بیک وقت اچھا انشاء پرداز اور اچھا فلسفی ثابت کر رہا ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ کو فکر اسلامی سے بھی انہماک تھا اور ادب فارسی و اردو سے بھی اور انہوں نے ان دونوں مقاصد کی تکمیل کی کوشش کی۔ ان کی تصانیف سے جہاں اسلامی فکریات کے متعلق سوچ کی نئی راہیں کشادہ ہوئیں وہاں اردو ادب کی ثروت میں بھی بیش بہا اضافہ ہوا۔ انہوں نے ادب و حکمت میں وہ رابطہ پیدا کیا جس کا خواب شبلی نے دیکھا تھا۔ مگر نثر اردو میں اس کی تعبیر خلیفہ عبد الحکیم کے ماسوا کوئی نہ کر سکا۔ البتہ شعر و حکمت کی یک جائی کے لحاظ سے اعلی اللہ مقامہ حکیم مشرق اقبالؔ کا مقام لامثال اور لافانی ہے۔

یا اختلاف کیا؟ ہر فن کی تاریخ سے ان سوالوں کے جواب ملتے ہیں۔ یہی صورت فلسفہ سائنس اور دوسرے علوم میں نظر آتی ہے۔ اگر آپ کسی فلسفی یا عالم کا مقام اس کے خاص علم کے دائرے میں متعین کرنا چاہیں تو اس کے تنقیدی اصول اور ضابطے آپ کی رہنمائی اور مدد کو حاضر ہوتے ہیں۔

کیا یہ بات ان لوگوں کے لیے بھی کہی جاسکتی ہے جو عام معنوں میں فلسفی، مفکر یا عالم نہ ہوں بلکہ اسلامی فکر کے علمبردار اور اس کی تاریخ کے معمار ہوں؟ اس سوال کا جواب نہ واضح طور پر نفی میں ہے اور نہ اثبات میں۔ نفی میں یوں نہیں کہ (وبیش تیرہ سو سال سے ہمارے آباؤ اجداد اپنے علماء و آئمہ کے متعلق لکھتے لکھاتے آئے ہیں) اور اثبات میں اس وجہ سے نہیں کہ یہ لکھنا لکھانا بیشتر دو لفظی رائے زنی یا اس قسم کے تعریفی یا تنقیصی جملوں پر مشتمل ہوتا تھا جیسے اُردو کے قدیم تذکرہ نویس اُردو شاعروں کے متعلق اپنی تالیفات میں درج کیا کرتے تھے۔ مثلاً ''فلاں نوجوان عمدہ شعر کہتا ہے۔ اس کے اشعار میں زبان کا حسن بھی ہے اور تخیل کی بلندی بھی'' یا مثلاً ''فلاں شاعر بڑا ہونہار ہے۔ اس کا مستقبل روشن دکھائی دیتا ہے'' یا پھر ''فلاں کے کلام کا رنگ استادانہ ہے'' وغیرہ وغیرہ۔ ہمارے قدیم مذہبی علمی سرمائے میں علماء اور آئمہ کے متعلق اسی قسم کی تنقید ملتی ہے: ''فلاں نہایت بلند پایہ عالم دین اور انتہا درجے کے پابند شرح بزرگ تھے۔'' ''فلاح کا مرتبہ علم اور تقویٰ دونوں میں فلاں بزرگ کے برابر اور فلاں سے ذرا کمتر ہے۔''

مقصود اس سے سوء ادب نہیں۔ فقط یہ کہنا مطلوب ہے کہ ہمارے اسلامی فکر کی تاریخ میں علماء و آئمہ کے مقام و مرتبے کا تعین کسی ایسے معیار سے نہیں ہوتا رہا جس کی تفصیلات اور جزئیات باقاعدہ طور پر علمی اور سائنسی انداز سے طے پائی ہوں۔ ہماری تنقید زیادہ تر تاثراتی اور ذاتی نوعیت کی حامل تھی۔ البتہ انیسویں صدی کے آخری سالوں میں مصر، ترکی، لبنان، شام، ایران اور خود برصغیر پاک و ہند میں جب مشرقی اور جدید مغربی علوم کے دھارے باہم ملنے لگے اور آویزش کی نئی صورتیں رونما ہوئیں تو عرب دنیا میں مفتی عبدہ اور علامہ رشید رضا اور ہمارے ہاں سرسید، شبلی اور ابوالکلام آزاد کے ہاتھوں ایک نئی طرز تنقید نے جنم لیا اور ہم نے اپنے تمام دینی اور علمی سرمائے کا پھر سے اور جدید انداز سے جائزہ لینے کا کام شروع کیا۔ تاہم جہاں تک علماء و مفکرین اسلام کے انفرادی مقام و مرتبہ کے تعین کا تعلق

29

خلیفہ عبدالحکیم: ایک مفکرِ اسلام

محمد عثمان

کسی ادیب یا شاعر کے کام کو پرکھنے اور اس کی حیثیت کا اندازہ لگانے کے لیے بعض اصول اور تنقیدی معیار ہماری مدد کرتے ہیں۔ مثلاً کسی ناول نگار کے فن کا جائزہ لیتے وقت ہم اس کے ناولوں کے موضوع، اس کی کردار نگاری، اس کی قصہ سازی، اس کی قوت مشاہدہ اور اسلوب بیان وغیرہ کو پرکھتے ہیں اور اس سے ہمیں بآسانی پتہ چل جاتا ہے کہ زیر بحث ناول نگار کس درجے اور کس حیثیت کا ادیب ہے اور اس نے ناول کی دنیا کو کیا فائدہ یا نقصان پہنچایا ہے۔ یہی بات شاعر، ڈرامہ نگار، مصور، سنگ تراش یا کسی بھی فنکار کے بارے میں کہی جا سکتی ہے۔ ڈرامہ نگاری کو پرکھنے کے واضح اصول موجود ہیں۔ شاعری اور مصوری کی جانچ پرکھ کے اپنے قاعدے اور ضابطے مروج ہیں۔ ان ضابطوں اور قاعدوں کی اپنی اپنی تاریخ ہے۔ کون قاعدہ یا تنقیدی معیار کب رائج ہوا؟ کس نے ابتداء کی؟ کس کس نے اتفاق

ہے، یہ میدان باضابطہ معیار کے وضع و ترویج سے، میرے علم کی حد تک، تا حال خالی ہے۔

یہاں ایک ذاتی تجربے کا ذکر بے محل نہ ہوگا۔ چند سال ادھر کی بات ہے کہ دوران مطالعہ مجھے ایک موضوع تحقیق سے خصوصی دلچسپی پیدا ہوگئی۔ موضوع یہ تھا کہ سر سید سے لے کر اب تک پاک و ہند میں اسلامی فکر کا جو ارتقاء ہوا ہے اس کی ترقی میں یا اس کا رخ بدلنے یا سمت مقرر کرنے میں ہمارے جدید علماء مثلاً سر سید، شبلی، ابو الکلام آزاد، مشرقی، عبید اللہ سندھی، اقبال، سید ابو الاعلیٰ مودودی، غلام احمد پرویز اور خلیفہ عبد الحکیم وغیرہم میں سے بھلا کس کس کا کتنا اور کیا حصہ ہے۔ اس راہ تحقیق میں دوسری کئی دقتوں کے علاوہ ایک بڑی دقت یہ تھی کہ کسی مفکر اسلام یا متکلم اسلام کی حیثیت اور اسلامی فکر کی ترقی میں اس کے حصے (Contribution) کا فیصلہ کس پیمانے اور معیار کی رو سے کیا جائے۔ میں نے بہتیرا ادھر ادھر جھانکا تاکا مگر اس قسم کا معیار، برا یا بھلا، مجھے کہیں نہ ملا۔ بالآخر میں نے اس دقت کو اپنے طور پر حل کرنے کی سعی کی اور ایک معیار میری سمجھ میں آیا۔ یقین غالب ہے کہ بعض حضرات اس معیار کو درست اور تسلی بخش قرار نہیں دیں گے اور خود مجھے اس کی درستی اور حتمی صحت کے متعلق کوئی دعویٰ نہیں۔ لیکن ایک بات اس کے متعلق ضرور کہوں گا۔ وہ یہ کہ اس معیار کے پیش نظر میرے کام کی بہت سی مشکلیں آسان اور بہت سی رکاوٹیں دور ہوگئیں جس سے میں نے یہ جانا کہ یہ معیار قابل اعتماد اور کار آمد ضرور ہے۔ اصل موضوع کی طرف آنے سے پہلے میں وہ معیار بیان کرتا ہوں۔

یوں تو اسلام اور اسلامی تعلیمات کی بے اندازہ خوبیاں اور محاسن ہیں اور قرآن حکیم کے اندر حکمت و دانائی اور رشد و ہدایت کے ایسے ایسے گوشے ظاہر و مخفی موجود ہیں کہ ان سب کا احاطہ کرنا، ان سب کی حقیقت اور تہہ کو پانا اور ان سب سے بہرہ اندوز اور فیض یاب ہونا کسی ایک فرد کے بس کی بات نہیں۔ تاہم جہاں تک اسلام اور اسلامی تعلیمات کی تفہیم و انہام کا تعلق ہے، میرے خیال میں چار خصوصیات بنیادی حیثیت رکھتی ہیں اور کسی مفکر اسلام کی حیثیت متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنے کی ضرورت ہوگی کہ اس نے کس حد تک ان خصوصیات کو پایا اور اپنایا ہے اور کس حد تک اس کا دامن قلب و نظر ان کی دولت و ثروت سے خالی ہے۔

میرے نزدیک اسلام کی سب سے پہلی خصوصیت اس کی وسعت ہے۔ دنیا کا کوئی

مذہب، کوئی فلسفہ، کوئی نظام حیات اپنی ہیئت ترکیبی میں اس قدر وسعت نہیں رکھتا۔ اسلام نے اپنے نظام عقائد، نظام اخلاق اور نظا معاشرت کو ایسی وسیع انسانی بنیادوں پر استوار کیا ہے جو اس سے پہلے اور اس کے بعد شاید ہی کسی نظام حیات کو نصیب ہوا ہو۔ اسلام نے نسل، رنگ اور جغرافیائی قومیت کے امتیازات کو بڑی خوبی اور کامیابی سے مٹایا۔ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا: اب سے کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عرب پر اور کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر فوقیت حاصل نہیں رہی۔ قرآن حکیم نے یہ اعلان کرکے کہ ''ان اکرمکم عند اللہ اتقکم'' شرف انسانی کو مال و دولت، اقتدار و حکومت اور حسب نسب کے بوجھوں سے آزاد کر دیا۔ اس نے مسلمانوں پر لازمی قرار دیا کہ اپنے نبی کی طرح پہلے انبیاء پر بھی غیر مشروط ایمان لائیں۔ یہی نہیں اس نے اس بات کا بھی اعلان کیا کہ کرہ ارض کی تمام قوموں کی طرف ہادی اور رسول بھیجے گئے اور ان تک خدا کی طرف سے ہدایت پہنچائی گئی۔ پھر اس نے ان تمام لوگوں کو جو ایک خدا پر ایمان رکھتے ہیں تمام اختلافات بھول کر نیکی اور بھلائی میں تعاون کے لیے پکارا اور اتحاد عمل کی دعوت دی۔ اسلام نے اپنے خدا کو رب العالمین بتایا اور اس کی بخشش و رحمت کو کسی ایک قوم یا طبقے کے ساتھ محدود و مخصوص کرنے کی کوشش نہیں کی۔ قرآن نے دشمنوں کے ساتھ بھی انصاف کرنے کی تلقین کی اور معاہدہ کرکے توڑنے سے منع فرمایا خواہ اس سے مسلمانوں کو نقصان اور ان کے دشمنوں کو فائدہ ہی کیوں نہ پہنچتا ہو۔

مذاہب کی تاریخ میں عقائد و اعمال سے بھی زیادہ نازک مسئلہ آخروی نجات اور حصول جنت کا رہا ہے۔ اسلام نے نہ صرف اچھے یہودیوں اور اچھے نصرانیوں کی تعریف کی ہے اور ان کی نیکیوں اور اچھائیوں کو سراہا ہے اور ان کو برے یہودیوں اور برے نصرانیوں سے الگ کرکے دیکھا اور دکھایا ہے بلکہ جنت کی اجارہ داری کے تصور کی شدید مخالفت اور تردید کرکے اور خوشنودی باری تعالیٰ کا مدار خالص ایمان اور نیک عملی پر ٹھہرا کر تاریخ انسانی میں پہلی بار نجات آخروی کے حصول اور سوال کو ہر قسم کی گروہ بندی سے مبرا قرار دیا۔ انسان اتنے وسیع القلب اور فراخ نظر نہیں ہوتے جتنا کہ خدائی ہدایت کا راستہ (قرآن حکیم) ہے۔ لہٰذا یہ لوگ اپنی تنگ نظری اور کم دلی کو قرآن میں دیکھنے یا یوں لکھئے کہ قرآن کی وسعتوں کو اپنی حد نظر کے مطابق کاٹنے چھانٹنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ قرآنی تعلیمات کی بعض

وسعتیں تو ظاہر و باہر اور بآسانی سمجھ میں آنے والی ہیں لیکن بعض بڑی نازک اور گریز پا بھی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان گنت مفکرین، متکلمین اور مبلغین اسلام ایسے گزرے ہیں اور آج بھی ہیں جو کمی خلوص یا کوتاہی یا کاوش کی بناء پر نہیں بلکہ محض اپنی خلقی مجبوریوں اور ذہنی معذوریوں کے سبب اسلام کی وسعت کو کبھی نہ دیکھ سکے اور جب دیکھ ہی نہ سکے تو اسے پیش کیونکر کرتے، اس کی اشاعت کا بیڑا کیسے اٹھاتے، اس کے علمبردار کیونکر ہوتے۔

مختصر یہ کہ میں جب بھی کسی اسلامی مفکر یا دانشور کی حیثیت و مرتبہ پر غور کرتا ہوں تو سب سے پہلے یہ دیکھتا ہوں کہ اس نے اسلام کی وسعتوں کو کس حد تک پایا ہے اور کہاں اس کا فہم و ادراک اسلام کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گیا ہے۔ میں اس فاصلے کو ناپنا، اس فصل و بعید کا اندازہ کرنا اپنے معیار نقد کا پہلا جزو خیال کرتا ہوں۔

اس معیار کا دوسرا جزو گہرائی ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں مادی اور طبعی حقائق و واقعات کا بیان ہے وہاں ان کے پہلو بہ پہلو ایسے حقائق و واقعات کا تذکرہ بھی ہے جو مادی اور طبعی دنیا سے ماورا، روح اور کائنات کے لطیف تر اور عمیق تر واردات و احوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس میں حضرت سلیمانؑ کے دربار کے ایک ایسے ذی علم شخص کا ذکر بھی ہے جس نے پلک جھپکتے میں ملکہ سبا بلقیس کا تخت حضرت سلیمان کے سامنے لا کھڑا کیا تھا۔ اس میں غزوہ بدر میں ملائکہ کے ذریعے مسلمانوں کی امدادِ غیبی کا حوالہ بھی ہے۔ اس میں حضرت موسیٰؑ کے ہاتھوں پہاڑی سے بارہ چشمے پھوٹ بہنے اور دریائے نیل کے پانی کا دو حصوں میں بٹ جانے کا تذکرہ ہے۔ اس میں واقعہ معراج، قصہ اصحاب کہف اور حضرت عیسیٰ کی بن باپ کے پیدائش کا بیان بھی ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور حضرت مریم کے سامنے فرشتوں کا بہ شکل انسان ظاہر ہونا مذکور ہے اور اس صاحب نظر و عمل انسان کا تذکرہ بھی ہے جسے عرف عام میں خضر کہتے ہیں۔

بے شمار مفسر قرآن اور متکلم اسلام ایسے گزرے ہیں اور اب بھی ہیں جن کی باتیں 'علم' اور شنید ہوتی ہیں، ان کے سب وعظ و ارشاد قال کے تنگ دائرے میں گھومتے ہیں، ان کا دل لذت عشق و معرفت سے اور ان کی نظریں ذوق وصل و دید سے بے نصیب ہوتی ہیں۔ ہمارے زمانے میں بعض ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو اسلام کی تعلیم کے اس اہم پہلو سے اس قدر غافل اور اس دولت قلب و نظر سے اس حد تک محروم واقع ہوئے ہیں کہ قرآن کے ان

سب مقامات واحکام کو جن کی غایت اصلی خدا کی ذات سے براہ راست تعلق پیدا کرنا، اس کی محبت سے بہرہ اندوز ہونا اور عقل کی سرحدوں سے پرے شوق وعرفان کی منزلوں میں داخل ہونا ہے، خالص مادی اور معاشرتی معانی پہنا کر دم لیتے ہیں۔

میں جب بھی کسی مفکر اسلام کے مقام پر غور کرتا ہوں تو دوسری بات اس کی تصنیفات میں یہ ڈھونڈتا اور تلاش کرتا ہوں کہ اسلام کی اتھاہ گہرائیوں کا بھی وہ شناور ہے کہ نہیں، اس کی فطرت کو مذاق روحانی بھی نصیب ہوا ہے کہ نہیں۔ وہ صرف معاشرت واخلاق اور سیاست و اقتصاد ہی کی باتیں کرتا ہے یا صلوٰۃ و درود کا رمز شناس بھی ہے۔ وہ دن کی مصروفیتوں ہی کا قائل ہے یا رات کی ریاضت وعبادت اور ''ان ناشئۃ الیل ہی اشد وطاو اقوم قیلا۔'' (۶،۷۳) مقامات کی بھی کچھ خبر رکھتا ہے۔

(بلاشبہ رات کو اٹھنا اور مصروف عبادت رہنا شخصیت کو پختہ اور دعا کو پرتاثیر بناتا ہے۔)

اس معیار کا تیسرا جزو اسلام اور قرآنی تعلیمات کا بے مثل حسن توازن ہے۔ دین و دنیا، جسم و روح، عبادت و معاشرت، اخلاق و سیاست، مرد اور عورت، امیر اور غریب، آقا و غلام...... انسانی زندگی کے ان تمام پہلوؤں کے درمیان اعتدال اور توازن کی جو راہ ہم کو اسلام نے دکھائی ہے ان سب کو جاننا سمجھنا، قبول کرنا اور اپنانا، پیش کرنا اور دکھانا جتنا بظاہر عام اور آسان دکھائی دیتا ہے، درحقیقت اتنا ہی کمیاب اور مشکل ہے۔ اسلام نے بے شمار تفریقوں کو مٹایا اور ان گنت مساواتوں کو بڑے نازک توازن اور تناسب کے ساتھ قائم کرنے کی طرح ڈالی ہے۔ ان امور کے علاوہ جن کو میں نے اوپر گنوا دیا ہے، انسانی زندگی کے بے شمار معاملات ایسے ہیں جن کو قرآن نے بیان کیا ہے یا پھر ان کے بارے میں دانستہ اور حکیمانہ سکوت اختیار فرمایا ہے تاکہ ہم قرآن کے بتائے ہوئے اصول توازن و اعتدال کی روشنی میں خود توازن اور عدل کے ساتھ فیصلے کریں اور قدم اٹھائیں۔ لاتعداد امور و معاملات وقت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں پیدا ہوتے اور شدید ذہنی یا معاشرتی الجھنوں کا باعث بنتے ہیں اور جن کے مناسب حل کے بغیر کوئی معاشرہ ترقی نہیں کرسکتا۔ اسلامی مفکر اور دانشور وہ ہے جو ان معاملات میں عدل وتوازن اور حق وانصاف کی وہ راہ اختیار کرے جو قرآن کی روح اور منشاء کے عین مطابق ہو۔

میں جب بھی کسی بڑے عالم دین اور مفکر اسلام کی حیثیت پر غور کرتا ہوں تو
[..]ے نمبر پر یہ دیکھتا ہوں کہ اس کا علم اور اس کی نظر بے شمار جدید مسائل میں اس کو کس
[..] لے جاتی ہے۔ کیا وہ اسلام کے نام پر زندگی کی ترقی اور بہاؤ میں جگہ جگہ بند باندھتا اور
[..] قدم پر روڑے اٹکاتا ہے؟ کیا وہ جدید کی لذت اور تجدید کے شوق میں ہر حد کو پھلانگتا اور
[..]ر حد سے تجاوز کرتا ہے؟ یا قرآن کے اصول توازن و اعتدال کو سمجھتے ہوئے اور اس کی روح
[..]گاہ رکھتے ہوئے زندگی کی ترقی و تعمیر میں ہماری مدد کو پہنچتا اور منشائے الٰہی کی تکمیل کرتا ہے؟

میری نگاہ میں چوتھا معیار اقتضا بینی ہے۔ ہر ایسی تحریک، ایسی تہذیب، ایسے
[..]ہب کے لیے جیسا کہ اسلام ہے یہ ایک قدرتی اور فطری امر ہے کہ ہر زمانے میں اس کی
[..]اء اور ترقی کے لیے کچھ خاص تقاضے ہوں۔ جو تحریک دس پندرہ، بیس پچیس یا سو دو سو برس کی
[..]ندگی پر قانع اور مطمئن نہ ہو اور رہتی دنیا تک اپنے آپ کو زندہ و فعال اور ترقی یافتہ اور طاقتور
[..]یکھنا چاہے اس کے لیے وقت کے عنصر کو جاننا سمجھنا اشد ضروری ہے۔ وقت مسلسل اور ہر لحہ
آگے بڑھ رہا ہے اور اس کی اس رفتار اور مرور کے ساتھ زندگی کے احوال میں تبدیلی اور تغیر و
تبدل واقع ہوتا ہے۔

میرا یہ مطلب نہیں کہ وقت کے ساتھ خود زندگی کی اصل، اس کی فطرت یا اس کی
غایت بدل رہی ہے۔ میری مراد یہ ہے کہ زندگی کا ماحول، اس کے حالات مسلسل بدلتے
آئے ہیں اور بدلتے رہیں گے۔ وقت کے اس کبھی نہ رکنے والے بہاؤ کے ساتھ زندگی کے
جب احوال بدلتے ہیں تو ان پر قابو پانے اور ان کی کوکھ سے جنم لینے والے مسائل کو حل
کرنے کے لیے ہر زندہ تحریک پر یہ لازم ہے کہ ان مسائل کے مطابق اپنے اندر سے وہ
ہتھیار اور ساز و سامان پیدا کرے جو اس کے تفوق کے سلسلے کو ٹوٹنے نہ دے تاکہ تحریک
مسائل و معاملات پر غالب رہے۔ اگر کسی زمانے میں مسائل و معاملات خود تحریک پر غالب آ
گئے تو سمجھئے کہ تحریک خطرے میں ہے اور اس کی بقاء مخدوش ہے۔ اس بیان کی توضیح و تصدیق
کے لیے تاریخ فکر اسلامی سے بے شمار مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ میں قریب ترین مثال
سے کام لیتا ہوں۔

گزشتہ صدی کے اواخر اور اس صدی کے اوائل میں برصغیر پاک و ہند میں وقت
نے اسلام کے لیے ایک خاص صورت حالات پیدا کر دی تھی۔ اس برصغیر میں شبلی جیسے دردمند

معاملات پر ان صداقتوں پر مناسب زور دیا ہے جس کے بغیر اسلام کے نظریہ حیات کی تصویر مکمل نہیں ہوتی۔ یہ واقعہ ہے کہ ہماری فکر کی پوری تاریخ میں اسلامی تعلیمات کے اس پہلو کو پوری جرأت اور کامل یقین و اعتماد کے ساتھ بہت کم پیش کیا گیا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم ان معدودے چند افراد میں سے ہیں جنہوں نے قرآن حکیم کے اس حصہ تعلیم کو شرح صدر کے ساتھ سمجھا اور الم نشرح پیش کیا۔ ان کی کتاب کا مقدمہ اور وہ باب جس کا عنوان ''مذاہب کا اسلامی تصور'' ہے اس بات کا زندہ ثبوت ہیں کہ اسلام کے اندر وسیع انسانی ہمدردی اور انسان اور انسان کے درمیان ہر قسم کے تعصبات سے بالاتر ہو کر حق و انصاف قائم کرنے کی جو روح کارفرما ہے' خلیفہ صاحب اس کے محرم تھے۔

اب گہرائی کی طرف آیئے۔ ہمارے اس زمانے کے عام مذاق کے خلاف خلیفہ عبدالحکیم کا مذاق عارفانہ تھا اور وہ اسلام کے سچے اور حقیقی تصوف سے آشنا تھے۔ وہ خود تو شاید صاحب حال بزرگ نہ تھے مگر ان کے مزاج اور ان کی شخصیت میں اس کا رنگ خاصا رچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مولانا روم کی کرامت کو بھی دخل ہوگا۔ ظاہر ہے جو شخص رومی جیسے صاحب دل پر ایسی کتاب لکھے جو پوری علمی دنیا میں اپنے موضوع پر سند کا حکم رکھتی ہو تو اس کا لکھنے والا خود اس دولت دل سے کیونکر محروم رہ جاتا جو رومی کے ہاں بے دریغ تقسیم ہوتی ہے۔ ''تشبیہات رومی'' سے بھی خلیفہ مرحوم کی شخصیت کے اس رخ پر مزید روشنی پڑتی ہے۔ وہ جدید علوم وفنون کے ماہر اور ان کے بڑے قدر دان تھے مگر طبعی اور مادی علوم کے مطالعہ اور شغف نے ان کے دل کو مردہ اور ان کی روح کو بے ذوق نہیں کر ڈالا تھا۔ ''اسلام کا نظریہ حیات'' میں انہوں نے ''عبادت واطاعت'' پر جو باب لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ پاکستان کا ہر نوجوان اسے بہ غور پڑھے اور وہ کالج کے درجوں میں انگریزی اور اُردو کی نصابی کتب میں جگہ پائے۔ ان کی تحریروں سے یہ بات بخوبی ثابت ہوتی ہے کہ وہ زندگی اور اسلام کی گہری اور روحانی حقیقتوں کے نہ صرف قائل تھے بلکہ ان کے پرجوش مگر غیر ہنگامہ پرور علمبردار اور مبلغ بھی تھے۔

مجھے معلوم ہے کہ اقبال نے عجمی تصوف کے خلاف آواز اٹھائی تھی اور انہوں نے عمر بھر اس کے خلاف جہاد کیا مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ خود اقبال اپنے قلب و روح کے اعتبار سے اسلام کے سچے تصوف کی بڑی عمدہ مثال تھے۔ اقبال کے بعد ان کی اس بے نتیجہ اور حقیقتاً

عالم دین، ابو الکلام جیسے مفسر قرآن، حسین احمد مدنی جیسے شیخ الحدیث، محمد علی جوہر جیسے نڈر سیاسی قائد اور عاشق اسلام موجود تھے۔ لیکن وقت کا اقتضا پورے شعور اور پوری بصیرت کے ساتھ جس شخص کی سمجھ میں آیا اور جس نے اپنے زمانے میں اسلام کے لیے اقتضا بینی کا حق ادا کیا وہ صرف اقبال تھا۔ اس نے اسلامی فکر کو تازہ کرنے، مسلمانوں میں اسلام کی سچی اور گہری محبت پھر سے بیدار کرنے اور اسلام کی تعلیمات پر ان کے یقین و اعتماد کو بحال کرنے میں بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں، پر ان کی کوئی خدمت اور ان کا کوئی کارنامہ ان کی اس خدمت اور ان کے اس کارنامے کا مقابلہ نہیں کرسکتا جو انہوں نے وقت کے تقاضے کو پہچان کر اور بڑے بڑے نامور عالموں کو بے خبر یا گم کردہ راہ دیکھ کر اسلامی قومیت کی حقیقت کو اپنوں اور بیگانوں پر روشن کرنے کے سلسلہ میں انجام دیا۔ اقبال سے پہلے اپنے اپنے دور کے تقاضے جن بزرگوں نے سمجھے اور دیکھے اور پھر تن من دھن سے ان کو پورا کرنے میں لگے رہے، ان میں سر سید، شاہ ولی اللہ، مجدد الف ثانی ہند میں اور ابن تیمیہ، غزالی، رومی، ابو حنیفہ اور احمد بن حنبل کے اسمائے گرامی پورے عالم اسلامی میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔

چنانچہ چوتھی اور آخری اور سب سے اہم بات جو میں کسی مفکر اسلام کے ہاں دیکھتا بھالتا ہوں وہ یہ ہے کہ اپنے زمانے کو اس نے کس حد تک سمجھا اور دیکھا ہے۔ اپنے عہد کے مخصوص اسلامی تقاضوں پر اس کی نظر کتنی اور کیسی ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اس نے، درمے، سخنے قدمے، کیا کچھ کیا ہے۔

اس معیار کے مطابق میں خلیفہ عبدالحکیم کے کام کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ یوں تو خلیفہ صاحب نے خاصی کتابیں اپنی یادگار چھوڑی ہیں۔ ان میں افکار غالب، فکر اقبال، حکمت رومی، داستان دانش، اسلام اینڈ کمیونزم اور ولیم جیمز کی مشہور تصنیف Varieties of Religious Experience کا ترجمہ شامل ہیں۔ لیکن جہاں تک اسلام پر لکھنے کا تعلق ہے ان کا اصل کارنامہ ''اسلام کا نظریہ حیات'' ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں لکھی گئی اور بعد میں اس کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ''تشبیہات رومی'' اور ''اسلام کی بنیادی حقیقتیں'' (خلیفہ صاحب کا مضمون) بھی اس ضمن میں خاص اہمیت رکھتی ہیں۔

''اسلام کا نظریہ حیات'' کا بہ غور مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ خلیفہ صاحب کو اسلامی تعلیمات کی وسعت کا صحیح اور سچا شعور حاصل تھا۔ انہوں نے ایک دو نہیں، متعدد

غیر اسلامی تصوف کے خلاف اٹھائی ہوئی تحریک کو بعض لوگوں نے ایسا رنگ دیا اور اس سے ایسا تاثر پیدا کیا جس سے روح اسلام بری طرح مجروح ہو رہی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ نکلا کہ خدا کی سچی محبت، اس کی عبادت کا ذوق و شوق اور اس کی ذات اقدس سے ذاتی اور زندہ تعلق پیدا کرنے کی آرزو اور لگن کے لیے ان کے اسلام میں کوئی جگہ باقی نہیں رہی۔

ایسے میں خلیفہ عبدالحکیم نے ''حکمت رومی'' ''تشبیہات رومی'' اور ''اسلام کا نظریہ حیات'' کے ان ابواب کی صورت میں جن کا تعلق 'اسلامی خدا پرستی' 'صفات الٰہی' 'صفات ذاتی' اور 'عبادت و اطاعت' سے ہے، جو خدمت انجام دی ہے، اس کی قدر و قیمت اور بڑھ جاتی ہے۔ ان کے سبب سے اسلام کے اصلی تصوف کی تاسیس ہوتی ہے۔

اب توازن کے جزو کو لیجیے۔ خلیفہ صاحب نے ہمارے جدید معاشرتی مسائل کے کئی موضوعات سے اپنی تحریروں میں بحث کی ہے۔ ان کی بحث میں ہر جگہ توازن اور اعتدال کا پہلو پایا جاتا ہے۔ معاشرے میں عورت کے حقوق، جدید تہذیبوں کے صحت مند اور مفید عناصر کا اخذ و قبول، معاشرے میں مفلوک الحال طبقے کی دستگیری و اعانت، ان طبقوں پر قانونی پابندیوں کی سفارش جن کو نفع کاری کی کھلی چھٹی کے باعث ہمارا معاشرہ معاشرتی ناہمواری اور معاشی ناانصافیوں کا شکار ہے حتیٰ کہ یتیم پوتے کی وراثت، ضبط تولید اور خواتین کا سیاسی سرگرمیوں میں شرکت کا سوال...... ان تمام امور میں خلیفہ صاحب نے جو موقف اختیار کیا وہ بہت سے دیگر مفکرین کے مقابلے میں روح اسلام کے زیادہ قریب ہے۔

اب میں اقتضا بینی کی طرف آتا ہوں۔ اسلام جیسی زندہ اور قید زماں سے آزاد تحریک کے لیے ہر زمانے میں کچھ مشکلات، کچھ مسائل خصوصیات کے ساتھ ایسے درپیش ہوتے ہیں جن کے مناسب حل پر اور جن کے بارے میں ملت اسلامیہ کی صحیح رہنمائی پر اسلام کی بقاء اور مسلمانوں کی زندگی کا انحصار ہوتا ہے۔ جو شخص اپنے معاصرین میں سے اسلام کی ضرورت کو پورا کرتا اور اسلام کی یہ بنیادی عصری خدمت سرانجام دیتا ہے وہی شخص، میرے نزدیک، اصلاً امام اور رہنما ہوتا ہے۔ اسی خدمت کی انجام دہی کی صلاحیت کو میں اقتضا بینی کہتا ہوں۔

اقبال کی وفات کے بعد اب تک جو کم و بیش تیس برس کا زمانہ گزرا ہے اس میں ہمارے حالات و احوال میں بڑی اہم اور بنیادی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ آزادی اور ایک آزاد وطن کا حصول بے پناہ فرق پیدا کرتا ہے۔ اقبال اپنی بصیرت اور اسلامی فکر کی روشنی کے ساتھ

ہیں پاکستان کی سرحدوں تک چھوڑ گئے تھے۔ سرحدوں کے اندر اور بعد کے مسائل کو ہمیں خود حل کرنا تھا۔ نئے حالات نے نہایت اہم اور سنگین مسائل پیدا کئے۔ اسلامی آئین کی تشکیل، ملک کے بے پناہ نئے پرانے وسائل کو اسلام کے اصول معاش کی روشنی میں بروئے کار لانا، ملک کے قوانین کو اسلامی سانچے میں ڈھالنا، اپنی سیاسی اور معاشرتی زندگی کو اسلامی خطوط پر چلانا، یورپ اور امریکہ، روس اور چین کی تہذیبوں کی طرف مناسب رویہ اختیار کرنا، اپنی معاشرت کے جمود کو توڑنا، جدید علوم وفنون اور صنعت وحرفت سے متوازن انداز میں استفادہ کرنا، اپنے نظام تعلیم کو نئی اور بنیادی ضرورتوں کے مطابق از سر نو تعمیر کرنا...... یہ اور اس قسم کے بیسیوں ایسے مسائل تھے جن میں پاکستان کی نئی مملکت اور عوام جن کے دل ہمیشہ اسلام کے ساتھ اور اسلام کی خاطر دھڑکتے ہیں، اسلامی اصولوں کی روشنی کے طلبگار اور آرزومند تھے۔

تھوڑے بہت زمانی فصل و بعد کے ساتھ اس میدان میں تین اشخاص اترے: اوّل ابوالاعلیٰ مودودی، دوم، غلام احمد پرویز اور تیسرے خلیفہ عبدالحکیم۔ چند سالوں کے اندر اندر پوزیشن یوں ہوگئی تھی کہ ابوالاعلیٰ مودودی اس مدرسہ فکر اسلامی کی قیادت کررہے تھے جو بدلے ہوئے حالات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتا۔ غلام احمد پرویز اس مکتبہ خیال کو بڑھاوا دے رہے تھے جو صرف بدلے ہوئے حالات ہی کو درخور اعتنا سمجھتا ہے اور خلیفہ عبدالحکیم اعتدال اور بصیرت اور اقتضا بینی کی ان روایات کے علمبردار تھے جن کو اولاً سرسید نے قائم کیا اور درمیان میں اقبال نے نہایت بصیرت اور کامیابی کے ساتھ ترقی دی۔

خلیفہ صاحب نے جس کام کو ہاتھ میں لیا تھا، اس کے لیے وہ پوری طرح مسلح تھے۔ جدید علوم سے واقف، قدیم علوم سے آگاہ، اسلام کے محرم، مغرب کے رمزشناس، دماغ میں سوچنے کی صلاحیت، قلم میں لکھنے کی طاقت اور زبان میں فصاحت و بلاغت کا زور، پھر صحت بھی میسر اور فراغت بھی۔ مگر افسوس کہ وہ اس کام کو پوری طرح سرانجام نہ دے سکے۔

آج سرسید اور اقبال کے خوابوں کی سرزمین میں دوسرے مدرسہ ہائے فکر تو قوی، ذی اثر اور فعال ہیں مگر خود سرسید اور اقبال کا مدرسہ فکر کمزور اور کم اثر ہے اور اس وقت شاید ہماری سب سے بڑی علمی اور اسلامی ضرورت یہ ہے کہ اس کمزوری کو دور کیا جائے۔ دوسرے لفظوں میں اس کام کی تکمیل کی جائے جسے خلیفہ عبدالحکیم مرحوم ادھورا چھوڑ گئے ہیں۔

30

خلیفہ صاحب کا فلسفۂ مذہب

محمد انور خلیل

''اسلام کا نظریہ حیات'' میں خلیفہ عبدالحکیم فرماتے ہیں کہ ''مذہبی زندگی سپردگی کی زندگی ہے۔ یہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے، شخصی خواہشات کو غیر شخصی عقل کے، بے قدر کو قابل قدر کے، دنیا کو آخرت کے، جزوی کو کلی کے تابع کرنے کا نام ہے۔[۱] حیات کی غایت ''لطف اندوزی یا الم پروری نہیں بلکہ اس کو اس طرح بسر کرنا ہے کہ آنے والا کل، گزرنے والے آج سے بہتر ہو۔ حیات کی اصل غایت اصلاح ہے۔ ظاہر اور باطن میں زندگی سکون نا آشنا ہے۔ ہر اعتبار سے اس کا وجود ایک رزم گاہ ہے''۔[۲] خیر و شر یا خوب و ناخوب کے تصادم سے اس کی داستان خونچکان ہے۔ حیات کا مقصد بیرونی اور اندرونی تنازعوں پر غالب آنا ہے۔ ''امن کا آرزو مند ہونا انسان کی فطرت ہے۔ اس لئے ہر دو وجود اسلام یا امن کا آرزو مند ہوتا ہے''[۳] امن، سلامتی یا خوشحالی، مسرت، ترقی۔ یہ ایک ہی حقیقت کے مختلف نام ہیں۔ یہی

ہیں وہ مقدمات جن سے خلیفہ عبدالحکیم ایک نئے علم کلام کی داغ بیل ڈالتے ہیں۔ اس وقت دنیا کو واقعی ایک نئے علم کلام اور نئے فلسفہ مذہب کی ضرورت ہے۔ جو تجربی علوں سے زیادہ حقیقی انسانی زندگی کے مسائل سے عبارت ہو۔ خلیفہ صاحب کے مذہبی اور فلسفیانہ افکار میں ہمیں ایک نیا اسلوب ملتا ہے جس کا اطلاق وہ دور حاضرہ کے مسائل پر کرتے ہیں۔ آج کے انسان کے پاس سب کچھ ہے مگر اس کے وجود میں بے شمار رخنے ہیں، اس کے شعور میں انتشار ہے، وہ پارہ پارہ ہو چکا ہے اور اس کی شخصیت کی جگہ بہت سے چھوٹے چھوٹے خانوں نے لے لی ہے جن کا آپس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ اگر ہم ارتقاء کے نقطہ نظر سے غور کریں تو معلوم ہوگا کہ وہ ارتقاء جس کی خصوصیت تنوع، ارتباط اور تنبیت ہے انسان کی سطح پر آکر بہت زیادہ عرصے تک اپنی اصل صورت قائم نہ رکھ سکا۔ چنانچہ موجودہ دور میں آکر ایک بے لگام، خود رو اور بے ہنگم روحانی تصادم میں انحطاط پذیر ہو گیا ہے۔ انسان کی تمام حیات آفرین قوتوں کا رخ سائنس اور فنیات کی طرف مڑ گیا ہے اور عام ترقی محض مادی خوشحالی کے آدرش میں تبدیل ہو چکی ہے۔ ذہن و جسم، روح و مادہ پر مشتمل ناقابل تقسیم وحدت میں سے صرف جسم، مادہ اور مدار کو مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ اگر یہ سلسلہ یونہی جاری رہا تو انسانیت کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگر سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی اور روحانیت کی نفی کو لازم و ملزوم سمجھا جاتا رہا تو بنی نوع انسان کا کیا حشر ہوگا؟ اجتماعی شعور کی غیر فطری تقسیم نے جو کرب پیدا کیا ہے اس کی تلافی کا کیا امکان ہے؟ مادی ترقی کی دوڑ میں کچلی جانے والی روح کا کیا علاج ہو سکتا ہے؟ یہ اور ایسے ہی سینکڑوں سوال ہیں جو آج کے انسان کو پیش ہیں۔

بنی نوع انسان کو اس داخلی اضطراب و خلجان سے نجات دلانے میں مذہب ایک بڑی قوت بن سکتا ہے۔ لیکن سیاسی گروہ بندی کی طرح مذہبی فرقہ واریت نے کل انسانیت کو باہم دست و گریبان جماعتوں میں بدل دیا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ مذہب اپنی اصل میں ایک متحد رہنے اور متحد رکھنے والی قوت ہے۔ لیکن تاریخ ایسے ہلاکت خیز واقعات سے بھری پڑی ہے جن کی بنیاد مذہبی منافرت پر رہی۔ تاریخ مذاہب میں یہ ایک ایسا تضاد ہے جس کا رفع کرنا فلسفہ مذہب کا اولین منصب ہے۔ کیا کوئی ایسا مذہب ممکن ہے جسے کل انسانیت کا مذہب کہا جا سکے؟ ایک ایسا عالمگیر مذہب جو تمام مذاہب کی ایک وحدت ہو، جو کل انسانیت کے لیے ایک مکمل ضابطہ حیات بن سکے، جس کے اصول معروضی ہوں، ہمہ گیر ہوں؟

مذہب کا مستقبل انسانیت کا مستقبل ہے۔ اگر تمام مذاہب ایک ہمہ گیر نظام دین میں ضم ہو سکتے ہیں تو بنی نوع انسان کے مستقبل سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم کی فکری کاوشوں کا بیشتر حصہ اسی ایک بنیادی مسئلہ کی عقدہ کشائی ہے۔ ان کے فلسفیانہ تاملات کا مقصد ہمیشہ یہ رہا کہ عالمگیر مذہب کے بنیادی اصولوں کو اس طرح اجاگر کیا جائے کہ وہ اتنے ہی قابل یقین ہوں جتنے کہ سائنسی حقائق۔ چنانچہ دین و دانش کے مسائل پر گہری نظر رکھنے والے ہم عصر حکما میں خلیفہ صاحب اپنے تصور مذہب کے لحاظ سے ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ اقبال کی طرح وہ بھی یہ پختہ عقیدہ رکھتے تھے کہ تقلید پرستی اور مذہب کے ثانوی پہلوؤں پر زور دینے سے انسانیت باہم متخالف گروہوں میں بٹ جاتی ہے اور مذہبی تعصب و تعذیب کا ذریعہ بنتی ہے۔[۴] جہاں تک ظاہری رسوم کا تعلق ہے مختلف قوموں کا مذاق مختلف ہے مگر مذہب ایک بلند تر شئے ہے، یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے۔ ایسا ضابطہ حیات جس میں کوئی سخت گیری نہیں۔ خلیفہ صاحب کی فکر میں ہمہ گیر مذہب ایک آزادانہ نظم ہے۔ جو مختلف حالات و کوائف، مختلف اقوام و ملل کے مخصوص تجربات سے مطابقت رکھنے کی بے پناہ صلاحیت رکھتا ہے۔ مذہبی زندگی کا باطن وہ بے مثال جزئیت ہے جو کلیت کی تلاش میں ہر مزاحمت میں سے اپنے لئے راستہ نکال لیتی ہے۔

کل انسانیت تمام تفصیلات میں کسی ایک سلسلہ رسوم کی پابندی نہیں کر سکتی۔ مذہبی اعمال میں اختلاف تا ابد جاری رہے گا۔ لیکن اس کے باوجود دنیا کی تمام قوموں کو جس طرح عالمگیر امن اور خیر خواہی کے لیے چند بنیادی اصولوں پر متحد ہونے کی دعوت دینا زمانہ کا تقاضہ ہے اسی طرح ایک عالمگیر مذہب کے بنیادی اصولوں کو پوری انسانیت کے سامنے پیش کرنا بھی وقت کی اہم ترین ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود مذہبی رواداری کے اعلیٰ مسلک کے، انسان مذہبی اضافیت کے اصول کو اپنا نہیں سکتے کیونکہ یہ اصول بہ باطن اتحاد انسانی کے منافی ہے۔ اعلیٰ مذہب کا تقاضا ہی یہ ہے اور خود انسانی برادری کے آفاقی تصور میں یہ امر پنہاں ہے کہ ایسے عالمگیر اصول موجود ہیں جن پر تمام انسانوں میں باہمی توافق حسنہ و تعامل خیر پیدا ہو سکتا ہے۔ یہی عالمگیر مذہب ہے جو اضافی مذاہب سے ارفع ہے۔ مگر آج کل کسی عالمگیر مذہب کے محض امکان کے متعلق سوچنا بھی بظاہر نری خیال آرائی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ماضی میں بنی نوع انسان کبھی ایک مذہب کے پیرو نہیں رہے اور آج بھی وحدت انسانی

کثرت مذاہب سے پاش پاش ہے۔ پھر یہ مذاہب بذات خود بے شمار فرقوں میں تقسیم ہیں۔ خلیفہ صاحب کہا کرتے تھے کہ اس تقسیم کی سب سے بڑی مثال عیسائیت ہے۔ عیسائیت میں فرقہ بندی کا یہ عالم ہے کہ صرف امریکی مردم شماری میں تین سو سے زیادہ فرقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہندومت بھی بے شمار عقائد اور رواجوں کے لیے ایک مجموعی نام ہے۔ ہندومت کا ایک عجیب پہلو یہ ہے کہ اس میں کوئی مشترک عقیدہ سرے سے ہے ہی نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ ہندوستانی مردم شماری میں لفظ ''ہندو'' کی تعریف صرف منفی طور پر کی گئی ہے۔ یعنی ہندوستان کا ایسا باشندہ جو مسلمان، عیسائی یا بودھ نہ ہو وہ ''ہندو'' کہلاتا ہے۔ بودھ مت بھی بہت سے فرقوں میں تقسیم ہے اور روحانیت اور مہاتما بدھ کی الوہیت کی تکریم ہی ان فرقوں کو یکجا کیے ہوئے ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ اسلام میں بھی فرقے موجود ہیں مگر ان فرقوں کے مابین اختلافات کی نوعیت سیاسی یا فقہی ہے۔ سارے فرقے اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں لہٰذا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اسلام میں ایسے فرقوں کا کوئی وجود نہیں ہے جن کے درمیان کوئی واضح حد فاصل ہو۔ شیعوں کے نزدیک رسول اکرم ﷺ کے بعد منصب خلافت حضرت علیؓ کو ملنا چاہئے تھا، انتخاب یا چناؤ کے ذریعہ نہیں بلکہ نبی اکرم ﷺ سے روحانی قربت کی وجہ سے۔ ان کے خیال میں خلافت یا امامت کا حق روحانی وراثت کے طور پر منتقل ہونا چاہئے تھا۔

بہر حال اگر انسان کے کلی نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو مذہبی فرقوں اور عقائد کی نامعقول اور افسوسناک جنگ کے اندوھناک مناظر بنی نوع انسان کے اتحاد اور استحکام پر یقین رکھنے والوں کے لیے ہر زمانہ میں حقیقی مسئلہ رہے ہیں۔ اس سلسلہ میں یہ امر ملحوظ رکھنا چاہئے کہ روحانی مذاہب کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جاتا اور ان پر عمل کیا جاتا تو یہ واقعہ انسانیت کی شیرازہ بندی کے لیے ایک عظیم قوت ثابت ہوتا۔ انسان اپنی روح کو پالیتا اور اپنی منزل و مقصد کو پہنچ جاتا۔ لیکن ہوا اس کے برعکس۔ سطحی مذہبیت نے انسانوں کو انسانوں سے متصادم کیا ہے اور آج بھی خام مذہبیت کی وجہ سے انسان ایک دوسرے سے کٹے ہوئے ہیں۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ سائنس جس کا کوئی مذہب نہیں ہے اور ٹیکنالوجی جو سائنس کے اطلاق سے پیدا ہوئی دنیا کو ایک بنا چکے ہیں لیکن انسان کے اتحاد کی راہ میں دو قوتیں حائل ہیں: ایک تشدد آمیز مذہب جو حق و صداقت اور نجات کی ٹھیکیداری کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسری تنگدلانہ

قوم پرستی جس کی بنیاد زبان، نسل یا جغرافیائی وحدت پر ہوتی ہے۔

مجلس اقوام کا تصور بیسویں صدی کی ہلاکت خیزیوں کے درمیان پہلا بھٹکا ہوا قدم تھا جس کا مقصد اقوام عالم کے لیے ایک مشترک پلیٹ فارم بنانا تھا تاکہ وہ آپس کے معاملات میں اخلاقیت کے اصول اپنا سکیں اور خود کو ان کا پابند رکھ سکیں۔ لیکن ہر قوم میں ذاتی خودسری کی جڑیں اتنی زیادہ گہری تھیں کہ اس کو کسی واحد عالمگیر ضابطہ اخلاق کا پابند بنانا مشکل تھا۔ چنانچہ بیس سال کے عرصہ میں قومیں ایک دوسرے سے ٹکرائیں اور پوری قوت سے ٹکرائیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اب صورت یہ ہے کہ سائنس اگر یہ واضح نہ کر چکی ہوتی کہ یا تو دنیا میں جنگ نہیں ہوگی یا پھر پوری انسانیت مٹ جائے گی تو تیسری جنگ بھی چھڑ چکی ہوتی۔ اس وقت اگر باہمی کشیدگی کے باوجود جنگ نہیں ہوتی تو اس لئے نہیں کہ قوموں کی خودسری یا خودغرضی میں کمی ہوئی ہے بلکہ اس لئے کہ سائنسی ایجادات کی ہلاکت آفرینی نے انہیں دہشت زدہ کر دیا ہے۔ اس وقت جب کہ معلمین اخلاق انسان کی سرشت بدلنے میں کامیاب نہ ہو سکے سائنس کی خالص مادیت کامیاب ہو چکی ہے۔ چنانچہ شاید اب عالمی جنگ نہیں ہوگی کیونکہ سائنس آئندہ کی جنگ اس انداز سے پیش کرتی ہے کہ نہ فاتح رہے گا نہ مفتوح۔ جیسا کہ اوپر گزرا کسی روحانی قدر نے نہیں بلکہ ہلاکت کے خوف نے امن کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔ جنگ کے اسباب جوں کے توں موجود ہیں۔ یہ منفی قسم کا امن کسی پائیدار انسانیت کا ضامن نہیں ہو سکتا۔

تو کیا اس کا یہ مطلب ہے کہ ہمیں مذہب سے مدد لینی چاہئے؟ انسانیت کی تاریخ میں مذہب کے وظیفہ کا جائزہ لیتے ہوئے خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ کوئی ایسا مذہب جو بہت سی جنگوں کا سبب بنا ہے انسانوں کو متحد نہیں کر سکتا۔ خلیفہ صاحب بطور خاص واضح کرتے ہیں کہ مسلمانوں نے دوسرے مذہب کے پیروؤں کو نیست و نابو کرنے یا انہیں اپنا مذہب قبول کرنے پر مجبور کرنے کے لیے کبھی جنگ نہیں کی۔ کبھی کبھی مسلم فرقوں میں کشیدگی بھی پیدا ہوئی ہے اور ایک دوسرے پر دباؤ ڈالنے اور تکلیف پہنچانے کے اکا دکا واقعات بھی ہوئے ہیں لیکن اسلام کے کسی فرقے کے لوگ اس مقصد سے کبھی جمع نہیں ہوئے کہ کسی دوسرے مذہب یا کسی دوسرے مسلم فرقے کو صفحہ ہستی سے مٹا دیں۔ اس وجہ سے اسلام عالم انسان کی وحدت کے لیے مثبت اساس کا کام دے سکتا ہے۔

تاریخ کے تجزیہ سے ثابت ہوتا ہے کہ مذہبی جنگیں صرف یورپ کی تاریخ کا ہی خصوصی باب ہیں۔ قرون اولی کے مسلمانوں نے کبھی کسی مذہب کے خلاف تلوار نہیں اٹھائی۔ جب عرب کے نیم مہذب قبیلے خود اسلام کو تشدد سے نیست و نابود کرنے کے لیے برسرِ پیکار ہوئے تو ان مسلمانوں نے مدافعانہ جنگیں کیں، یہاں تک کہ وہ محفوظ و مامون ہو گئے۔ اس امن کو انہوں نے مذہبی آزادی اور رواداری کے لیے استعمال کیا۔ اس کے برخلاف روما میں مذہبی آزادی کبھی نہیں تھی اور پوری مسیحی دنیا دو سو سال تک محض اسلام کو نیست و نابود کرنے کے لیے مسلح ہو کر حملہ آور ہوتی رہی۔

مسلمان یا عیسائی ماضی میں کچھ ہی کرتے رہے ہوں مگر آج عام انسان کی ذہنیت اس حد تک بدل چکی ہے کہ مذہبی جنگیں ممکن نہیں رہی ہیں۔ عالمی امن کے حصول کی راہ میں یہ بھی یقیناً قابل تعریف قدم ہے۔ لیکن مسلح جنگ کے امکان کا ختم ہو جانا ہی کافی نہیں ہے۔ ایک دوسرے سے الگ رہنے کا رجحان، جذباتی بیگانگی اور چھپی ہوئی دشمنی بدستور موجود ہیں۔ ہر صاحب عقل، ہر صاحب نظر اور ہر محب انسانیت اس صورتحال کو یقیناً تشویش کی نظر سے دیکھتا ہے۔

صدیوں کے ذہنی نشو و نما اور معروضی فکر کے بعد طبیعی فطرت کی ایک ایسی سائنس کا وجود ممکن ہو گیا ہے جسے ہر قوم کے سائنسدان احترام کی نظر سے دیکھتے ہوں۔ تمام قوموں کے لیے ایک سیاسی پلیٹ فارم حقیقت بن چکا ہے۔ قوموں اور افراد کے بنیادی حقوق ہر قوم نے تسلیم کر لئے ہیں۔ البتہ اس میں ابھی وقت لگے گا کہ عملاً ہر جگہ ان کا احترام ہونے لگے۔ کیا مذہب کے معاملہ میں بھی کسی ایسے سمجھوتے کا امکان ہے؟ انسانی ذہن جس نے ایک متحد رہنے اور متحد کرنے والی سائنس اور ٹیکنالوجی کی تخلیق کی اور جس نے انسان کے بنیادی حقوق پر سمجھوتہ کرانے کے ساتھ ساتھ بین الاقوامی امن کے تحفظ کے لیے ایک ارادہ کو وجود بخشا، بین المذہبی کشیدگی کو اگر ختم نہیں کر سکتا تو کم از کم اس کا زور ضرور توڑ سکتا ہے اور بین المذہب میں خیر سگالی کے فروغ کے لیے مثبت قدم بھی اٹھا سکتا ہے۔

خلیفہ صاحب کا نظریہ یہ ہے کہ قومیں اور مذہبی عقیدے اور فرقے تاریخ انسانی کے تمام دیگر واقعات کی طرح بالآخر انفرادی اور سماجی نفسیات کی تخلیق ہیں۔ تاریخ کی بالفعل قوتیں ہر دور کے ساتھ بدلتی رہی ہیں اور مذہبی معتقدات و رسوم کو متغیر کرنے والے نفسی و

سماجی معطیات بھی تغیر پذیر رہے ہیں۔ جو چیز خود تغیر کی پیداوار ہو اس کے مزید تغیر کے امکانات ختم نہیں ہو سکتے۔ یہاں جس سوال کا جواب درکار ہے وہ یہ ہے کہ مذہب کے معاملے میں تنگدلانہ فرقہ پرستی سے کسی قسم کی آفاقیت و ہمہ گیری کی طرف نشوونما کا کوئی عمل آہستہ آہستہ رونما ہوا ہے یا نہیں؟

خوش قسمتی سے ہم اس سوال کا جواب اس بات میں دے سکتے ہیں۔ ایک وہ وقت تھا جب ہر قبیلہ کے خود اس کے ذاتی دیوتا ہوتے تھے جو اس قبیلہ سے تو شفقت اور محبت رکھتے لیکن باقی تمام دیوتاؤں اور ان کی پرستش کرنے والوں کے دشمن ہوتے۔ اس مرحلہ پر مذہب اور اس کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کی نوعیت قبائلی تھی۔ ان دیوتاؤں کو عظمت اس لئے ملتی تھی کہ وہ پورے قبیلے کی اجتماعی انا کے مظہر سمجھے جاتے تھے۔ یہ دیوتا خود آپس کے جھگڑوں کے ساتھ ساتھ اپنے عبادت گزاروں کی جنگوں میں بھی سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ بنی اسرائیل کا ارتقاء اس دور سے اگلا قدم تھا۔ یہ بنی اسرائیل کے مذہبی شعور کی نشوونما تھی۔ جس نے اپنے اردگرد کے قبائل کے دیوتاؤں کو کم تر درجے کا ٹھہرا کر انہیں چھوڑنے میں پہل کی اور بالآخر ان کے وجود ہی سے انکار کر بیٹھے۔ اب صرف ایک خدا باقی تھا' عالم فطرت اور عالم انسان کا خالق اور رب۔

بے شمار دیوتاؤں کے تصور کے خاتمہ نے انسانیت کو ایک بنانا شروع کیا کیونکہ ایک ایسی منظم دنیا کا تصور ممکن ہو سکا جس کا مبدا ایک خالق اعلیٰ کی مشیت تخلیق ہو اور جسے برقرار منظم رکھنے والی قوت بھی اس کی ذات یکتا ہو۔ لیکن انسان کے قدیم قبائلی رجحان کی جڑیں بہت گہری تھیں اسے پوری طرح دبایا نہ جا سکا۔ اس رجحان کی وجہ سے وہ ایک خدا بھی جو قادر مطلق اور عالم کلی ہونے کی حیثیت سے عالمگیر اور آفاقی ہے محض ایک خاص قوم کی تقدیر سے سروکار رکھنے والا سمجھا جانے لگا۔ ''منتخب قوم'' یا ''برگزیدہ بندوں'' کے تصور نے الہیت کی وسیع وعریض عمارت میں قبائلیت کے داخلے کے لیے چور دروازہ کھول دیا اور خدا بایں وجہ عالمگیر نہ رہا بس واحد و برتر ذات کے طور پر باقی رہا جس کا کام اپنے ماننے والوں کو برتری دلانا تھا۔ چنانچہ توحیدی مذاہب آپس کی دشمنی میں ان کثرت پرستانہ مذاہب کو پیچھے چھوڑ گئے جنہوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کے ساتھ رفتہ رفتہ رواداری کا سلوک شروع کر دیا تھا۔ خدائے واحد اُن کے ہاں ایک جابر فرمانروا یعنی رب العسا کر بن گیا۔ یہودیوں اور

عیسائیوں کی جنگ کو دیکھئے اور اسلام کے ماننے والوں کے ساتھ ان دونوں کے ٹکراؤ پر نظر ڈالئے۔ اگر خدا صحیح معنوں میں کل بنی نوع انسان کا پالن ہار ہے تو وہ بنی نوع انسان کے ایک بڑے حصے کے ساتھ سوتیلی اولاد کا سا سلوک نہیں کر سکتا اور نہ نسل انسانی کے لیے اتنے بڑے حصے کو محض دوزخ کا ایندھن بنانے کے لیے تخلیق کر سکتا ہے۔ عالمگیر مذہبی شعور کا سنگ بنیاد اس اصول کو بنایا جا سکتا ہے۔ چنانچہ اس کی روشنی میں خلیفہ صاحب بنی اسرائیل کے مذہبی شعور کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہودی ذہنیت کی جڑیں منتخب قوم یا برگزیدہ بندوں کے تصور میں پیوست ہیں گو ان کے بڑے بڑے پیغمبر اخلاقی اصولوں کی عظمت کا درس دیتے تھے لیکن یہ اخلاقی اصول بھی یہودیوں کو زیادہ تر ان کی اپنی امت کی تقدیر سے متعلق نظر آتے ہیں۔ ان کے ہاں خدا کو بھی خاص طور سے ان ہی کے رنج و راحت سے سروکار رہتا ہے۔ اسرائیلی پیغمبروں میں حضرت عیسیٰ غالباً سب سے زیادہ عالمگیر انسانیت کے داعی تھے۔ خلیفہ صاحب نے جس بصیرت اور روشن ضمیری کے ساتھ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور نصرانیت کے ارتقاء کا جائزہ عالمگیر مذہب کے نقطہ نظر سے اپنے مقالہ غیر مطبوعہ (Is Universal Religion Possible?) میں کیا ہے وہ مذہبی ادب میں اپنی نظیر آپ ہے۔ خلیفہ صاحب حضرت عیسیٰ کے بارے میں رقمطراز ہیں کہ ان کی روحانیت کا دائرہ بہت وسیع تھا اور یہ بڑی روحانی اور اخلاقی اصلاح کا باعث بنا۔ لیکن انجیل مقدس میں بعض ایسے بیانات بھی ہیں جو ان کی وسعت نظر اور محبت و شفقت سے متوافق نہیں ہیں۔ مثلاً یہ اشتعال انگیز بیان کہ میں اپنے بچوں کا کھانا کتوں کے آگے نہیں ڈال سکتا۔ اس بیان میں کتوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو حضرت عیسیٰ کی قوم (بنی اسرائیل) یا امت میں شامل نہ ہوں۔ ایسے بیانات حضرت عیسیٰ کی تعلیمات سے اس قدر متخالف ہیں کہ آدمی یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ یا تو یہ اصل بیانات کی تحریف ہیں یا بعد کا اضافہ ہیں۔ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات نہ صرف رواداری بلکہ دشمن تک سے مثبت اور تخلیقی شفقت و محبت کا درس ہیں۔ دشمن سے محبت کا سبق ایک دنیا دار عمل پسند انسان کے لیے ایک ایسی خام خیالی کی حیثیت رکھتا ہے جو افراد اور اقوام کی زندگی میں کسی عملی افادیت کا حامل نہیں ہو سکتا لیکن تصور اور مثال کی ماہیت ہی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ حقیقت اور واقعہ سے آگے رہتا ہے۔ تمام صحیح اخلاقی اور روحانی ترقی اور عالمی امن کے فروغ کے امکانات کا رخ اسی طرف ہوتا ہے جس کی نشاندہی اس کی عینیت میں ہوتی ہے۔

اگر عیسائیت کی نشوونما ان خطوط پر ہوتی جو حضرت عیسیٰ نے متعین فرما دیے تھے تو یہ بنی نوع انسان کے لیے نعمت عظمیٰ ثابت ہوتی لیکن افسوس کہ ان کے ماننے والوں نے کلیسا کے جنگی نظام کی بنیاد ڈالی اور اس کا جواز انجیل مقدس سے پیش کیا۔ خود حضرت عیسیٰ کا قول ہے کہ میں امن نہیں تلوار لے کر آیا ہوں۔ سامراجی روم کی طاقت جس لمحہ عیسائیت کی حامی بنی اسی لمحہ سے عیسائیت رومی سامراجیت کے سانچوں میں ڈھلنا شروع ہوئی اور رومن کیتھولک چرچ نے خود کو اقتدار کی جنگ کے قالب میں ڈھال لیا۔ مظلوم و مغلوب ظالم بن گئے اور انہوں نے آزادی ضمیر کا گلا گھونٹ دیا۔ احتساب خانوں میں رونگٹے کھڑے کر دینے والی اذیتیں امن کے اس علمبردار کے نام پر روا رکھی گئیں جس نے بدی پر محبت سے فتح پانے کا سبق دیا تھا اور تشدد سے منع فرمایا تھا۔

عیسائیت بھی ''منتخب قوم'' یا ''برگزیدہ بندوں'' کے تصور کا شکار ہوگئی۔ اب عیسائیت کے ہیرو منتخب قوم یا برگزیدہ بندے قرار پائے۔ مذہب ایک عالمگیر انسانی مظہر کے طور پر نشوونما پانے کی بجائے تاریخ کا ایک واقعہ بن کر رہ گیا۔ کلیسائی ازعانات میں جنہیں خود حضرت عیسیٰ جیسا وحدانیت پسند بھی نہ سمجھ پاتا ایک طرف تو یہودیت کے اثرات ہیں اور دوسری طرف یونانی و رومی اصنام پرستی کی سمیت ہے۔ روما میں ہیروؤں اور شہنشاہوں کو دیوتا بنا کر پوجنے کا رجحان ہمیشہ سے رہا ہے۔ لہٰذا جب عیسائیت رومی علاقوں تک پہنچی تو حضرت عیسیٰ کو خود اللہ تعالیٰ کے مماثل قرار دینا مشکل نہ ہوا۔ خدا کی موت اور اس کی دوبارہ حیات کے بت پرستانہ تصورات کو کلیسائی عیسائیت کے اندر داخل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ تجسیم، مصلوبیت، کفارہ، حضرت عیسیٰ کی پیدائش اور موت کے معجزے، یعنی سریت پسندی اور یونانی مابعد الطبیعیات کے ساتھ ساتھ رمز پرستی عیسائیت کی مرکزی صداقتیں قرار پائے۔ حضرت عیسیٰ ان تمام باتوں کو یقیناً کفر قرار دیتے۔ ان کی سمجھ میں یہ بات کبھی نہ آتی کہ خدا کی ماں یا خدا کی موت جیسی اصطلاحات کا بھی وجود ہو سکتا ہے۔ وہ انسان کے گناہوں سے عفو و درگزر اور رحمت و شفقت کی صورت میں تو خدا کو دیکھ اور سمجھ سکتے تھے لیکن ایسا خدا ان کے نزدیک پرلے درجہ کی حماقت سے زیادہ نہ ہوتا جو ایک انسانی جسم کا قالب اختیار کر لے اور انسانی گناہوں کی پاداش میں مارا جائے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس تفصیل کا مقصد یہ واضح کرنا ہے کہ اگر حضرت عیسیٰ کی خالص وحدانیت جس میں خدا کا لازمی وصف عالمگیر

رحمت و شفقت تھا تثلیث یہودی تصور کی باقیات اور اصنام پرستانہ سریت اور مابعد الطبعیات سے ملوث نہ ہو جاتی تو شاید مذہبی ذہنیت رکھنے والی پوری انسانیت کا دین بن جاتی۔

عیسائیت اپنے ابتدائی دور میں زندگی کے ساتھ منفی رویہ اختیار کرنے کے سبب رہبانیت پسند ہو گئی جب کہ جنت اور دوزخ اس دنیا سے الگ، زمان و مکاں سے ماورٰی اور کوئی طبعی مقام نہیں ہے۔ جنت تو خود انسان کی روح اور اس کے دل میں ہے اور حضرت عیسٰی نے وعدہ کیا ہے کہ جو لوگ اس کو اپنائیں گے وہ دنیا کی نعمتوں سے محروم نہیں رکھے جائیں گے کیونکہ روح اور دل میں دنیا کی ہر نعمت سما سکتی ہے۔ ان کا مقصد اس سے یہ تھا کہ تمام اقدار ایک قدر یعنی صفائی قلب میں سمو دی جائیں۔ اگر زندگی کی نعمتوں کو بالذات مقصد بنا لیا جائے اور انہیں وسیلہ سمجھنے کی بجائے بالذات داخلی قدر کا حامل ٹھہرایا جائے اور ہر چیز کی انتہا ان ہی میں تلاش کی جائے تو نعمتیں نعمتیں نہیں رہتیں کیونکہ جو لوگ صرف ان نعمتوں کو ہی زندگی سمجھتے رہیں وہ ان کے حصول کی کوشش میں زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ اس کے برعکس جو لوگ اصل اور حقیقی زندگی کو اپنا مقصد بناتے ہیں ان کے لیے مادی نعمتیں محض ذریعہ ہوتی ہیں مقصد نہیں۔ گویا سوال اولیت کا ہے یعنی وہ کیا چیز ہے جسے قدر اعلیٰ کے طور پر سب سے پہلے حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔

قدر ایک مجرد تصور ہے۔ مجرد تصورات کی تشریح کرنا یا ان کے متعلقات کی وضاحت کرنا نہایت دشوار ہے کیونکہ وہ تمام الفاظ جو مجرد تصورات کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں ایک مفہوم تو رکھتے ہیں لیکن ان کا مصداق نہیں ہوتا۔ برخلاف اس کے جو الفاظ مقرون اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں ان کی تشریح میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ میں جب قلم کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو اس کی تشریح ضروری نہیں ہوتی۔ ہر شخص آسانی سے میرا مفہوم سمجھ جاتا ہے۔ لیکن سچائی اور نیکی جیسے مجرد تصورات تشریح طلب ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ سچائی اور نیکی کے الفاظ ہم مختلف مواقع پر مختلف سیاق میں استعمال کرتے اور سنتے رہتے ہیں، اس لئے ان کے مفہوم کا ایک خاکہ سا ہمارے ذہن میں ضرور ہوتا ہے لیکن اگر لفظ ''نیکی'' کے مکمل مفہوم کو بیان کرنے کے لیے ہم سے کہا جائے تو ہمیں احساس ہوگا کہ ہم جس لفظ کو بظاہر آسان سمجھ رہے تھے اور جس کے مفہوم کے متعلق ہمارے دل میں پہلے کوئی شبہ بھی نہیں تھا، وہ واقعتاً کتنا پہلو دار ہے۔ قدر کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہم سب قدر کا لفظ سنتے یا بولتے

کی موجودگی یا ذرا سا لمس مرتے ہوؤں کو جلا دیتا۔ وہ امراض کے نہیں ذہنی اور جسمانی صحت کے مسیحا تھے۔

یہ واقعہ مذہبی تاریخ کے عظیم ترین المیوں میں سے ایک ہے کہ ابتداء ہی سے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے میں غلطی ہو رہی ہے۔ یہودی پیشواؤں نے جو تمام اصلاحی پیغمبروں کے ہمیشہ دشمن رہے حضرت عیسیٰ کو کافر اور باغی قرار دیا کیونکہ ان کی تعلیم یہ تھی کہ قانون انسان کے لیے بنایا گیا ہے، انسان قانون کے لیے نہیں بنایا گیا۔[۶] نتیجیت کو آسمانی مذاہب کا حریف سمجھ لیا جاتا ہے لیکن حضرت عیسیٰ کی شکل میں ہمیں ایک عظیم نتیجیت پسند نظر آتا ہے جو اشیاء کی صداقت کو صرف اقدار حیات کی کسوٹی پر پرکھتا ہے۔ ولیم جیمز اور اس جیسے نتیجیت پسندوں نے جو کچھ کیا وہ اتنا کہ حضرت عیسیٰ کے اس اصول یا حکیمانہ قول کی فلسفیانہ تشریح کر دی کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ تنگ دل اور کٹر یہودی علماء جن کے لیے مذہب بڑی حد تک ایک بے مغز چھلکا تھا ایک ایسے شخص کو نہ سمجھ سکے جس کے نزدیک روح کی آزادانہ زندگی ہی صحیح مذہب تھی اور جیسا کہ انجیل مقدس کے مندرجات سے واضح ہو جاتا ہے کہ خود حضرت عیسیٰ کے قریب ترین حواری بھی انہیں نہ سمجھ سکے۔ وہ انہیں ایک قسم کا ایسا عظیم جادوگر سمجھتے تھے جو انسانوں کے جسم سے برائیاں نچوڑ کر ان برائیوں کو معصوم جانوروں کے جسم میں پھونک دے اور جانور ان برائیوں کے ساتھ سسک سسک کر ختم ہو جائیں۔ حضرت عیسیٰ کی روحانیت کل مخلوق سے بے حد وحساب محبت وشفقت کے علاوہ کچھ نہیں۔ لیکن اگر ان کے حواری ان کی اس روحانیت کا عشر عشیر بھی سمجھ لیتے تو ایسے بے رحمانہ فعل کو ان سے منسوب نہ کرتے۔ کیا کوئی روحانی انسان انجیر کے درخت کو محض اس لئے بددعا دے سکتا کہ وہ طبیعی اسباب کی بناء پر بے برگ و بار ہے اور اس نے اسے مایوس کیا ہے؟ یہ حواری ان کی عالم جنت کی تشبیہ کو بھی سمجھ نہ سکے اور اس کے متعلق بچکانہ اور احمقانہ سوال کرتے رہے۔ انجیل مقدس کے مندرجات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ کو صلیب پر چڑھایا گیا تو یہی حواری مبہوت ہو کر رہ گئے اور جب قبر میں اتار دیئے جانے کے تین دن بعد انہوں نے حضرت عیسیٰ کو زندہ سلامت چلتے پھرتے اور قبر کو خالی دیکھا تو انہیں ہوش آیا اور وہ پھر حضرت عیسیٰ پر ایمان لے آئے۔ انہوں نے اسے ایک غیر معمولی واقعہ سمجھا اور موت پر حضرت عیسیٰ کی فتح کا ثبوت قرار دیا۔ انہیں یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ ایسا واقعہ جو نہ صرف ولیوں

ہیں تو ہمارے ذہن میں کوئی نہ کوئی مفہوم ضرور ہوتا ہے لیکن جب ہم اس مفہوم کے بیان کی طرف آتے ہیں تو وہ ہلکا سا خاکہ بھی اڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو تشریح کی ذاتی کوشش سے پہلے موجود تھا۔ اس دشواری کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم مجرد تصورات کو ان مقرون ٹھوس اشیاء، واقعات یا حقائق کے حوالے سے ہی سمجھ سکتے ہیں جن میں اس مجرد تصور کا کوئی نہ کوئی پرتو نظر آتا ہو۔ مثلاً جب ہم قدر کی گفتگو کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں خود قدر نہیں بلکہ قابل قدر یا قدر کی حامل اشیاء، واقعات یا اصول ہوتے ہیں اور ہم انہی کو قدر کی تشریح کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ گویا اقدار کی یافت اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ وہ طبیعی دنیا میں ظاہر نہ ہوں اور انسان خود بھی طبیعی دنیا کا ایک حصہ ہے لہٰذا کوئی مذہب جو اس دنیا سے ماورئی کسی اور دنیا تک محدود رہتا ہو صحیح معنوں میں مذہب نہیں ہو سکتا۔ عیسائیت دوسری دنیا سے سروکار رکھ کر اس دنیا کے باسیوں کے لیے مذہب کی حیثیت سے کسی مقام کی مستحق نہیں رہتی حالانکہ حضرت عیسیٰ کوئی ماورائی صوفی نہیں تھے اور نہ ان کا نقطہ نظر ماورائی نقطہ نظر تھا۔ ایک عالمگیر رحمت و شفقت کے طور پر خدا کے تصور سے جو حضرت عیسیٰ کا تھا منفی سریت اور رہبانیت کا تصور کسی طرح پیدا نہیں ہوتا۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ خدا کی لافانی اور لامتناہی رحمت و شفقت تخلیقی رحمت و شفقت ہی ہو سکتی ہے...... ایسی رحمت و شفقت جو ان ہستیوں کی تخلیق کر رہی ہو جو اس رحمت و شفقت کی معروض بھی ہوں اور موضوع بھی۔ خدا اور ان ہستیوں کے درمیان ایک شخصی اضافت و نسبت ہونی چاہئے لیکن اضافتیں اور نسبتیں خلاء میں موجود نہیں ہوا کرتیں۔ ان کے لیے اشیاء اور ہستیوں کے عوالم کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر عالم روح عالم غایات ہے تو ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جو ان غایات کی تکمیل کے لیے وسائل فراہم کر سکتے۔[۵] عالم فطرت کو عالم وسائل سمجھا جا سکتا ہے۔ تخلیقی محبت و شفقت کو ایسے جمال کی تخلیق کرنی چاہئے جو صورت و اشکال میں ظاہر ہو سکے۔ چنانچہ ایک صحت مند انسانی جسم خدا کی تخلیقی محبت کا انتہائی جمیل اور قابل تعریف شاہکار ہوتا ہے۔ وہ سریت پسند جو روحانی نشوونما اور بقول خود اپنی نجات کی خاطر فاقہ کشی کرتا اور ازیت کوشی اختیار کرتا ہے گمراہ ہو چکا ہے۔ وہ جسم کو اذیت پہنچا کر روح کو بھی تباہ کرتا ہے کیونکہ یہ ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔ حضرت عیسیٰ ذہنی اور جسمانی طور سے بہت صحت مند انسان تھے، ان میں زندگی و صحت کی وہ فراوانی تھی کہ محض ان

اور بزرگوں کو بلکہ عام انسانوں کو بھی پیش آ چکا ہے۔ اس کے بعد کہا گیا کہ انہیں آسمان پر اٹھا لیا گیا ہے کیونکہ انہیں مقدس باپ کی طرف لوٹنا تھا اور مقدس باپ کا مسکن آسمان ہے۔ حضرت عیسیٰ کے حواری قابل معافی ہیں کیونکہ قدیم ابتدائی مذہبی شعور کا عام حکم اسی قسم کا تھا۔ لیکن آپ جدید تعلیم یافتہ پوپ کے متعلق کیا کہیں گے جو بیسویں صدی کے وسط میں تمام کیتھولک عیسائیوں کو حکم دے کہ آج سے سب اس بات پر ایمان لے آئیں کہ حضرت عیسیٰ کی والدہ حضرت مریم کو بھی آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا؟ مجھے حیرت ہے کہ حضرت عیسیٰ کو ذہنی اور عقلی ترقی کے اس روشن دور میں بھی بہتر طور پر نہیں سمجھا گیا۔[7]

کیا سینٹ پال نے انہیں سمجھ لیا تھا؟ سینٹ پال یہودی گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ خلیفہ صاحب کے تجزیہ کے مطابق وہ اپنے بیشتر ہم عصروں کی طرح یونانی مابعد الطبیعیات، کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ کی شخصیت، مابعد الطبیعیات، غناسطی داستانوں اور اسرار کا لبادہ اڑھا دیا اور اس طرح ان کی پرستش کو دین بنا دیا۔ کلیسائی عیسائیت کا بڑا حصہ سینٹ پال کی تخلیق ہے۔ چنانچہ باطنی وسری عقائد کے ماننے والے برگزیدہ بندے کہلائے۔ تجسیم، گناہ آدم کی پاداش میں کفارہ، ترک دنیا، گناہ اول اور تثلیث پر ایمان نجات کی لازمی شرط ٹھہرا۔ حضرت عیسیٰ کی حیات بخش روحانیت اور صحت مند اخلاقیت اس پالیئیت میں دفن کر دی گئی۔ صرف چند آزاد خیال عیسائی تھے جنہوں نے حضرت عیسیٰ کی تعلیمات اور زندگی کی ابدی اقدار کو بے جان متعقدات کے اس ڈھیر سے پھر کرید نکالا جس میں یہ دو ہزار سال سے دبی ہوئی تھیں۔ ان آزاد خیال عیسائیوں کے لیے حضرت عیسیٰ پھر وہی اسرائیلی پیغمبر بن گئے جو وہ حقیقتاً تھے۔ ایک ایسے پیغمبر جس نے الہیت کا دعویٰ کبھی نہیں کیا، جس نے بلندی کردار کا مظاہرہ کیا اور اسی کی تعلیم دی، جس نے مادہ پر روح کو ترجیح دی، جس نے ظاہری باتوں کی اہمیت کو نظر انداز کرنا سکھایا، جس نے ظاہری کردار سے زیادہ توجہ کے قابل نیت اور رویہ کو ٹھہرایا، جس نے محبت و شفقت کو قانون پر فوقیت دی اور جس نے خدا کو عالمگیر رحمت و شفقت کے عین قرار دیا۔ انسانیت کے لیے اس سے بہتر مذہب کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن قدامت پسند اور استنادی عیسائیت کے نزدیک یہ انتہائی ناکامی ہے۔ وہ حضرت عیسیٰ کی ارفع و اعلیٰ انسانیت سے اس وقت تک مطمئن نہیں ہوتی جب تک وہ خدائے تعالیٰ سے عین نہ ہو اور جب تک کہ حضرت عیسیٰ کی موت و حیات انسان کے زوال

اور شفاعت کے کائناتی نظام کا تکملہ نہ سمجھی جائے۔

کلیسائی عیسائیت کے ممتاز اور مخصوص عناصر ایسے ہیں کہ پوری بنی نوع انسان تو کجا خود روشن خیال اور اعتدال پسند عیسائیوں کے لیے بھی قابل قبول نہیں ہیں۔ یہ ہیں وہ بنیادی وجوہات جن کی وجہ سے یہودیت اور عیسائیت بنی نوع انسان کی حقیقی شیرازہ بندی کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔

مگر جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں خلیفہ عبدالحکیم کا یہ یقین محکم ہے کہ ایک عالمگیر مذہب کے بغیر حیات کا ارتقاء اپنی کلیت کے ساتھ جاری نہیں رہ سکتا اس لئے تمام انسانوں کے لیے ایک ایسا مذہب ناگزیر ہے جس کی بنیاد معروضی ہو اور جو اس منتشر مخلوق کو اس کی تمام تر گونا گونی اور رنگینی کے ساتھ ایک راستہ اور ایک مقصد کی یگانگت میں پرو سکے۔[۸]

انہوں نے عالمگیر مذہب کی لازمی خصوصیات یہ بیان کی ہیں:

۱۔ یہ ایمان کہ وجود کی بنیاد روحانی اور خدا حیات کی روح تخلیقی ہے۔

۲۔ انسانی روح روح الٰہی کا جزوی مظہر ہے۔

۳۔ خدا، کل موجودات کی کائناتی روح اور کائنات میں جاری وساری ہونے کے باوجود اس سے ماوریٰ ہے۔ خدا کائنات سے اس سے بھی زیادہ قریب ہے جتنا کہ کوئی فنکار اپنی تخلیق سے ہوتا ہے مگر وہ اپنی مخلوق سے ماوریٰ رہتا ہے کیونکہ اس کی ہستی امکان ظہور کے ہر مرحلے پر اپنی تمام تخلیقات سے بے انتہا عظیم ہے۔

۴۔ صفات خداوندی کو اپنانا انسان کا مقصود ہے۔ خدا چونکہ سراپا نور و عشق ہے اس لئے علم میں اضافہ اور اس کے ساتھ ساتھ محبت و شفقت میں اضافہ انسان کو خدا سے زیادہ سے زیادہ قریب کرتا جاتا ہے۔

۵۔ صرف حسی ادراک اور منطقی استدلال ہی علم کا ذریعہ نہیں ہیں۔ حقیقت کی ایسی جہتیں بھی ہیں جو ماورائے حس و عقل ہیں۔ انسانی روح ایک ارفع و اعلیٰ سطح پر ان جہتوں سے رابطہ پیدا کر کے وہ حیات اور نور حاصل کر سکتی ہے جس سے بحر و بر نا آشنا ہیں۔ چنانچہ وحی ایک حقیقت ہے۔

۶۔ کسی وحی یا کشف میں اگر داخلی تضاد ہو یا اگر وہ باقاعدہ طور پر ثابت شدہ حقائق

پر تنقیدی نگاہ ڈالنے کی اجازت ہے۔ چنانچہ متضاد الہامات میں کے بالکل متضاد ہوں تو اس کسی ایک پر صحیح کا حکم لگانے کا کوئی طریقہ نہیں ہے سوائے اس کے کہ غیر جانب دار عقل سے بدلی جائے اور زندگی کی داخلی انسانی اقدار کو سامنے رکھا جائے کیونکہ نور بسیط اور عقل کے فیصلوں کے درمیان کوئی تضاد نہیں ہوتا۔ اگر کوئی الہام انسانیت کے مطابق اقدار کی نفی کرتا ہے تو اس کو صحیح تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان اقدار کا سرچشمہ اور ان کی تکمیل خدا ہے۔

مذہب بہر حال نام ہے اقدار کی بقاء پر ایمان کا۔

۷۔ اگر کوئی مذہب ارتقاء کے عام تصور سے مخالف سمت میں جاتا ہے تو اسے عالمگیر قبولیت حاصل نہیں ہو سکتی۔ آج ارتقاء کے تصور کا وجود کہ ہر مظہر پر اطلاق ہمہ گیر طور پر صحیح سمجھا جاتا ہے۔ وہ مادی اور حیاتی صورتیں جو آج نظر آتی ہیں ارتقاء کے ایک طویل عمل کی پیداوار ہیں۔ چاہے نظام شمسی ہو چاہے انسانی جسم، ان کی موجودہ صورت یقینی طور پر زمان میں ہوئی۔ یہ ہو سکتا ہے کہ زندگی کی اصل ابتداء کو ابھی سائنسی طور پر سمجھا نہ جا سکے یا اس کا عملی تظاہر ممکن نہ ہو۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ زمین پر زندگی کا آغاز اس وقت ہوا جب حالات اس کے لیے سازگار ہو گئے۔ نبض حیات کی ابتداء جس یک خلیاتی جسم میں ہوئی وہ کروڑوں سال کے بعد اپنی اعلیٰ ترین شکل میں انسانی عضویہ میں ظاہر ہوئی۔ الغرض زندگی کی کوئی صورت بیک جنبش وجود میں نہیں آئی۔ حیات کی اصل و ابتداء اور اس کی نشو و نما میں تغیر و تبدل کے عمل کے متعلق اختلاف رائے ہے چاہے اس کو میکانکی کہا جائے یا بروزی یا تخلیقی یہ سب اختلافات اس واقعہ کی تعبیر و تشریح کے اختلافات ہیں جو خود ناقابل تردید ہے۔ یہ تو ممکن ہے کہ کوئی خدا پرست یہ عقیدہ رکھے کہ حیات کا کل عمل خدا کا مقرر کردہ ہے اور خدا ہی اس نظام کو چلاتا ہے یا یہ کہ حیات تخلیقی خدا ہی ہے۔ لیکن ایک عقل پسند اور سائنسی دور کی ذہنی فضاء میں کوئی ایسا نظریہ کائنات یا مابعد الطبیعیات قابل قبول نہیں ہو سکتی جو ارتقاء کے واقعہ کو نظر انداز کر جائے۔

۸۔ جو مذہب عالمگیر بننا چاہتا ہے اس کے لیے یہ عقیدہ بھی ناگزیر ہے کہ بنی نوع انسان رنگ، نسل یا مذہب کے اختلاف کے باوجود ایک مستحکم اور متحد اکائی ہیں۔

جس طرح ایک صحیح مذہب کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ "برگزیدہ بندوں" یا "محبوب قوم" کے تصور سے دامن بچائے، اسی طرح اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ کسی

نسل کے موروثی طور پر اعلیٰ یا موروثی ادنیٰ ہونے کے غلط عقیدہ کو بھی قابل مذمت ٹھہرائے۔ تمام انسان ذہنی اور جسمی ساخت نیز وظیفے اور جبلی اعتبار سے بنیادی طور پر یکساں ہیں۔ ماحول کی طرف سے اثر انداز ہونے والے عوامل اور تاریخ کے اعمال ہیں جو اس بنیادی یکسانیت میں عادات و اطوار اور رسوم و رواج کی گونا گوں صورتیں پیدا کر دیتے ہیں۔ ایک انگریز بچہ کو اگر پیدائش کے فوراً بعد نیگرو ماحول میں رہنے بسنے والے نیگرو والدین کے سپرد کر دیا جائے تو وہ بچہ اپنے نقطہ نظر اور اپنی سیرت کے اظہار و اعتبار سے ایک نیگرو کی طرح نشو ونما پائے گا، اس کی زندگی میں انگریز تہذیب کے سماجی ورثے کا کوئی شائبہ نہیں پایا جائے گا۔ اسی طرح اگر انگریز معاشرے میں ایک نیگرو کو یکساں مواقع فراہم رہیں اور اس کے ساتھ مساویانہ انسانی برتاؤ روا رکھا جائے تو وہ شرح ذہانت کے معاملے میں انگریز بچوں سے پیچھے نظر نہیں آئے گا۔ یہ واقعہ جو سائنسی اور عمرانی طور پر ثابت ہو چکا ہے ہر جگہ کے لیے اعلیٰ مذہبی شعور کے لیے بھی ہمیشہ ایک مسلمہ اصول رہا ہے۔ آپ مہاتما بدھ کی سری مابعد الطبیعیات کے بارے میں کچھ بھی سوچیں ان کی تعلیمات کے متعلق یہ بات ناقابل انکار ہے کہ وہ ہندوؤں کے ذات پات کے کٹر نظام کو قابل نفرت سمجھتے تھے، وہ مساوات پسند تھے اور یہی سب سے بڑی وجہ ہے کہ برہمن نے جب اپنی برتری خطرے میں پڑتے دیکھی تو بدھ مت کو پورے برصغیر سے نکال باہر کرنے پر تل گیا۔ حضرت عیسیٰ بھی اس عقیدہ سے متفق نہیں تھے کہ یہودی موروثی طور پر دوسروں سے افضل ہیں۔ ان کے نزدیک تمام انسان خدا کے بچے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑے فخر کے ساتھ اعلان کیا کہ بنی نوع انسان سب ایک دوسرے کے مساوی ہیں۔ انہوں نے اسی کی تعلیم دی اور اسی پر عمل بھی کیا۔ آپ نے آخری خطبہ میں فرمایا:

''کوئی عربی عجمی پر اور کوئی عجمی عربی پر فوقیت نہیں رکھتا، خدا کی نگاہ میں برتر وہ ہے جو برتر سیرت کا مالک ہو۔''

یہ ایک سچے اور عالمگیر مذہب کی خصوصیات ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ مختلف نظام ہائے مذہب آپس میں اختلاف کرتے رہیں کیونکہ وہ نظام مذہب کی عقلی صورت گری اور منطقی تشکیل کی متفرق کوششیں ہیں اور حقیقت و صداقت کی ماہیت کے متعلق خیال آرائیاں انسانی عقل اور تخیل کی فطرت میں داخل ہیں۔ عام مذہبی زندگی کا رنگ بھی ایک قوم سے دوسری قوم

تک اور ایک دور سے دوسرے دور تک بدلتا رہتا ہے اور مذاہب کے الگ الگ اعمال کے مختلف خاکے اور مختلف نمونے اور مختلف لائحہ عمل بھی پیش ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر مذہبی شعور کی جڑیں ایک معروضی حقیقت سے پھوٹی ہیں اور وہ محض ایک ایسا موضوعی یا سماجی مظہر نہیں ہے جس پر صرف روایت، تاریخ اور غیر عقلی قوتوں کا غلبہ ہو۔ مذہب کی حیثیتیں گو مختلف ہوتی ہیں مگر اس کی جڑیں ہمیشہ ایک ایسے شعور میں ہوں گی جو انسانوں کی تفریق سے پاک ہوگا۔

خلیفہ صاحب نے خدا کے تصور کے ارتقاء کے بارے میں بصیرت افروز باتیں کہی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ خدا کا تصور ارتقاء کے ایک طویل اور مسلسل عمل سے گزرا ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا اس ارتقائی عمل کی پیداوار ہے۔ طبیعی سائنس جسے مذہبی شعور کے مقابلے میں زیادہ حقیقی سمجھا جاتا ہے وہ ابھی ایک طویل ارتقائی عمل کی پیداوار ہے لیکن کوئی مادیت پسند یا فطرت پسند سائنسدان اس بات سے انکار نہیں کرسکتا کہ سائنس انتہائی آغاز کے زمانے میں بھی ایک واقعی حقیقت سے بحث کرتی تھی۔ فطرت خود اپنے قوانین سمیت ہمیشہ موجود ہے، اختلاف اس کے متعلق خیال آرائیوں میں رہا ہے۔ اسی طرح مذہبی شعور نے بیداری کے انتہائی اولین دور میں یہ محسوس کرلیا تھا کہ تمام فطری مظاہر کی پشت پر کوئی ایسی اعلیٰ قوت کام کر رہی ہے جو روح انسانی سے بے اندازہ عظیم ہونے کے باوجود انسان کے لیے غیر نہیں ہے۔ انسانی فکر اور تعقل ابتداء میں حیویتی اور تجسیمی تھا لیکن اس اولین دور میں بھی انسان بالکل گمراہ نہیں تھا۔ فطری سائنسوں نے اپنی ترقی کے ساتھ رفتہ رفتہ فطرت کو غیر شخصی بنا دیا لیکن یہ صرف طریقہ کار کی آسانی اور عملی افادیت کی خاطر کیا گیا تھا۔ جب یونانی سوفسطائی پروٹا گورس نے کہا کہ انسان کائنات کا پیمانہ ہے تو اسے ایک مابعد الطبیعیاتی اور مذہبی کفر قرار دیا گیا۔ لیکن آج آڈنگٹین جیسے سائنسی فلسفی اسی مقام کی طرف لوٹ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ ثابت کرنا شروع کر دیا ہے کہ اپنی غیر شخصی نوعیت سمیت سائنس انسان ذہن کی تشکیل ہے اور کائنات کا جو خاکہ حواس اور سائنس فراہم کرتے ہیں وہ ایک حقیقت مطلق کا آئینہ دار نہیں ہے بلکہ انسانی ذہن کی نتیجیتی ضرورتوں کا عکس ہے۔ یہ کانٹ تھا جس نے انسان کو تمام مدرکہ حقیقت کے مرکز پر لاکھڑا کیا۔ ہم ایک دی ہوئی معروضی اور پابند نظام فطرت کے قوانین دریافت نہیں کرتے بلکہ اسے قوانین دیتے ہیں۔

اس طرح مادی کائنات کے متعلق خیال آرائی تھیلز اور انکسا غورس جیسے ابتدائی یونانی مفکرین کے آب حیویتی نظریہ سے شروع ہو کر حیویت، تجسیم اور غیر شخصی میکانیکی مادیت سے ہوتی ہوتی رفتہ رفتہ پھر انسان کی طرف لوٹ آئی ہے اور انسان ایک دفعہ پھر خود کو اس فطرت کا مخرج و منبع قرار دینے لگا ہے جسے وہ معروضی اور منظم فطرت سمجھتا ہے۔ سائنس نے مسلسل ترقی اسی لئے کی ہے کہ اس کا ایمان ہے کہ منظم فطرت کا وجود ہے اور اس کے راز ہائے سربستہ کو رفتہ رفتہ علم کی صورت میں پالینا ممکن ہے۔

جس طرح طبعی فطرت کی تعبیر و تفہیم میں تغیر اور ارتقاء کے باوجود انسان کے حواس اور عقل کو اس کی معروضی حقیقت پر مکمل یقین رہا ہے اسی طرح مذہبی شعور یا تو واقعی تجربے کے ذریعہ یا عقیدے کے سہارے سے وجود کی ان دیکھی اور اعلیٰ و افضل روحانی بنیاد کو حقیقی سمجھتا رہتا ہے۔ فلاطینوس کی قسم کی سری مابعد الطبیعیات نے خدا کو ایک ایسی ہستی سمجھا جو اپنی ابتدائی اصل میں تو ہر صفت سے منزہ و ماوریٰ تھی لیکن جو ایک تنزیلی پیمانہ پر ظہور کے ذریعہ تمام ہستیوں، اشیاء اور صفات کی خالق ہے۔

یہودیت، عیسائیت اور اسلام نے اس حقیقت مطلق کو ایک منزہ شخصیت سمجھا اور اسے علم، ارادہ اور حرکت سے متصف جانا۔ بدھ مت اور ویدانتی ہندومت نے اس کو غیر شخصی تصور کیا، لیکن سب اس بات پر متفق تھے کہ انائے انسانی خود کو اس کے علم اور اس کے منشاء کے عین بنا کر اپنی حدود سے باہر نکل سکتی ہے۔ ہر مذہبی شعور کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ انفرادی نفس کو حقیقت مطلق کے تابع کیا جائے، اس حقیقت مطلق کے تابع جو ایک نفس اعلیٰ تصور کی جاتی ہے یا جسے وجود کے تمام مقولات ماوریٰ وجود کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ تمام مذاہب اس ہستی کو انسان کا مقصد اعلیٰ سمجھتے ہیں اور سب اس بات پر متفق ہیں کہ اس ہستی مطلق کے تابع ہونے سے زیادہ وسیع وجود اور زیادہ حقیقی زندگی کے دروازے کھل جاتے ہیں۔

مختلف اخلاقی اور ذہنی سطح کے انسان اس ہستی کا تصور مختلف طریقے پر کرتے ہیں حتیٰ کہ ایک ہی مذہبی فرقے کے افراد کا طرز فکر ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی ضرورت بھی ہے۔ سائنس کی ترقی طرز فکر کی آزادی ہی کا نتیجہ ہے۔ اوپر سے تھوپی جانے والی یکسانیت، عقلی اور مذہبی، دونوں شعبوں میں انسانی روح کو مفلوج کر کے رکھ دیتی ہے۔ لہٰذا ہر وہ مذہب جو تمام آزاد انسانوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اسے یہ آزادی دینی

میں بھی انسان کا طرز فکر کئی طرح کا ہوتا ہے۔ فیثا غورث پڑے گی۔ طبیعی فطرت کے بارے نے حقیقت مطلق کو اپنی اصل میں ریاضیاتی تصور کیا اور ہر شے کو اعداد کا حامل قرار دیا۔ دو ہزار سال تک فطرت کے مطالعے اور اس کے متعلق خیال آرائی کے بعد سائنس کے فلسفی جیمس جینز نے اس مذہب کو پھر زندہ کیا۔ افلاطون کے نزدیک خدا تصورات کا ایک ایسا اہرام تھا جس کا نقطہ راس خیر کا تصور تھا۔ ارسطو کے لیے خدا ایک خود نگران فکر (معروض و موضوع) کا ایک مکمل وجود اور مادے کے بغیر صورت خالص تھا۔ اسرائیلی پیغمبروں کے لیے خدا اپنی اصل میں ایک آمر تھا جو اپنے احکام کی فرمانبرداری یا ان سے نافرمانی پر انعام و سزا دیتا ہے۔

خدا کا تصور اور اس کے متعلق خیال آرائیاں مستقبل میں بھی اسی طرح بدلتی رہیں گی جس طرح کہ ماضی میں۔ حقیقت لامتناہی اور پہلو دار ہے۔ لہٰذا اس کے متعلق طرز ہائے فکر بھی بے شمار اور مختلف ہونا فطری بات ہے۔ بہت سے خدا پرستوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ خدا کے متعلق اس طرح گفتگو کرتے رہتے ہیں جیسے خدا کو پوری طرح جان لیا گیا ہے یا اس کا مکمل علم ممکن ہے۔ مشہور صوفی حلاج نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ معلوم، ذہن عالم سے ہمیشہ کم ہوتا ہے کیونکہ معلوم، ذہن عالم کا مظروف ہوتا ہے اور ظرف اپنے مظروف سے بہرحال وسیع تر ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا کو سمجھنے کے لیے خود انسانی شعور نا کافی ہے۔

کوئی مذہب اگر معرفت الٰہی کے دروازے کھلے رکھے تو وہ مذہبی مزاج رکھنے والے تمام انسانوں کے لیے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ اس سے مذہبی رواداری لازمی طور پر پیدا ہو گی اور کسی سخت گیر اور کٹر قدامت پسندی کے برعکس اعتدال پسندی کا رجحان پیدا ہو گا۔ خدا کا قرب عقل، اخلاق یا جمال کے ذریعہ حاصل ہو سکتا ہے۔ صداقت، جمال اور خیر ایک وحدت اصلی کے تین پہلو ہو سکتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اسے ایک اخلاقی نظام کہہ لینے دیجئے اور کچھ کو اجازت دیجئے کہ وہ اسے جلال و جمال کے جذباتی روپوں میں محسوس کریں۔ کچھ کے لیے حکم مطلق فرضی حکم مطلق ہو سکتا ہے۔ کچھ کے لیے خدا ایک شخصی وجود ہو سکتا ہے اور کچھ ایک کائناتی روح کی صفت کے لیے شخصیت کو انتہائی محدود اور نا کافی سمجھ سکتے ہیں۔ کیونکہ وہ خدا کو ایک ایسی ماورائی روح سمجھتے ہیں جس کا ظہور شخصی اور غیر شخصی دونوں صورتوں پر حاوی اور جو خود اپنی اصل میں ان دونوں سے ماورئی ہو۔ اگر کوئی مذہب خدا کو باپ سے تشبیہ دیتا ہے تو اسے کسی ایسے مذہب پر فوقیت دینے کا کوئی جواز نہیں مل سکتا جو خدا کے لیے مالک اور

آقا کے استعارے استعمال کرتا ہو۔ یہ تمام الفاظ اس کے مختلف پہلوؤں کے نام ہیں۔ یہ پہلو ایک اضافی حقیقت تو رکھتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی تنہا صداقت کا حامل نہیں ہو سکتا۔

مذہبی عقیدہ بنیادی طور پر ایک عقلی تشکیل نہیں ہوتا۔ اگر انسانی فطرت کی گہرائیوں سے ابھرنے والی جبلت خدا کو نہ سمجھتی اور اگر عقل سے ماوریٰ کوئی تجربہ عقیدہ کا سرچشمہ نہ ہوتا تو تنہا منطق نوع انسان کی رہنمائی خدا تک نہ کر سکتی۔ مذہبی تجربات بڑے گونا گوں ہوتے ہیں۔ جن لوگوں کو ایک اعلیٰ روحانی قوت سے قربت کا شرف حاصل ہوا ہے ان میں بہت سی باتیں ایسی رہی ہیں جو ہر مذہب کے پیغمبروں اور ولیوں میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن انفرادی خصوصیات اور روایتی عقائد نے بھی بے شمار معاملوں میں تجربے کے لیے سانچے مہیا کئے ہیں۔ اس تنوع کے باوجود ایسے عالمگیر اور معروضی عوامل کا تلاش کر لینا مشکل ہے جو کل وجود کی روحانی بنیاد یعنی ایک روح اعلیٰ کے تمام ادراکات میں مشترک ہوں۔

خلیفہ صاحب یہ اصول واضح کرتے ہیں کہ ''ایک فرد کے لیے مذہب کو بطور معیار عمل ہونا چاہئے تا کہ وہ اپنی روحانی، اخلاقی، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کو تا حد امکان درجہ کمال تک پہنچا سکے۔ اس کا فرض منصبی ہے کہ خالق ومخلوق اور انسان واشیاء کے باہمی ربط و تعلق کو ہم آہنگ و برقرار رکھے۔ اس کے علاوہ دنیا کے متعلق جس میں کہ انسان اپنی زندگی بسر کرتا ہے ایک صحیح انداز فکر عطا کرے۔'' [۹]

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس ضابطہ کی بدرجہ اتم تکمیل اسلام میں ہوتی ہے۔ اسلام کا مطلب فانی ارادے کو وجود کی لافانی، تخلیقی اور قائم رہنے اور قائم رکھنے والی اصل کے تابع بنانا ہے اور یہ وہ سچا اصول ہے کہ اس سے انحراف کرنے اور اختلاف رکھنے والا ہر نظام اور ہر عقیدہ باطل ہے۔

اسلام کیا ہے؟ یہ سوال بظاہر بڑا سادہ ہے لیکن اس سوال کا سنجیدگی سے ایسا جواب دینا بڑی دشواریوں کا باعث ہو سکتا ہے۔ ایک غیر مسلم یہ سمجھتا ہے کہ اسلام وہ مذہب ہے جس کی تبلیغ صرف آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے کی۔ اس بات کا اظہار مغربی مصنفوں کی ان اصطلاحات سے بھی ہو جاتا ہے جو وہ اسلام کے لیے استعمال کرتے ہیں جیسے دین محمدی یا محمدیت وغیرہ۔ یہ ایک غلطی ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے علاوہ کوئی مذہب ایسا نہیں جو اپنے وصفی نام سے موسوم ہو۔ عیسائیت حضرت عیسیٰ سے منسوب ہوئی۔ بدھ مت گوتم بدھ کا

31

خلیفہ عبدالحکیم کے مذہبی عقائد

محمد مظہر الدین صدیقی

خلیفہ صاحب سے میں پہلے پہل اس زمانہ میں روشناس ہوا جب وہ حیدر آباد (دکن) میں جامعہ عثمانیہ میں فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ اس زمانہ میں وہ ٹاؤن ہال باغ عامہ میں آرد بندو گھوش کے فلسفہ پر کچھ تقاریر فرما رہے تھے۔ اگرچہ فلسفہ میرا مضمون نہ تھا لیکن کچھ طبعی ذوق اور مناسبت کی وجہ سے میں ان کی تقاریر سننے جایا کرتا تھا۔ خلیفہ صاحب کی تقریر میں ان کی گفتگو کی طرح ایک خاص شگفتگی تھی۔ وہ فلسفہ کے نہایت دقیق مسائل کو ایسے آسان اور دلچسپ انداز سے سمجھاتے تھے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بھی ان سے کچھ نہ کچھ ضرور اخذ کر لیتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر بھی مرحوم نے آرد بندو گھوش کے تصوف کو ایسے شگفتہ پیرایہ میں بیان فرمایا کہ بہت سی باتیں جو پہلے دشوار اور پیچیدہ نظر آتی تھیں، آسانی سے سمجھ میں آ گئیں۔ اس کے بعد اگرچہ مرحوم حیدر آباد میں عرصہ دراز تک مقیم رہے لیکن غائبانہ تعارف کے سوا کبھی ان

سے ملنے اور گفتگو کرنے کا موقع نہیں ملا۔ البتہ کبھی کبھی ان کے متعلق کچھ باتیں سننے میں آ جاتی تھیں۔ مثلاً یہ کہ مولوی صاحبان کو خلیفہ صاحب سے ایک خاص پرخاش ہے کیونکہ ان کے خیالات سے وہ شدید اختلافات رکھتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی سننے میں آتا تھا کہ خلیفہ صاحب مولویوں پر پھبتیاں کسنے میں استاد ہیں اور موقعہ مل جائے تو انہیں خوب ستاتے ہیں۔ بہر حال ان کی آزاد خیالی اور بذلہ سنجی خشک مذہبی طبائع کو ناگوار تھی۔

خلیفہ صاحب سے میری پہلی ملاقات مری میں ہوئی جہاں وہ اپنے صاحبزادے عارف صاحب کے یہاں مقیم تھے۔ مَیں اس زمانہ میں پشاور میں بسلسلہ ملازمت سکونت پذیر تھا۔ لیکن یہ پہلی ملاقات نہایت مختصر تھی اور اس سے مجھے خلیفہ صاحب کے متعلق کوئی نئی بات نہیں معلوم ہوئی۔ اس زمانے میں ادارہ ثقافت اسلامیہ قائم ہو چکا تھا اور خلیفہ صاحب اس کے ڈائریکٹر تھے۔ مگر ابھی انہیں موزوں اشخاص کی تلاش تھی۔ ادارہ کی رکنیت اور رفاقت کا شرف پہلے پہلے ہمارے دوست ڈاکٹر رفیع الدین صاحب کو حاصل ہوا جو اب کراچی میں اقبال اکیڈیمی کے ناظم ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بعد دوسرے نمبر پر میں ادارہ کی رکنیت سے سرفراز ہوا۔ میرے مذہبی خیالات میں اس وقت تک کافی جمود تھا۔ اسی طرح ڈاکٹر رفیع الدین صاحب بھی اپنے مذہبی افکار کے اعتبار سے نہایت راسخ العقیدہ تھے۔ اس کے بعد ہمارے ادارہ میں دو اور رُفقائے کار داخل ہوئے جن کا تعلق طبقہ علماء سے تھا۔ غرض کہ ایک طرف تو خلیفہ صاحب معہ اپنی تمام آزاد خیالی اور فلسفہ آرائی کے ادارہ کے ناظم تھے اور دوسری طرف رفقائے ادارہ سب کے سب کم و بیش آبائی عقائد کے پیرو تھے۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ خلیفہ صاحب اس گاڑی کو کس طرح چلائیں گے جس کے چاروں پہیئے بے جوڑ تھے۔ میرا جس وقت ادارہ میں تقرر ہوا تو ڈرتے ڈرتے اور جھجکتے ہوئے لاہور آیا۔ کیونکہ خلیفہ صاحب کی آزاد خیالی کے باعث یہ اندیشہ ہوتا تھا کہ ممکن ہے کبھی میرے اور ان کے خیالات میں ٹکراؤ ہو جائے۔ اس نئی زندگی کے آغاز میں مجھے بعض وقت دماغی الجھن ضرور رہتی تھی کیونکہ خلیفہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ روزانہ رفقائے ادارہ سے کم از کم دو تین گھنٹے علمی گفتگو فرماتے تھے۔ دوران گفتگو میں بعض وقت ان کی زبان سے ایسی باتیں نکل جاتی تھیں جن سے مجھے ان کے اسلام و ایمان میں شک ہونے لگتا۔ ابتداء میں مجھے اس سے کافی پریشانی ہوئی۔ لیکن جیسا جیسا وقت گزرتا گیا اور خلیفہ صاحب کے خیالات سے زیادہ گہری واقفیت ہونے لگی یہ

میری بدقسمتی تھی کہ بعض مجبوریوں کے باعث مجھے خلیفہ صاحب سے ان کے عین حیات جدا ہونا پڑا۔ لیکن علیحدگی کے بعد بھی خلیفہ صاحب کے اور میرے تعلقات میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ اسی محبت و مروت سے ملتے رہے اور مجھے جو تجربات آئندہ پیش آئے اس سے ان کی قدر و منزلت میں اضافہ ہو گیا۔ شاید یہ خلیفہ صاحب سے میری گہری عقیدت و خلوص کا نتیجہ ہو کہ ان کے آخری ایام حیات میں بھی دو چار روز کے لیے میرا اور ان کا ساتھ رہا۔ کراچی میں اسلام پر ایک بین الاقوامی مباحثہ ہو رہا تھا۔ سندھ یونیورسٹی کی جانب سے میں بھی کانفرنس میں ایک مندوب تھا۔ خلیفہ صاحب لاہور سے تشریف لائے۔ حسب معمول انہوں نے اسلام کی حمایت میں بڑی شگفتہ تقاریر فرمائیں۔ یہاں تک کہ وہ لوگ بھی ان سے خوش ہو گئے جن کو ان کی راسخ العقیدگی میں شک تھا۔ لیکن کسے معلوم تھا کہ وہ بہت جلد اپنے رفقاء اور شناساؤں کو داغ مفارقت دینے والے ہیں۔ غالباً چوتھے یا پانچویں روز ڈاکٹر محمود حسین صاحب نے بھرے اجلاس میں ان کی وفات کی خبر سنائی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

خلیفہ صاحب کے مخالفین ان کو مذہب میں جدت پسند، آزاد خیال، گمراہ اور نہ جانے کیا کیا خیال کرتے تھے۔ اس کا سبب دراصل یہ تھا کہ دینیاتی ذہن مذہبی حقائق کی جس انداز سے ترجمانی کرتا ہے وہ اس سے بہت مختلف ہے جو ایک فلسفیانہ اور متصوفانہ ذہن کی خصوصیت ہے۔ خلیفہ صاحب کائنات کی حقیقت اور حیات کی ماہیت پر فلسفیانہ انداز سے سوچتے تھے اور مذہبی عقائد کی توجیہہ بھی اسی انداز سے کرتے تھے۔ اس لئے سطحی اذہان اگر انہیں گمراہ اور بے دین سمجھیں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہر وہ شخص جو جرأت فکر رکھتا ہے اور مروجہ عقائد سے ہٹ کر سوچتا ہے مخالفین کی دشنام طرازی اور پروپاگنڈے کا شکار ہو جاتا ہے۔ خواہ حقیقت کے اعتبار سے وہ دین کا بہتر ترجمان ہو۔ بہرحال اگر دین کا تعلق رواجی اعتقادات پر نہیں بلکہ جزا و سزا اور رسالت پر ایمان سے ہو تو خلیفہ صاحب کا ایمان ان پر ویسا ہی مستحکم تھا جیسا کہ کسی پاکباز اور راسخ العقیدہ مسلمان کا ہو سکتا ہے۔ ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ان کی الفت و عقیدت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ وہ رسول اللہ کی نبوت کو مثالی قرار دیتے تھے۔ چنانچہ ایک مرتبہ فرمانے لگے کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا جو اعلیٰ معیار قائم فرما دیا ہے اس کے بعد انبیائے نبی اسرائیل کی نبوت نظروں میں نہیں جچتی اور نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں وہ عارفین حق اور اولیاء کے درجہ پر فائز معلوم ہوتے ہیں۔

تمام شکوک وشبہات زائل ہو گئے اور میں اس نتیجہ پر پہنچا کہ خلیفہ صاحب نہایت پکے مسلمان ہیں لیکن ان کا انداز فکر فلسفیانہ اور متصوفانہ ہے۔ اس لئے وہ اسلام کو کسی اور رنگ میں دیکھتے ہیں۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ مذہبی عقائد کے دائرہ میں دینیاتی ذہن اور فلسفیانہ ذہن ہمیشہ متصادم رہتے ہیں۔ اب یہ انسان کی افتاد طبع پر منحصر ہے کہ اس میں دینیاتی ذہن کا عنصر زیادہ ہے یا فلسفیانہ ذہن کا کیونکہ کوئی انسان نہ تو خالص دینیاتی ذہن رکھتا ہے اور نہ خالص فلسفیانہ دماغ۔ لیکن جس عنصر فکر کا پلہ جتنا بھاری ہوتا ہے اسی اعتبار سے آدمی کا انداز تاویل اور طرز تشریح مختلف ہوتا ہے۔

خلیفہ صاحب نے ہم لوگوں کی ذہنی تبدیلی کا کام اس قدر تدریجی اور غیر شعوری طور پر انجام دیا کہ ہم میں سے اکثر کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ ہم ایک فکری انقلاب کے دور سے گزر رہے ہیں۔ خلیفہ صاحب کی اس کامیابی کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے کبھی اوعائیت اور تحکم سے کام لے کر ہم پر اپنا نقطہ نظر مسلط کرنے کی کوشش نہیں کی۔ جس طرح وہ مجلسی زندگی میں مساوات اور بے تکلفی برتتے اور اپنے ملنے والوں کو کبھی یہ محسوس نہیں ہونے دیتے کہ وہ اپنے کو ان سے اعلیٰ تر خیال کرتے ہیں اسی طرح علمی زندگی میں بھی کبھی انہوں نے اپنی علمی برتری جتانے کی کوشش نہیں کی۔ وہ ہم لوگوں سے علمی مسائل پر اس طرح بحث کرتے تھے گویا ہم لوگ علم وفضل میں ان کے ہم پلہ ہیں۔ اختلاف رائے کو کشادہ دلی سے برداشت کرتے تھے اور اپنی بات پر اصرار نہیں کرتے تھے۔ اسی وجہ سے ہم لوگوں نے کبھی اپنے خیالات چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ یہ بات ان کی علمی عظمت کا کافی ثبوت ہے۔ کیونکہ جن لوگوں میں علم کی کمی ہوتی ہے اور فکر کی پختگی نہیں پائی جاتی وہ اپنے آپ کو تنقید سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور دوسروں کو دلائل سے قائل کرنے کے بجائے اپنے شخصی رعب وداب یا معاشرتی مرتبہ سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس نقص سے یکسر پاک تھے۔ ہمارے ملک میں خلیفہ صاحب کے پایہ کے ادیب، عالم اور مفکر اب تقریباً ناپید ہیں۔ وہ علم وادب شعرو شاعری، فلسفہ اور تصوف کے جامع تھے۔ مفکر ہی نہ تھے بلکہ مفکر گر بھی تھے۔ انہوں نے بہت سے اشخاص کے طرز فکر اور طریق استدلال کو متاثر کیا اور بہت سے لوگوں کو جمود سے نکال کر حرکت پذیر بنا دیا۔ خلیفہ صاحب اپنے رفقاء اور تلامذہ کا ایک حلقہ چھوڑ گئے ہیں۔ جن میں سے کوئی شخص بھی ان کے علمی احسان سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ صاحب کی نظروں میں حضور ﷺ کا کیا مقام تھا اور وہ حضور ﷺ کے ساتھ کیسی والہانہ عقیدت و الفت رکھتے تھے۔ خلیفہ صاحب کو منکرِ حدیث بھی قرار دیا گیا ہے لیکن میں نے جتنی اعلیٰ درجہ کی احادیث خلیفہ صاحب سے سنیں اور کسی سے سننے کا اتفاق نہیں ہوا۔ یہ بھی کہا جاتا تھا کہ خلیفہ صاحب نرے فلسفی ہیں انہیں علوم قرآن و حدیث سے کیا نسبت ہو سکتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ بات ان کی ابتدائی زندگی کے تعلق سے صحیح ہے۔ لیکن آخری دس بارہ سال میں خلیفہ صاحب نے قرآن و حدیث کا بڑا گہرا مطالعہ فرمایا تھا اور اپنی فطری ذہانت کے باعث وہ علم حدیث کے فنی ماہر نہیں تو رمز شناس ضرور کہلائے جا سکتے ہیں۔ انہوں نے بعض احادیث کی توجیہہ و تشریح میں ایسے ایسے نادر نکات پیدا کیے جن سے ہمارے قدیم علماء یکسر قاصر تھے۔ چنانچہ جواہرات پر زکوٰۃ کے بارے میں مجھے خلیفہ صاحب کی توجیہہ نہایت شاندار معلوم ہوئی۔ فرماتے تھے کہ عرب ایک مفلس قوم تھی اس لئے عربوں میں بمشکل دو ایک ایسے اشخاص ہوں گے جن کے پاس ایک آدھ ہیرا یا دوسرا قیمتی پتھر موجود ہو۔ اس لئے جب حضور ﷺ نے عاملین زکوٰۃ کو وصولی زکوٰۃ کے لیے روانہ فرمایا تو انہیں جواہرات پر زکوٰۃ وصول کرنے میں بڑی دقت ہوئی۔ کیونکہ اوّل تو جواہرات کی تعداد دو ایک سے زیادہ نہیں تھی۔ دوئم انہیں بازار میں فروخت بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ عرب میں ان کا شاید ہی کوئی خریدار نکلتا۔ اب دوسری صورت صرف یہ تھی کہ انہیں توڑ کر چالیسواں حصہ بطور زکوٰۃ لے لیا جاتا۔ مگر اس سے جوہرات تلف ہو جاتے اور ان کی قیمت وصول نہ ہوتی۔ اس لئے آپ ﷺ نے فرمایا کہ چونکہ ایک دو اشخاص سے زیادہ کا معاملہ نہیں اس لئے ان سے جواہرات پر زکوٰۃ نہ لو۔ یہ توجیہہ نہایت معقول معلوم ہوتی ہے ورنہ یہ امر قابل غور ہے کہ اسلام نے جب سونے چاندی اور دوسرے ذخائر پر زکوٰۃ عائد کی تو ہیرے جواہرات کو کیوں مستثنیٰ قرار دیا جب کہ اس ذریعہ سے لوگ اپنی دولت کو زکوٰۃ سے بچا سکتے ہیں۔

خلیفہ صاحب نے طلاق و نکاح کے کمیشن میں جو سفارشات کی تھیں ان پر بھی ہمارے قدیم مذہبی حلقوں میں بڑی لے دے ہوئی۔ بالخصوص تعداد ازدواج کے مسئلہ پر حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خواہ تعداد ازدواج ہو یا طلاق کا موجودہ طریقہ ان دونوں سے بہت سے مسلمان ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں جس کی وجہ سے عورتوں کے جائز حقوق متاثر ہوتے ہیں۔

اسلام نے تعداد ازدواج کی مشروط اجازت دی تھی اور وہ بھی ناگزیر حالات کی بنا پر۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ تعداد ازدواج کا طریقہ قطعاً مسدود کرنے کے قابل ہے کیونکہ بعض حالات ایسے پیدا ہو سکتے ہیں کہ مرد کو واقعی دوسرے یا تیسرے نکاح کی حاجت پیش آئے۔ لیکن اس استثنائی صورت حال کو ایک مسلمہ عام قاعدہ نہیں بنایا جا سکتا۔ سب سے بڑا سوال معاشی عدل کا ہے جس کو خود قرآن حکیم نے ایک شرط لازم قرار دیا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ کتنے لوگ دوسری یا تیسری شادی کرنے کے بعد اپنی پہلی بیوی کو سابقہ معیار کے مطابق خرچ دے سکتے ہیں اور کتنوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ پہلی بیوی سے اسی حسن سلوک سے پیش آئیں گے جیسے دوسری شادی سے قبل۔ اس لئے خلیفہ صاحب کا یہ فرمانا بالکل بجا تھا کہ تعداد ازدواج کی خاص حالات اور شرائط کے تابع دی جانی چاہیے۔ نیز طلاق کے بارے میں بھی مردوں پر بعض قیود لگانے چاہئیں تا کہ وہ اس کو محض اپنی لطف اندوزی کا ذریعہ نہ بنا لیں۔

خلیفہ صاحب پر مغرب زدہ ہونے کا الزام بھی لگایا گیا۔ لیکن یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ جو لوگ مغربی تہذیب کی فلسفیانہ بنیادوں سے واقف نہیں اور جنہیں یہ نہیں معلوم کہ مغرب کی تہذیب اسلامی تہذیب سے کس درجہ متاثر ہے وہ اسلام اور مغرب کو دو متبائن تہذیبیں خیال کریں تو بے جا نہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تہذیب اور مغربی تہذیب میں اکثر امور مابہ الا اشتراک ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ مغرب پر مادیت طاری ہے تو آج دنیا میں مادیت کہاں طاری نہیں؟ خود مسلمانوں کی مادیت پسندی مغرب سے بھی زیادہ بڑھی ہوئی ہے۔ صرف اسی زمانہ میں نہیں عہد رسالت اور خلافت راشدہ سے قطع نظر کر لیجئے تو تاریخ میں اسلامی قدروں کا نشان بہت دھندلا نظر آتا ہے۔ ایسی حالت میں مغرب کے بالمقابل اپنی روحانیت کا دعویٰ کرنا کچھ زیادہ زیب نہیں دیتا۔ یہ صحیح ہے کہ مادیت ایک نظریہ اور عقیدہ کی حیثیت سے ہماری تہذیب میں بار نہیں پا سکی اور مغرب میں ملاحدہ فلسفیوں اور سائنسدانوں کا ایک بڑا گروہ موجود ہے۔ لیکن اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ موجودہ علوم وفنون کا سرمایہ تحقیقات اتنا زیادہ وسعت پذیر ہو گیا ہے کہ اس میں ہر قسم کے خیالات وعقائد کی گنجائش موجود ہے۔ دوسرے خود مغربی فلاسفہ اور سائنس دانوں میں مادیت کے خلاف ردعمل ہو رہا ہے اور وہ حیات کی روحانی بنیادوں پر زور دینے لگے ہیں۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ آئندہ پچاس یا سو

32

خلیفہ صاحب کی نظر میں اسلام اور ارتقاء کا توافق

کمال محمد حبیب

اگرچہ ارتقاء کا تصور نیا نہیں لیکن ارضیات سے لے کر حیاتیات، نفسیات، عمرانیات، معاشیات بلکہ اخلاقیات اور مذہبیات تک میں اس کا اطلاق ہمارے اس جدید دور کو گزشتہ ادوار سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔ مگر ارتقاء کے اس ہمہ گیر اطلاق نے انسانوں کے لیے بعض ایسی اشکال پیدا کر دی ہیں جن سے نبرد آزما ہوئے بغیر نظر و عمل، قدر اور واقعہ، ماضی اور مستقبل کے درمیان کوئی رابطہ مستحکم صورت میں قائم نہیں کیا جا سکتا۔ عام فہم الفاظ میں اس مسئلے کو ہم ارتقاء اور مذہب کے توافق کا مسئلہ کہتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے اس کے ضمن میں گراں قدر علمی خدمات انجام دی ہیں جن کا جائزہ لینا اس کاوش کا موضوع ہے۔

کائنات کی ساخت اور اس کے ارتقاء کے بارے میں جو جدید انکشافات ہوئے ہیں وہ انسان کے سان و گمان سے بھی پرے ہیں۔ کائنات کے زمان و مکان کی وسعت

سال میں مغربی فلسفہ اور سائنس کی ہیئت بدل جائے لیکن جہاں تک عملی زندگی کا تعلق ہے حقیقی روحانیت تاریخ کے ہر دور میں چند پاکیزہ نفوس تک محدود رہی اور عام انسانوں کی بڑی اکثریت ہمیشہ دنیوی اور مادی اقدار کی طلب میں زندگی بسر کرتی رہی ہے خواہ اسلامی ممالک میں ہو یا مغربی ممالک میں۔ البتہ اسلامی ممالک میں اس مادیت پسندی کو مذہب کے پردے میں چھپایا گیا اور مغربی ملکوں میں مذہب کی آڑ اٹھا دی گئی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمارے اندر اتنی دیانت فکر باقی نہیں کہ ہم اپنی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ لے سکیں۔ ہمارے مذہبی طبقات مغرب کی کمزوریوں اور برائیوں کو تو بہت جلد دیکھ لیتے ہیں۔ لیکن کسی فرد یا تہذیب کی روحانی زندگی کے لیے یہ طرز فکر نہایت مضرت رساں ہے کہ وہ دوسروں کی عیب جوئی کرتا رہے اور اپنی کمزوریوں اور خامیوں سے صرف نظر کرے۔ ایک زندہ تہذیب وہ ہے جس میں محاسبہ نفس کا عمل اجتماعی پیمانہ پر بھی اسی طرح جاری ہو جس طرح شخصی زندگی میں۔

بہر حال اِس میں کوئی شک نہیں کہ مغربی تہذیب کمزوریوں اور نقائص سے خالی نہیں اور ہم اسے بلا اخذ و ترک قبول نہیں کر سکتے۔ اسی طرح ہماری اپنی تہذیب کے کچھ بنیادی تقاضے ہیں جن سے ہم اعراض نہیں کر سکتے۔ خلیفہ صاحب کا بھی یہی کہنا تھا۔ انہوں نے مغرب کی اندھی تقلید کو کبھی نہیں سراہا لیکن دیانتداری سے مغرب کے بعض پہلوؤں کی تعریف کی۔ اگر یہ دیانت فکری مغرب زدگی ہے تو ہم میں سے اور زیادہ اشخاص کو مغرب زدہ ہونے کی ضرورت ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ تورات کا باب تخلیق اور یونانیوں کی کونیاتی موشگافیاں محض بچوں کے تخیلات معلوم ہوتے ہیں۔ پتہ چلا ہے کہ ہمارا نظام شمسی کوئی آزاد نظام نہیں ہے بلکہ ایک کہکشانی نظام کا حقیر جزو ہے جس کے مرکز کے چاروں طرف ہمارا سورج گردش کرتا رہتا ہے جو اس کہکشاں میں ایک اوسط درجے کا تارا ہے۔ اس کہکشاں میں کم از کم ایک ہزار کروڑ سورج اور ہیں۔ ہمارے اس کہکشانی نظام کی صورت بیضوی شکل کی ہے اور اس کی کمیت سورج سے ہزار ارب زیادہ ہے جب کہ سورج کی کمیت زمین سے تین ہزار گنا زیادہ ہے۔

مزید برآں یہ کہکشاں پوری کائنات کہاں، اس کائنات میں ایک سنگ ریزہ کے برابر بھی نہیں۔ دوسو انچ کی دوربینوں سے کوئی ایک ہزار کروڑ سے زیادہ کہکشاں کا اب تک شمار کیا جا چکا ہے۔

کائنات کے زمان و مکان کا اندازہ کچھ اس امر سے ہوگا کہ زمینی پیمانے اس کو ناپ نہیں سکتے۔ شعاع نور کی شرح رفتار جو ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ ہے کائناتی فاصلہ کی اکائی کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ ہمارے کہکشانی نظام کی وسعت اتنی ہے کہ اس کے طولانی فاصلہ کو طے کرنے میں روشنی ایک لاکھ سال لیتی ہے اور اس کے عرض پر دونوں نقاط کے درمیان کا فاصلہ اسی ہزار سال میں طے کرتی ہے۔ نیز یہ کہ ہماری کہکشاں سے قریب ترین دوسری کہکشاں کا فاصلہ طے کرنے میں روشنی کو چھ لاکھ آٹھ ہزار میل درکار ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر گزرا اب تک ایسی ایک ہزار کروڑ کہکشائیں دریافت ہو چکی ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اس قدر غیر محدود کائنات کی تشکیل کیسے ممکن ہوئی ہے؟ اندازہ لگایا گیا ہے کہ یہ کہکشاں ابتداء میں سحابیہ ہوتی ہے، یعنی ایک دخان یا بادل کی طرح گیسی مادہ۔ پھر یہ رفتہ رفتہ سکڑتی ہے اور مختلف منزلوں سے گزر کر تعمیل کو پہنچتی ہے یہاں تک کہ اس میں اربہا ارب سورج نمودار ہوتے ہیں۔ پھر ان سورجوں کے تابع سیارے وجود میں آتے ہیں جیسے مریخ، زہرہ، زمین، زحل، مشتری وغیرہ ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ کہکشاں پرانی ہو جاتی ہے۔ سورجوں کے توابع اپنے اپنے سورجوں کی طرف واپس آنے لگتے ہیں اور ان میں جا کر گر جاتے ہیں۔ پھر سورج یا تو بے نور ہو جاتے ہیں یا پھٹ جاتے ہیں۔ آخر پوری کہکشاں پھٹ جاتی ہے اور کائناتی بادل میں تحویل ہو کر فضائے بسیط میں منتشر ہو جاتی ہے۔ دوربینوں سے

حساب مقصود نہیں بلکہ تمثیلی زبان میں ایک طویل مدت کی شباہت سے انسانی ذہن کو مانوس کرنا مقصود ہے۔[۲] کلام پاک اپنے بیانات سے انسان کے ذہن کو اس طرف مبذول کر دیتا ہے کہ کائنات کے مختلف مدارج میں دوران وقت مختلف ہے۔ چنانچہ اسی کائنات میں ایسے نظام موجود ہیں کہ ہمارے ہزاروں برس گزر جاتے ہیں لیکن وہاں کا ایک دن بھی پورا نہیں ہوتا۔ قرآن شریف میں جہاں کہا گیا ہے کہ زمین اور آسمانوں کو خدا نے چھ دن میں بنایا اور پھر وہ اپنے عرش قائم ہو گیا، اس کی تشریح اسی طرح کی جائے گی کہ یہ چھ دن کائناتی ایام ہیں جن سے ہمارے ایام کو کوئی نسبت نہیں۔[۳] قرآن کے اس بیان سے یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ زمین اور کی تخلیق یک بیک نہیں ہوئی۔ یہ تخلیق مدارج سے گزرتی ہے جس کا اندازہ تعداد ایام سے کیا جا سکتا ہے۔ زمینوں اور آسمانوں کی تکوین گویا چھ ارتقائی منزل سے گزرتی ہے۔ خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ کائنات کا ارتقائی تصور قرآن شریف کے بیان تخلیق کو دیگر صحف کے بیانات سے ممیز وممتاز کرتا ہے۔ انہوں نے سورہ انبیاء کی چند آیات کا حوالہ دیا ہے جس میں ارشاد ہے کہ ''کیا ان لوگوں نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ آسمان اور زمین دونوں ہر بستہ (بند) تھے تو ہم نے دونوں کو شگافیہ کیا (کھول دیا) اور ہم ہی نے ہر جاندار چیز کو پانی سے پیدا کیا۔''

ان آیات سے یہ بات شعور انسانی کے سامنے منور ہوتی ہے کہ آسمان ایک بند وجود تھا، اللہ نے اس میں انشقاق پیدا کیا۔ آج کل تخلیق کائنات کے جو سائنسی نظریے ہیں وہ دو متبادل راہوں پر گئے ہیں۔ ایک نظریہ فشاری (explosive) کہلاتا ہے اور دوسرا استقراری (Steady)۔ اول الذکر نظریے کے بموجب تمام کائنات ایک جوہر (atom) میں مرتکز تھی جو کائناتی توانائی کا بند خزانہ تھا۔ اس کے اندر انشقاق واقع ہوا۔ توانائی چاروں طرف نکل کر پھیل گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اس توانائی میں سکون آنا شروع ہوا جس سے گیسی بادلوں کا وجود ہوا۔ یہ بادل اور ٹھنڈے ہوئے جن سے رفتہ رفتہ کہکشاں وجود میں آئے۔ کیا قرآن شریف کی مندرجہ بالا آیت میں اس نظریے کی طرف واضح اشارہ نہیں ہے؟ کائنات کی تخلیق کا دوسرا نظریہ استقراری ہے جس کے بموجب کائنات میں تخلیق وحدت کا سلسلہ مسلسل ہے۔ کسی نامعلوم مرکز سے توانائی مسلسل وجود میں آتی ہے۔ جس سے سحابیہ یعنی کائناتی بادل بنتے ہیں، پھر اپنی ارتقاء کی منازل طے کر کے کہکشاؤں، سورجوں کی صورت میں نمودار ہو کر

مختلف مدارج کی کہکشاؤں کا پتہ چلا ہے۔ ان میں ایسی کہکشائیں بھی نظر آتی ہیں جو ابھی سحابیہ کے درجے میں ہیں۔ ان میں وہ بھی ہیں جو اس درجہ سے آگے بڑھ چکی ہیں اور وہ بھی جو اپنے پورے ارتقاء پر پہنچ چکی ہیں اور ایسی بھی ہیں جن پر قیامت گزر چکی ہے۔ قرآن مجید میں جب قیامت کا بیان آیا تھا تو اس وقت مفکرین اس کا مذاق اڑاتے تھے۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ماہرین طبیعیات کائنات کو ایک میکانکی نظام سمجھتے تھے جس کی ساخت یکساں ہے اور جس میں زیروزبر ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن جب دوربینوں سے کائنات کو بنتے اور بگڑتے دیکھا گیا تو قرآنی الہامات کی تائید ہوتی ہے اور سورج کا سوا نیزہ پر آجانا برحق معلوم ہوتا ہے قرآن مجید میں قیامت کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ محض ایک تخیل و افسانہ نہیں۔ آج کل کے انکشافات کی روشنی میں یہ ایک زندہ حقیقت ہے جس کی تصدیق فلکیاتی تحقیق سے روز بروز ہوتی رہتی ہے۔ پہاڑوں کا ریزہ ریزہ ہونا، روئی کے گالوں کی طرح اڑنا اور احتراق کی شدت، ان جوہری دھماکوں کا قریب ترین بیان ہیں جو مختلف کہکشاؤں میں ہوتے رہتے ہیں۔

ارتقاء میں ایام کا ایک خصوصی پیمانہ درکار ہے۔ ہمارے رات اور دن صرف زمین کے مظاہر ہیں۔ حد زمین سے باہر خلاء میں بلکہ نظام شمسی کے اندر سفر تک میں یہ بے قیمت ہو جاتے ہیں۔ نظام شمسی سے باہر تو یہ بالکل بے معنی ہیں۔ خیال کیجئے کہ جب بات نظام شمسی سے بڑھ کر کہکشانی نظام اور ان کے درمیان زمان و مکان کے فاصلوں کی ہو تو واقعی ان میں مفہوم بھی کیا رہ جاتا ہے؟ یہ لازمی امر ہے کہ کہکشانی ایام، نظام شمسی کے ایام سے مختلف ہوں اور خود نظام شمسی کے ایام زمین کے ایام سے مختلف ہوں۔ اسی طرح کل کائنات کے ایام بھی ہر کہکشاں کے ایام سے مختلف ہوں۔ جدید تحقیقات ان انکشافات تک بدیہی طور پر پہنچا دیتی ہیں۔ قرآن شریف ان تحقیقات کا پورا پورا ساتھ دیتا ہے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ ”کلام پاک کے قاری کے لیے یہ امر پریشانی کا باعث نہیں ہونا چاہئے...... کلام پاک واضح طور پر ارشاد فرماتا ہے کہ خدا تعالیٰ کے ہاں وقت انسانی وقت سے قطعی مختلف ہے۔ ایک جگہ آتا ہے کہ اللہ کا ایک دن ہمارے ہاں کے ایک لاکھ برس کے مساوی ہے۔[۱] حشر کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس کا ایک دن تم لوگوں کے شمار کے موافق ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ (۲۲، ۴۶) خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ امر ملحوظ رکھنا مناسب ہوگا کہ ان اعداد سے وقت کا ایک ناپ تلا

رفتہ رفتہ سکڑ کر اور پھٹ کر یہ فنا ہو جاتے ہیں، فنا ہونے پر پھر ''سحابیہ'' یا کائناتی بادل وجود میں آتا ہے۔ یہ سلسلہ لگاتار ہے۔ توانائی فساد کا شکار ہو کر پھر کون میں نمودار ہوتی ہے۔ اس کے بعد سحابیہ کی شکل میں نمودار ہونے کے لیے یہ تشبیہ کتنی محاکاتی ہے کہ آسمان بند تھا پھر رب نے اس میں شگاف کیا۔

زمین کے بارے میں بھی قرآن شریف کا ارشاد ہے کہ خدا نے اسے شگافیہ کیا اور اس طرح زمین میں سے مختلف انواع و اقسام کے جمادات اور نباتات کا ظہور ہوا۔ اگر کل کائناتی تخلیق پر ایک عمومی نظر ڈالی جائے تو ایک ناقابل شکست سلسلہ معلوم ہوتا ہے جس میں کہیں رخنہ نہیں ہے۔

خلیفہ صاحب اپنے نظریہ ارتقاء میں وحدت کائنات پر زور دیتے ہیں۔ ان کے فلسفہ میں پوری تخلیق ایک واحد سلسلہ ہے۔ چونکہ خالق ایک ہے اس لئے تمام تخلیق میں وحدت ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ''قرآن پاک ہمیں اس کا درس دیتا ہے کہ زندگی ایک زنجیر کی طرح ہے جو کہیں سے ٹوٹی ہوئی نہیں ہے۔ غیر نامیاتی مادہ نامیاتی مادے میں تبدیل ہوتا رہتا ہے اور نامیاتی مادہ سے نفس یا ذہن وجود میں آتا ہے۔'' [۴]

قرآن شریف کی ان تعلیمات پر، جن کی نشان دہی خلیفہ صاحب کرتے ہیں، دور حاضر کے فلسفہ سائنس کی اساس قائم ہے۔ سائنسی اسلوب کے مطابق ذہن کی تشریح نامیاتی تعاملات سے اور نامیاتی تعاملات کی تشریح غیر نامیاتی تعاملات سے اور ان کی تشریح عالمگیر طبعی قوانین سے کی جاتی ہے۔ ان تشریحات سے کائنات کی سائنسی تعبیر حاصل ہوتی ہے جو اس کی کلی تعبیر میں ایک اہم مقام کی ضرور حامل ہوتی ہے۔

دورِ جدید کی لیچریت کا سب سے بڑا مخمصہ یہ ہے کہ وہ کائنات کی اس تعبیر سے مطمئن ہو جاتی ہے۔ حالانکہ خود اسی تعبیر کے اندر اعلیٰ تر تعبیر کے اجزاء پوشیدہ ہیں اور کائنات اپنی نمود میں ایک روحانی سلسلہ معلوم ہوتی ہے۔

خلیفہ صاحب قرآن شریف کے بیانات سے اس سلسلہ کو واضح کرتے ہیں۔ جدید حیاتیات کا بنیادی انقلاب ''انتخاب فطری'' کے قانون کی دریافت ہے۔ خلیفہ صاحب ''انتخاب فطری'' کو کسی اتفاق پر محمول نہیں فرماتے۔ وہ اس کو قدرت کے ایک ایسے مسلمہ اصول کی کارفرمائی قرار دیتے ہیں جس کا انکشاف قرآن مجید فرماتا ہے: ''اسی نے آسمان سے

کونیاتی ہے۔ حیاتیاتی، تاریخی، روحانی غرض تمام واقعات پر محیط ہے۔

قرآن مجید کے ان ارشادات سے ارتقاء کے جو قوانین مرتب ہوتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ کائنات میں ناسخ و منسوخ کا سلسلہ جاری ہے۔ ۲۔ جب کوئی چیز فنا ہو جاتی ہے تو ویسی ہی چیز یا اس سے بہتر چیز اس کی جگہ لے لیتی ہے اور ۳۔ ایک چیز اس وقت فنا ہوتی یا غائب ہو جاتی ہے جبکہ وہ بے کار ہوتی ہے اور کوئی وظیفہ انجام نہیں دے سکتی۔ بالفاظ دیگر جب کوئی شئے مد فضول میں شمار ہونے لگتی ہے تو وہ فنا ہو جاتی ہے۔

ارتقاء کے ان عالمگیر اصولوں کی روشنی میں تقدیر انسانی کا تجزیہ کرنا بہت اہم ہے۔ یہ امر بالکل واضح ہے کہ تخلیق نوع انسانی کائناتی ارتقاء سے کوئی مختلف یا ممیّز چیز نہیں۔ قرآن شریف میں ارشاد ہے کہ انسان کو کھنکتی مٹی سے پیدا کیا گیا ہے۔ (۲۶،۱۵)۔ ایک جگہ آیا ہے کہ لیس دار کیچڑ سے بنایا ہے۔ انسان اسی کائنات کے ارتقاء کا ایک ثمر ہے۔ حیات کے نمود کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ حیات پانی پر نمودار ہوئی (۴۵،۲۴)۔ جدید حیاتیاتی تحقیقات بھی اس کی نشاندہی کرتی ہے۔ 'لیس دار کیچڑ'' نامیاتی ترکیب کی تمثیل ہو سکتی ہے اور کھنکتی مٹی ارضی ارتقاء کی اس سے بھی کہیں اول منازل کی نشاندہی کرتی ہے جبکہ زمینی مادہ ابھی سیال اور آتشین تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں کھنک پیدا ہو رہی تھی۔

(۲)

خلیفہ صاحب قرآن مجید میں میلاد آدم کے سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ ''انسان کی تخلیق کی بابت جو ارشادات کلام پاک میں ہیں وہ بیحد اہم ہیں۔ جو فرق کلام پاک اور تورات میں اس مسئلے میں ہے وہ درحقیقت انسانوں کے متعلق اسلامی عقائد کی ترجمانی کرتا ہے۔ کونیاتی قوتیں انسان کی میلاد کی مخالف تھیں چونکہ ان کو یہ خدشہ تھا کہ انسان اپنے آزاد ارادے کا غلط استعمال کرے گا ارادے کی آزادی دیگر مخلوقات کو بھی دی گئی تھی لیکن ان سب نے اس کے استعمال سے معذرت چاہی، چونکہ اس میں بے انتہا خطرات مضمر تھے، لیکن انسان اس مقام کو پہنچ گیا جہاں فرشتے قدم رکھتے ہوئے گھبراتے تھے۔ مگر قدرت کے کارخانے میں قانون کی خلاف ورزی ناممکن ہے۔ انسان کا ارتقائی سفر جو اس کو جبلت سے

پانی برسایا، پھر اپنے اپنے انداز سے نالے نکلے۔ پھر پانی کے ریلے پر پھولا ہوا جھاگ (پھین) آ گیا اور اس چیز پر جسے وہ لوگ کوئی زیور یا سامان بنانے کی خاطر آگ میں جلاتے ہیں اسی طرح جھاگ آ جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ یوں حق و باطل کی تمثیل بیان کرتا ہے۔ جھاگ غائب ہو جاتا ہے اور جس سے لوگوں کو نفع پہنچتا ہے وہ زمین میں ٹھہرا رہتا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ امثال بیان کرتا ہے۔''

اس ارشاد کی بابت خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں ایک مثال قدرتی تغیرات سے اور دوسری مثال فن سے لی گئی ہے۔ جس طرح فن انتخاب کرتا ہے اسی طرح سے قدرت بھی انتخاب کرتی ہے۔ جھاگ میں ایک رمق پانی سے مشابہت ضرور ہے لیکن اس میں از خود یہ صلاحیت نہیں کہ وہ پیاس بجھا سکے اور نہ ہی اس میں زندگی کو فروغ دینے کی قدرت ہے۔ اس طرح سے پھین تو الگ ہو جاتا ہے لیکن پانی باقی رہتا ہے۔ بعینہٖ دھات کو پگھلانے میں اس مادہ کو جس کی ضرورت باقی نہیں رہتی الگ کر دیا جاتا ہے اور اس طرح دھات خالص صورت میں الگ ہو جاتی ہے۔[۵]

خلیفہ صاحب اس تشریح سے واضح کرتے ہیں کہ قدرتی ارتقاء میں قانون یہ ہے کہ جو شئے ناکارہ ہو وہ فنا ہو جاتی ہے اور جو چیز بار آوری کی صلاحیت رکھتی ہے یا مفید ہو وہ ٹھہری رہتی ہے یا باقی رہ جاتی ہے۔

خلیفہ صاحب اس مفہوم کو آیات تنسیخ سے اور زیادہ عمیق بناتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ خود آیات تنسیخ کی اس نئی معنویت کو اجاگر کر کے خلیفہ صاحب نے علم تفسیر کی بھی خدمت کی ہے۔ مفسرین نے یہ خیال آرائی کی ہے کہ آیات منسوخہ کا موضوع وہ احکامات الٰہی ہیں جن کو منسوخ کر دیا گیا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ تنسیخ کی ان آیات کے موضوع کو محدود کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ تنسیخ ایک عالمگیر اصول ہے جس کو قرآن مجید یوں واضح کرتا ہے:

''ہم جب کوئی آیت منسوخ کرتے ہیں یا مٹا دیتے میں تو اس سے بہتر یا ویسی ہی آیت نازل کر دیتے ہیں۔''

آیت سے مراد ''نشانی'' ہے۔ کلام الٰہی بھی آیت الٰہی ہے اور خود بموجب قرآن مجید کائنات کی ہر شئے بھی آیت الٰہی ہے۔ چنانچہ یہ آیت ایک عالمگیر اصول کو واضح کرتی ہے کہ جب کوئی چیز فنا ہو جاتی ہے تو اس سے بہتر یا ویسی ہی چیز نمودار ہو جاتی ہے۔ یہ اصول

خرد کی طرف لے جاتا ہے خدائے تعالیٰ کے انسان کی صلاحیتوں پر کامل بھروسے کا نتیجہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کو ایک ایسی نوع مقصود تھی جو علم کے ذریعے سے جہالت کے وسیع دریا کو پاٹ دے اور اپنی آزادی کے صحیح استعمال سے اپنے آزاد ارادے کو خدا کی مرضی کے حوالے کر دے۔"[۶]

خلیفہ صاحب نے یہاں فرشتوں کے اعتراض کو جو انہوں نے میلادِ آدم کے سلسلے میں کیا تھا تمثالی انشاء پر محمول فرمایا ہے۔ فرشتوں کو ورائے سہ ابعاد وجود تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس صورت سے فرشتوں سے مراد کونی قوتیں بھی ہو سکتی ہیں۔ میں پہلے بھی اس امر کا ذکر کر چکا ہوں کہ انسان کے لیے تو تین ابعاد ہی ہیں لیکن اس سے اور زیادہ ابعاد نظریاتی طور پر ممکن ہیں اور وائٹ ہیڈ کا قول تو یہ ہے کہ ۳۳۳ ابعاد ممکن ہو سکتے ہیں۔ خلیفہ صاحب نے فرشتوں کے لیے Cosmic forces کا لفظ استعمال کیا ہے اور ظاہر ہے کہ فرشتوں کا وجود ہمارے ابعادی تصورِ حیات سے ماورائی ہے۔

قرآن حکیم کہتا ہے کہ "اگر ہم مناسب سمجھتے تو تم ہی کو فرشتے بنا کر اس زمین میں تمہارا جانشین نافذ کر دیتے۔" علامہ مشرقی نے اس کی توجیہ کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "انسان کا اپنی موجودہ حالت سے بہتر مخلوق بننے کے متعلق قرآن عظیم میں ایک خفیف سا اشارہ ہے۔ یہاں منکم کے الفاظ نہایت قابلِ لحاظ ہیں۔"[۷]

ایک دور ایسا تھا جب انسان اپنے ماحول سے بیگانہ تھا اور انسان اور اس کے ماحول میں باہمی افتراق تھا۔ اس وقت تک اس کی عقل جبلت تک محدود تھی اور اس نے آلہ خود کا استعمال نہیں سیکھا تھا۔ وہ اپنے ماحول سے خوفزدہ تھا اور اس ماحول سے اپنی زندگی کو محفوظ کرنے کی غرض سے وہ غاروں سے زیادہ باہر آنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن رفتہ رفتہ یہ افتراق دور ہونے لگا اور ہراسانی کے بادل چھٹنے لگے۔ اقبال نے اس سلسلے میں ایک نہایت بسیط رائے پیش کی ہے۔ اس نظریے کے مطابق یہ امر لازمی نہیں کہ کلام پاک میں جو ارشادات میلادِ آدم کے متعلق ہیں وہ انسان کی پہلی مرتبہ دنیا میں موجودگی کی وضاحت کرتے ہوں بلکہ ان کا مقصد اس دور کی توجیہ سے ہے جب کہ انسان اور اس کے ماحول میں باہمی انشقاق تھا۔ موجودہ دور کا انسان ماحول پر قابو پانے کی کوشش میں منہمک ہے لیکن قدیمی ادوار میں انسان اس سے بے حد خائف تھا۔ لیکن جب انسان شعور اور آزاد ارادہ کے ہتھیار

استعمال کرتا ہے تو اس کے یہ معنی ہوئے کہ وہ آپ ہی آپ مدنیت کے دور میں قدم رکھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آزاد مرضی کا انکشاف اقبال کے نظریہ کے مطابق انسان کو شجر ممنوعہ کی طرف لے گیا۔ تورات کے مطابق تقصیر کے مجرم صرف حضرت حوا تھیں جنہوں نے ابلیس کے بہکانے اور ورغلانے سے حضرت آدم کو بھی اس تقصیر میں شامل کر لیا۔ قرآن میں صاف طور پر ارشاد موجود ہے کہ حضرت آدم اور حضرت حوا دونوں اس تقصیر میں شامل تھے۔ اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن کا مقصد انسانی تمدن کی ایک ارتقائی منزل کی نشاندہی فرماتا ہے، مدنیت میں عورت اور مرد دونوں کا حصہ ہوتا ہے۔ اس منزل سے اس عظیم دور کی ابتداء ہوتی ہے جس میں انسان خود اپنے اعمال کا آپ ذمہ دار ہے اور خود اس کو اپنا بار آپ اٹھانا ہے۔ یہی جلاوطنی ہے اور اسی جلاوطنی سے انسان اعلیٰ وارفع مدارج پا سکتا ہے۔''

خلیفہ صاحب اور اقبال دونوں ہی کی یہ رائے کہ حضرت آدم سے مراد لازمی طور پر پہلے انسان نہیں، بلکہ اس انسان سے ہے جس نے خرد اور آزاد ارادہ کا پہلی مرتبہ استعمال کیا۔ اقبال کہتے ہیں کہ اس میں شک نہیں کہ حضرت آدم کو ابتداء میں ایک نہایت مشکل ماحول کا سامنا کرنا پڑا لیکن درحقیقت یہ عقوبت حضرت آدم کو اپنی تقصیر کی بناء پر نہیں ہوئی تھی بلکہ آپ کے اور انسان کے آئندہ فائدے کی غرض سے دی گئی تھی۔ اس کا مقصد شیطان کے اس فاسد منصوبے کو ختم کرنا تھا جو وہ انسان کے خلاف اپنے ذہن میں رکھے ہوئے تھا۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ''انسان کی محدود خودی کی پرورش اور اس کی بالیدگی کے لیے مخالف ماحول درکار ہوتا ہے۔ خودی جو کچھ تجربہ حاصل کرتی ہے اس کے کئی راستے ہیں اور اس کے ارتقاء وفروغ کا راز سعی پیہم میں مضمر ہے۔ اس سعی میں تقصیر اور غلط دونوں کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ چنانچہ غلطی جس کو ہم ایک ذہنی گناہ تصور کر سکتے ہیں انسان کی تجرباتی تخلیق کا ایک لازم وملزوم جزو ہے۔[۸]

اس تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن میں وہ اسطوریاتی عنصر جو تورات وانجیل کے باب تخلیق میں پایا جاتا ہے نظر انداز کر دیا گیا ہے اور اس کی تاویل اس طرح کی گئی ہے کہ وہ ہمارے ذہنی ابواب میں نہایت لطیف طور پر سما سکتا ہے۔ تورات میں کہا گیا ہے کہ خدا کو شام کے وقت حضرت آدم اور حضرت حوا کی اس تقصیر کا علم ہوا۔ اس کے معنی یہ ہوئے کہ خالق ارض وسما کو علم واقعہ کے بعد ہوا اور اس پر ناراض ہو کر اس نے حضرت آدم اور حضرت حوا کی جنت

سے اکال دیا لیکن قرآن میں اس قسم کا کوئی اشارہ موجود نہیں جس سے خدا کا علم اس قدر محدود ظاہر ہو۔ بہر حال حال قصہ آدم وحوا کی تشریح اقبال اور خلیفہ صاحب انسانی ارتقاء کی ابتدائی منزل کی طرف اشارت سے کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں آدم سے مراد کوئی واحد فرد انسان نہیں وہ ہے بلکہ نوع انسانی مراد ہے۔ تفسیر کا مشہور واقعہ انفرادی ارادہ کے استعمال کی طرف اشارہ ہے۔ خدا کا قصور معاف کرنا اور انسان کو اپنی مرضی سے یا خدا کی دی ہوئی ہدایت کے مطابق زندگی گزارنے کے لیے روانہ کرنے سے مراد انسانی نوع کے ارتقاء کی اس منزل کا آغاز ہے جہاں سے تہذیب وتمدن کی ابتدائی ہوئی ہے۔ اس تاویل کو ارتقاء اور مذہب کے اندر موافقت پیدا کرنے کی ایک کوشش ہی کہا جا سکتا ہے۔ حال ہی میں ایک اور کوشش ہوئی ہے جو میرے خیال میں حیاتیاتی ارتقاء اور قرآنی ارشادات میں بہتر موافقت پیدا کرتی ہے۔ یہ نئی کوشش سبط نبی نقوی صاحب نے کی ہے جس کے مطابق آدم سے مراد نوع انسانی نہیں ٹھہرتی بلکہ پہلے واحد انسان ٹھہرتے ہیں۔[۹] قرآن کا یہ تصور کہ آدم وحوا پہلے افراد انسانی ہیں نقوی صاحب کے نظریے کے مطابق حیاتیاتی ارتقاء کے تصور کے عین موافق ہے۔ نقوی صاحب کے اس نظریہ سے قرآن عظیم کے اس ارشاد کی بھی کہ انسان کو خدا نے نفس واحد سے پیدا کیا ہے، تائید ہو جاتی ہے۔ نقوی صاحب کہتے ہیں کہ تقلب ایک حیاتی قانون ہے اور ہو سکتا ہے کہ حضرت آدم کی تخلیق ایک ایسے حیوانی سے ہوئی ہو جو انسان سے کمتر ہو اور قرآن کے ''نفس واحد'' سے وہی مراد ہو۔ اگر اس نظریے کو مان لیا جائے تو حضرت آدم کی وہ تمثیلی حیثیت جو خلیفہ صاحب اور اقبال نے تعین کی ہے باقی نہیں رہتی اور آپ کو پہلا انسان تصور کیا جا سکتا ہے۔

خلیفہ صاحب اپنے تصور ارتقاء میں واضح کرتے ہیں کہ انسان کے مدنی ارتقاء کے بارے میں بھی قرآن کے بیانات میں اہم علمی خزانے پوشیدہ ہیں۔ طوفان نوح ایک اہم تمدنی منزل کی نشاندہی کرتا ہے۔ گارڈن چائلڈ (Gordon Chidle) کہتا ہے کہ طوفان نوح کا جو ذکر قدیم عہد نامہ میں مذکور ہے وہ ''شاعرانہ ہے اور اس کی بنیاد حقیقت پسندی پر کم ہے۔[۱۰] تاہم طوفانی مطروحات (Flood deposite) عراق کے مختلف مقامات میں پائے گئے ہیں جن میں اور 'ارچ' شروپک اور کش قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں اریدید کے مقام پر سب سے قدیم مندر جس کو طوفان نوح سے قبل کا تصور کیا جاتا ہے دریافت ہوا ہے۔

یہ بحث کہ طوفان نوح عالمی تھا یا محدود ایک ایسی بحث ہے کہ جس کے لیے مختلف تاریخی و بشریاتی شہادتیں درکار ہیں جو فی الوقت ہمارے پاس نہیں ہیں۔ کلام پاک میں جو کچھ مذکور ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت نوح کی قوم نے آپ کے پیغام کو ماننے سے ہی قطعاً انکار کر دیا۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ حضرت نوح جو اخلاقی روایات اپنی قوم کی سرشت میں داخل کرنا چاہتے تھے اس میں آپ کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ جب حضرت نوح کو بشارت دی گئی کہ آپ اور دیگر مخصوص بندے طوفان کی زد سے محفوظ رہیں گے تو آپ نے خدا سے کہا کہ آپ کی قوم کا نیست و نابود ہو جانا ہی بہتر ہے۔ اس لحاظ سے خواہ طوفان عالمی تھا یا محدود، وہ انسان کو ایک ارتقائی منزل پر لے جانے کا پیشہ خیمہ ضرور تھا۔ حضرت نوح کا کشتی بنانا ہی انسانی ترقی کی ایک دلیل ہے۔ سورہ المومنون میں جو واقعہ مذکور ہے اس سے کلام پاک کے ان ارشادات کی توجیہ ہو جاتی ہے جہاں فرمایا گیا ہے کہ جو قوم اپنے آپ میں ترقی کی طرف گامزن ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتی اس کا تباہ ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔ حضرت نوح کی قوم نے یہی کیا اور جب تباہی کی طرف رخت سفر باندھ لیا تو وہ لازمی طور پر تباہی کی سزاوار ہو گئی۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ تمدنی ارتقاء کی دوسری منزل کی نشاندہی قرآن شریف حضرت ابراہیم کے واقعات سے کرتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی بعثت ایسے دور میں ہوئی تھی جب کہ مظاہر پرستی نے آلہ پرستی کو کم و بیش بالکل ختم کر دیا تھا۔ اس آلہ پرستی میں قربانی کے رسوم اور عمل عبادت گزاری اور نذر و نیاز کا لازمی جزو بن چکے تھے۔ چنانچہ دوشیزاؤں اور بے گناہ بچوں کو دیوتاؤں کی بھینٹ چڑھایا جاتا تھا۔ خلیفہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے بچے کی قربانی کو جانور کی قربانی سے بدل کر ثقافت میں ایک عظیم الشان انقلاب کی بنیاد ڈالی ہے اور وہ یہ کہ محبوب حقیقی انسانوں سے محبت کرتا ہے اور اپنی بھینٹ چڑھوانا پسند نہیں فرماتا۔ انسانی قربانیوں کے اس عالمگیر دور میں حضرت ابراہیمؑ کا بیان ایک نئے مذہبی ارتقاء کی ترجمانی کرتا ہے جس میں وحدت الٰہی کے ساتھ رحمت الٰہی مذہبی شعور کا اصلی عنصر بن گئی۔ نبوت نے حضرت ابراہیمؑ کے بعد جو ارتقاء پذیر صورت اختیار کی اس کو سنت ابراہیمؑ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ آپ کے بعد جتنے انبیاء آئے وہ دین ابراہیمی ہی سے موسوم ہوئے۔ حضرت ابراہیمؑ کی آزمائش کے سلسلے میں خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ جس حکم کو آپ

سے خدا کا حکم تصور کر لیا تھا وہ در حقیقت اس مذہب کا مظہر تھا جس میں انسانی قربانی کا رواج موجود تھا اور خدائے تعالیٰ اس قدر سنگین فرمان بھی اپنے پسندیدہ بندے کو نہیں دے سکتا کہ وہ اپنے ایک اس قدر عزیز بیٹے کو قربانی کی بھینٹ چڑھا دے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو راستہ اختیار کیا وہ یقیناً آپ کی عظمت کی شہادت دیتا ہے۔ ویسے غور سے دیکھا جائے تو یہ ایمان خدائے تعالیٰ کی ودیعت تھی ورنہ بے شمار انسان سورج کو غروب ہوتے ہوئے دیکھ چکے ہوں گے لیکن کتنوں کو خدا کی عظمت کا اعتراف اس حقیقت سے ہوا تھا؟ حضرت ابراہیمؑ ایک نبی کی حیثیت سے خدا تعالیٰ کا پیغام بنی نوع انسان کے لیے لائے تھے ورنہ یوں تو بہت سے مفکرین گزرے ہیں جنہوں نے خدا کے وجود پر شہادت دی ہے۔ مگر خالق کا ایک مبہم سا تصور ہی کافی نہیں ہے۔ ایک پیغمبر کو تو خدا کی راہ میں ہر قسم کی صعوبت سے نبرد آزمائی کرنا پڑتی ہے اور اس کا پایہ ان سب آزمائشوں سے بالاتر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو نبیوں میں اس قدر افضل مقام حاصل ہے۔

خلیفہ صاحب نے اس ضمن میں جو مذکورہ زاویہ نظر اختیار کیا وہ ان کے اس نظریے پر مبنی ہے جس میں خدا کی خصوصیات میں رحمت کو وہ سب سے افضل درجہ دیتے ہیں۔ چنانچہ خلیفہ صاحب یہ تصور کرنے کو تیار ہی نہیں ہیں کہ خدا حضرت ابراہیمؑ کو اس قدر سخت حکم دے سکتا تھا۔ خلیفہ صاحب ینگ (Jung) کے اجتماعی لاشعور (Collective Unconsious) کا حوالہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضرت ابراہیم کا وجدان ایک ایسی ارتقائی حیثیت کا حامل تھا جو آپ کو انبیاء میں ایک نہایت خاص اور ممتاز مقام تک لے جاتا ہے۔ مگر دوسرے نظریے سے دیکھا جائے تو یہ بھی خدا کی بے پایان رحمت تھی کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس کا فرمان بھی پورا کیا اور حضرت اسماعیلؑ کو آنچ تک نہ آئی۔

مشہور عبرانی فلسفی مارٹن بیوبر (Martin Buber) اس ضمن میں رقمطراز ہے کہ اگاممنون (Agamemnon) جو یونانی اسطوریات، ادبیات اور ڈراما میں ایک خاص درجہ رکھتا ہے، اپنی بیٹی آفی جینیا (Iphigenia) کو اپنے ملک کے لیے قربان کرنے کو تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت ابراہیمؑ جو ''ایمان کے سپہ سالار'' تھے اس منزل کو پار کر لیتے ہیں۔ کرکے گارڈ (Kierkegaard) حضرت ابراہیمؑ کے متعلق کہتا ہے کہ ''ایمان کا سپہ سالار اپنے آپ کو اس دنیا میں اکیلا پاتا ہے۔ جو کچھ وسائل اس کے پاس ہیں وہ اس کے

اپنے ہیں اور یہی امر انتہائی خوفزدہ ماحول پیدا کر دیتا ہے۔'' [۱۱]

سینٹ پال انسانوں کو دو اقسام میں تقسیم کرتے ہیں: ایک تو معمولی انسان اور دوسرا روحانی فرد (Pneumatic man) جس کو خدا ایک روحانی قوت عطا کر دیتا ہے گو کہ بظاہر وہ اور انسانوں کی طرح ایک انسان ہوتا ہے۔

سطور بالا میں میں نے خلیفہ صاحب سے اختلاف کیا ہے لیکن خلیفہ صاحب یہ فرمانے میں قطعاً حق بجانب ہیں کہ چوپایوں کی قربانی بذات خود ارتقائے انسان کی ایک زبردست شہادت پیش کرتی ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنے آپ کو توہمات کے سلاسل سے آزاد کرا رہا تھا۔ آگے چل کر خلیفہ صاحب فرماتے ہیں: ''یہ حضرت ابراہیمؑ کے وجدانی مذہب کی تکمیل تھی کہ قرآن حکیم کے ارشادات میں آنحضرت ﷺ فرماتے ہیں کہ آپ حضرت ابراہیمؑ کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ اہل یہود کی خواہش تھی کہ آپ ان کے اصولوں پر چلیں اور عیسائی خواہشمند تھے کہ آپ ان کے اصولوں یعنی تثلیث، اصل گناہ اور توبہ کو اپنائیں۔ کلام پاک نے آنحضرت ﷺ کو ہر دفعہ مخاطب کیا: اے رسولؐ! ان سے کہہ دے کہ تو ابراہیمؑ کا پیرو ہے جو نہ یہودی تھا اور نہ عیسائی۔ عبرانیت اور عیسائیت دونوں نے حضرت ابراہیمؑ کی وحدت کو ایک غلط شکل دے دی تھی اور تمام جلیل القدر اسرائیلی انبیاء کاہنان اسرائیل کی زیادتیوں کے خلاف احتجاج کرتے رہے، چونکہ اس رجعت پسندی نے مذہب کو اخلاق سے جدا کر دیا تھا۔ [۱۲] مگر بہر حال میلاد آدم سے اس دور تک انسان بے شمار ایسے ادوار سے گزر چکا ہے جن میں کچھ اس کے لیے تاریک تھے، لیکن مجموعی طور پر وہ ارتقاء کی طرف مائل رہا ہے۔ اسی ترقی اور فروغ کے بارے میں مولانا رومی فرماتے ہیں:

هفت صد هفتاد قالب دیده ام
همچو سبزه بارها روئیده ام

خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا ویسے ویسے نبیوں کا بعث ہونا بھی کم ہوتا گیا۔ مثلاً یہ کہ حضرت نوح کے بعد حضرت صالحؑ اور حضرت ہودؑ مبعوث کئے گئے۔ قوم لوط پر بھی اس لئے تباہی آئی کہ وہ حیاتیاتی قوانین سے کھلی خلاف ورزی پر اتر آئے تھے اور اس سے افزائش نسل خطرے میں پڑ گئی تھی۔ حضرت سلیمانؑ کے بعد نبیوں کی تعداد کم ہونا شروع ہو گئی حتیٰ کہ حضرت عیسیٰؑ اور رسول اکرمؐ کے درمیان ۵۷۰ سال کا فرق

ہے۔ لیکن حضرت داؤد، حضرت سلیمان اور حضرت دانیال کے درمیان اتنا فرق نہیں ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جیسے جیسے انسان ترقی کی طرف راستہ اختیار کرنے لگا، مواصلات کے ذرائع بہتر ہوتے گئے اور قوموں کے مابین آمد و رفت کے وسائل بہتر ہوتے گئے، نبیوں کے پیغامات بھی مختلف اقوام تک زیادہ موثر طریقے سے پہنچتے رہے۔ حضرت نوح ؑ سے حضرت ابراہیم ؑ اور حضرت موسیٰ ؑ کے زمانے تک صورت یہ رہی کہ پیغامات یا تو اکثر یکسر فراموش کر دیئے جاتے تھے یا ان کو غلط روایات میں تبدیل کر دیا جاتا تھا۔ خلیفہ صاحب کے بقول ان سب حالات کے پیش نظر ہم یہ امر استنباط کر سکتے ہیں کہ جیسے جیسے انسان ترقی کرتا گیا، نبیوں کا ظاہر ہونا بھی کم ہوتا گیا۔ آنحضرت ؐ کے مبعوث ہونے تک یہ سلسلہ ارتقاء کی طرف مائل تھا لیکن حضور سرور کائنات ؐ نے اس سلسلہ انبیاء کو پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ اللہ تعالیٰ کے جو کچھ احکامات کلام پاک میں مذکور ہیں اس ارتقائی منزل کی تائید کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آنحضرت ؐ کے زمانے میں انسان ترقی اور ارتقاء کی ایسی نہج پر پہنچ گیا تھا کہ وہ مستقبل کی منازل خود تعین کر سکتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے مزید احکامات کی ضرورت اس کو قرآن حکیم کے بعد نہ رہی۔ اس طرح سے حضور اکرم ؐ نے نبیوں کے پیغامات کو اور احکامات الٰہی کو کلام پاک کے ذریعہ سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔

حوالہ جات:

[۱] Khalifa Abdul Hakim, "Evolution" (an unpublished paper).

[۲] ایضاً۔

[۳] ایضاً۔

[۴] ایضاً۔

[۵] ایضاً۔

[۶] ایضاً۔

[۷] علامہ عنایت اللہ خاں المشرقی، تذکرہ، ص ۱۶۔

[۸] Iqbal, Reconstruction of Religious Thought in Islam, p.120.

[۹] Sibti Nabi Naqvi, "Quranic Cosmology", Iqbal Review,

October 1965.

V. Gordon Childe, New Light on the Most Ancient East, pp.10-11. [۱۰]

Martin Buber, Eclipse of God, p.116. [۱۱]

Khalifa A. Hakim, "Evolution". [۱۲]

33

روشن خیال مفکر

محمد جعفر پھلواروی

یوں تو مرحوم خلیفہ صاحب کو آغازِ تعلیم ہی سے علمی ادبی تحریری، تقریری اور مجلسی صلاحیتیں قدرت کی طرف سے عطا ہوئی تھیں لیکن زمانے کے ساتھ ساتھ مرحوم کی ان تمام صلاحیتوں میں ارتقا ہوتا گیا اور جب انہوں نے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنیاد رکھی تو ان کی تمام صلاحیتوں کی نمود بڑی تیزی سے آگے بڑھنے لگی۔ ثقافتی دور کو ان کی صلاحیتوں کے ارتقا کا آخری دور سمجھنا چاہئے۔ بعض اوقات انسان کے اندر بہت سے خیالات مرکوز ہوتے ہیں لیکن متعدد وجوہ سے ان کا اظہار یا تشریح نہیں ہو پاتی پھر جب مناسب موقع ہاتھ آتا ہے تو چھپی ہوئی چیزیں ابھرنے لگتی ہیں۔ مرحوم جب لاہور میں تھے تو انگریزی حکومت کا تسلط تھا۔ جب حیدر آباد میں تھے تو دن کو رات اور رات کو دن کہلوانے والا نظام حکومت پر مسلط تھا اور جب کشمیر میں تھے تو مظلوم مسلمان اکثریت پر جبر و استبداد کی حکومت تھی۔ غرض کسی جگہ بھی

انہیں وہ ماحول نہیں ملا جہاں وہ اپنے دل کی بات کھل کر کہہ سکتے۔ اپنی پرائیویٹ اور قابل اعتماد صحبتوں میں وہ بہت کچھ کہہ جاتے تھے لیکن لکھ نہیں سکتے تھے۔ ماحول کو نبھانا ضروری تھا اس لئے وہی باتیں کہیں جو خالص فلسفیانہ اور علمی و ادبی انداز کی تھیں اور جہاں صاف صاف کچھ کہنا پڑا وہاں حسین وجمیل اشاروں سے کام لیا یا لطائف کے پردے میں کہہ گئے۔

لیکن جب پاکستان وجود میں آیا اور انہیں خلاف توقع کشمیر چھوڑنا پڑا تو انہیں ایک ایسی فضا میسر آ گئی جہاں انہیں اپنے دل کی بات کہنے کے مواقع ہاتھ آئے۔ اب ان پر کوئی خارجی دباؤ نہ تھا اور اس کے علاوہ ملکی وقومی تقاضوں نے بھی انہیں مجبور کر دیا کہ وہ صحیح رہنمائی میں کوئی پس و پیش نہ کریں۔ بات انسان وہیں کرتا ہے جہاں کچھ لوگ اسے توجہ سے سننے والے موجود ہوں۔ تائید یا تردید میں سنجیدہ لطیف انداز اختیار کرتے ہوں۔ خوش قسمتی سے ایسا ہی ماحول ادارہ ثقافت اسلامیہ میں انہیں مل گیا۔ ایک طرف آزادی فکر وضمیر اور دوسری جانب رد وقبول کے لیے خوشگوار ماحول۔ ان دونوں چیزوں نے مل کر ایک ایسی فضا پیدا کر دی کہ حقائق ومعارف ابل ابل کر باہر آنے لگے۔ اعلیٰ افکار وخیالات اچھل اچھل کر بیساختہ پروان چڑھنے لگے۔

مرحوم خلیفہ صاحب کی طبیعت ”سقراطی“ واقع ہوئی تھی۔ پڑھنا لکھنا ان کا محبوب ترین مشغلہ تھا لیکن ان کی زندگی کے بہترین لمحات وہ ہوتے تھے جب اہل علم کا مجمع ہو اور وہاں کوئی علمی بحث چھڑی ہوئی ہو۔ ایسے مواقع پر مرحوم کے جوہر جس طرح کھلتے تھے وہ دیکھنے کے قابل ہوتے تھے۔ سوال و جواب بھی ہو رہے ہیں۔ طنز بھی ہو رہی ہے (مگر کسی ادنیٰ دل شکنی کے بغیر) لطائف بھی ہو رہے ہیں۔ پھر اشعار بھی ہیں، فلسفہ بھی ہے، تاریخ بھی ہے، حدیث بھی ہے، تفسیر بھی ہے اور ہر مشہور زبان کے اقتباسات بھی ہیں۔

یوں تو وہ جہاں بھی رہے اپنے حسن مذاق کے مطابق ایک ماحول پیدا کرتے رہے لیکن جو فضا انہیں یہاں لاہور میں اور خصوصاً ادارہ ثقافت اسلامیہ میں ملی وہ کہیں میسر نہ آسکی کیونکہ یہ مجلس عین ان کی آرزوؤں کے مطابق تھی اور یہیں ان کے سقراطی ذوق کی تسکین ہوتی تھی۔ یہاں کھل کر بولتے تھے اور کھل کر سنتے تھے۔ جس دن رفقائے ادارہ یا وہ اس لطف صحبت سے محروم رہ جاتے اس دن ہم دونوں ہی تشنگی سی محسوس کرتے تھے۔

خلیفہ صاحب کے بعض افکار کو سننے سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان پر کئی شخصیتوں

کا گہرا اثر تھا اور ان سب کے مجموعی اثرات نے مل جل کر خلیفہ صاحب کو ایک الگ نرالی شخصیت بنا دیا تھا۔ متاخرین میں وہ سرسیدؒ سے بہت متاثر تھے۔ اس کے بعد ان کے رفیق، شاگرد مولانا وحید الدین سلیمؒ سے بھی خاصے متاثر تھے۔ پھر علامہ اقبالؒ کے تو شاگرد ہی تھے۔ اس لیے ان کا بھی خاصا اثر خلیفہ صاحب پر تھا۔ ہم یہاں ان تمام لوگوں کا ذکر نہیں کر رہے ہیں جن کے افکار کا خلیفہ صاحب پر اثر تھا۔ یہاں ہم صرف انہی تین شخصیتوں کا ذکر کر رہے ہیں جن سے خلیفہ صاحب متاثر تھے۔

اس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں ہے کہ سرسیدؒ اپنے دور کے بے حد ترقی پسند علما میں تھے۔ بہت سے مسائل میں انہوں نے اپنے خیالات بے دھڑک ظاہر کیے اور اس وقت نہ یہ لحاظ کیا کہ عوام میں اس کا کیا ردعمل ہوگا اور نہ اس کی پرواہ کی کہ ہر مسئلے کو اجماعی کہنے والے علماء کیا کہیں گے۔ مثلاً انہوں نے سب سے پہلے حیات مسیح کے متعلق اپنے وہ خیالات ظاہر کیے جو "اجماع امت" کے خلاف سمجھے جاتے ہیں اور بعد میں انہی خیالات کا سرقہ کر کے بعض حضرات خود مسیح بھی بن گئے۔ معراج نبوی ﷺ کو انہوں نے جس انداز سے بیان کیا۔ وہ بھی تقریباً خلاف اجماع ہی سمجھا جاتا تھا۔ غلامی پر انہوں نے جو کچھ لکھا وہ بھی قدامت پرستوں کے نزدیک خلاف اجماع ہی تھا۔ اسی قسم کے بہت سے افکار ہیں جن کے اظہار کے عوض سرسید آج تک قابل ملامت سمجھے جاتے ہیں۔

یہی حال مولانا وحید الدین سلیم کا تھا۔ وہ فقہ کے سارے دفتر کو نظر ثانی کا محتاج سمجھتے تھے اور فرسودہ مسائل کو بالکل رد کر دینے کے قائل تھے۔

اس کے بعد اقبال کا دور آیا تو انہوں نے بھی فقہ جدید کی تدوین کو وقت کی سب سے بڑی ضرورت تسلیم کیا۔

خلیفہ صاحب مرحوم کے افکار پر ان تین شخصیتوں کا جو اثر تھا وہ ہمیشہ کسی نہ کسی شکل میں زبان وقلم سے ظاہر ہوتا رہتا تھا۔ وہ کسی مسلک کی فقہ کو از ابتدا تا انتہا واجب التسلیم نہیں سمجھتے تھے بلکہ کہتے تھے کہ موجودہ دور کی ضرورتوں اور تقاضوں کے مطابق جس مسلک کی فقہ میں کام کی بات ملے لے لینی چاہئے اور جو حصہ فقہ ہمارے عصری تقاضوں کو پورا نہ کرے اسے چھوڑ دینا چاہئے۔ اپنے خیالات کی وجہ سے ہر مسئلے کو وہ ترقی پسندانہ نقطہ نظر سے دیکھتے تھے اور ترقی پسندانہ ہی حل تلاش کرتے تھے۔ جمود سے وہ بڑی بیزاری کا اظہار کرتے تھے۔

ان کی ترقی پسندی محض خیالی نہ تھی بلکہ اس کا مفہوم یہ تھا کہ اسلامی اصولوں کی روشنی میں عصری تقاضوں کے مطابق چلنا چاہیئے۔

عائلی و ازدواجی کمیشن کے موقع پر وہ مجھ سے خصوصیت کے ساتھ ہر مرحلے پر مشورہ کرتے تھے۔ جہاں میرے ان کے درمیان رائے کا توافق ہوتا اور میں اس کے لیے حوالے تلاش کر کے دیتا تو وہ بے حد خوش ہوتے تھے۔ کمیشن کی رپورٹ سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنے خیالات میں کس قدر لبرل واقع ہوئے تھے اور اسی طرح اس جمود کا اندازہ کرنا بھی مشکل نہیں جو اختلافی نوٹ میں ظاہر کیا گیا ہے۔

فیملی پلاننگ پر میں ان سے کئی دن گفتگو کرتا رہا۔ جب میرا پورا اطمینان ہوگیا تو انہی کی فرمائش پر میں نے وہ تمام مضامین لکھے جو ادارے کی مطبوعہ ''تجدید نسل'' میں موجود ہیں۔

اسی طرح کمرشل انٹرسٹ پر میرے مضامین بھی انہی کی فرمائش سے شائع ہوئے۔

تعداد ازدواج پر جب انہوں نے میرے خیالات سنے تو اس موقع پر بھی انہی کی فرمائش سے میں نے اپنے مضامین قلم بند کئے جواب کتابی شکل میں شائع ہو گئے ہیں۔

ان تمام چیزوں سے پہلے ایک دن غنا و موسیقی کا ذکر چھڑ گیا۔ خلیفہ صاحب کو موسیقی سے عملی لگاؤ بالکل نہ تھا۔ انہوں نے کہا کہ سنا ہے آپ کو گانے سے بھی دلچسپی ہے۔ میں نے کہا! میں چشتی ہوں لیکن گانے سے میری دلچسپی چشتی ہونے سے بہت پہلے سے ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر اسلامی نقطہ نگاہ سے کچھ گفتگو ہوئی تو کہنے لگے کہ اگر گانا ہماری ثقافت میں شمار ہوسکے تو اس پر بھی ایک کتاب ہونی چاہیئے۔ میں نے کہا کہ یہ خدمت میرے سپرد کر دیجئے۔ جب میں نے ''اسلام اور موسیقی'' لکھی تو وہ اسے پڑھ کر بہت متاثر ہوئے چنانچہ جب عالمی سیمینار لاہور میں منعقد ہوا تو اقوامِ عالم کے ان تمام نمائندوں کو خلیفہ صاحب نے ادارے میں بھی مدعو کیا۔ اس موقع پر ادارے کی تمام مطبوعات کی نمائش بھی ہوئی تھی۔ خلیفہ صاحب نے انگریزی میں ادارے کے مقاصد اور کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے جب کتابوں کا تعارف کرایا تو مثال میں صرف ایک ہی کتاب کو پیش کیا اور وہ تھی ''اسلام اور موسیقی۔'' (اس کے بعد پروفیسر مہدی غلام نے اس تقریر کا برجستہ عربی ترجمہ کر کے عرب

نمائندوں کو سنایا)۔

اس کے علاوہ "تشبیہات رومی" میں خلیفہ صاحب نے آغاز ہی میں حاشئے پر بڑے اچھے الفاظ میں اس کتاب کا ذکر کیا ہے۔

مرحوم خلیفہ صاحب کو میرے خیالات سن کر بڑا تعجب ہوا تھا۔ انہوں نے ایک موقع پر پوچھا کہ مولوی ہونے کے باوجود یہ روشن خیالی کہاں سے آ گئی؟ کسی نے کہا ندوی ہونے کی وجہ سے۔ بولے سب ندوی تو ایسے نہیں ہوتے۔ مَیں نے کہا "اس کا جواب دو چار دن تک عرض کروں گا کیونکہ جو کچھ میں کہوں گا اس کی زندہ شہادت بھی ہونی چاہئے اور وہ دو چار دن تک آ جائے گی لیکن اگر آپ کو زبانی جواب سے تسکین ہو سکے تو میں عرض کروں۔ بات یہ ہے کہ میں بانی ندوۃ العلماء (حضرت مولانا شاہ سلیمان پھلواروی) کا فرزند ہوں اور وہ اپنے دور کے روشن خیال عالم و صوفی تھے اور مجھ میں یہ روشن خیالی انہیں سے وراثت میں ملی ہے......" کچھ دنوں کے بعد میں نے حضرت ممدوح کی وہ تقریر دکھائی جو انہوں نے ندوۃ العلماء کے ابتدائی اجلاس کانپور منعقد 1302ھ میں فرمائی تھی۔ یہ تقریر سرسید نے اپنے اخبار "تہذیب الاخلاق" میں اپنے ایک نوٹ کے ساتھ شائع کی تھی۔ خلیفہ صاحب نے یہ مضمون اور سرسید کا نوٹ غور سے پڑھا اور کہا کہ اسے ضرور "ثقافت" میں شائع کیجئے۔ البتہ فلاں فلاں چیزوں کو حذف کر دیجئے کیونکہ وہ اسی دور کی چیزیں ہیں اور موجودہ دور میں ان کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ چنانچہ ان کی ہدایت کے مطابق وہ تقریر ثقافت میں بھی شائع کر دی گئی۔

غرض خلیفہ صاحب مرحوم کئی اہم شخصیتوں سے متاثر ہو کر ایک الگ ممتاز شخصیت بن گئے تھے۔ ہم نے تو صرف تین متاخرین کا ذکر کیا ہے ورنہ متقدمین میں بھی بہت سے لوگوں سے متاثر تھے۔ سقراط، رومی، غزالی، اسپینوزا، گوئٹے وغیرہ سے بھی متاثر تھے۔ یہ تاثرات مرحوم کی تصنیفات میں جا بجا ملتے ہیں۔ لیکن ایک چیز ہر تاثر میں مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ خلیفہ صاحب انہی شخصیتوں سے متاثر تھے جو لبرل ہوں اور اونچے افکار و کردار کے مالک ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیہ میں انہیں وہ صوفی زیادہ پسند تھے جن کی تعلیمات و تصورات میں زیادہ جکڑ بندیاں نہ ہوں۔

34

فکرِ حکیم پر ایک نظر

قاضی جاوید

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم (وفات جنوری ۱۹۵۹ء) پاکستان کے اُن چند فلسفیوں میں سے ایک ہیں، جن کی شہرت ملک کی جغرافیائی حدود سے باہر تک پہنچی ہے۔ پاکستانی فلسفہ کی امتیازی صفت...... درمیانی راہ کی تلاش...... ان کے یہاں نمایاں طور پر موجود ہے۔ اُنھوں نے اسلام اور فلسفہ وسائنس کو ہم آہنگ کرنے اور نئی الٰہیات کی تشکیل کی اس روایت کو آگے بڑھانے کی کوشش کی ہے جس کا دورِ جدید میں آغاز سرسیّد احمد خان نے کیا تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم اسلام کا جائزہ مغربی علوم وتہذیب کے حوالے سے لیتے ہیں، ان کی نگارشات میں روایت پرستوں پر کڑی نکتہ چینی کی گئی ہے اور یہ زیادہ تر مولانا روم اور علامہ اقبال کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں مفکرین سے وہ بے حد متاثر ہیں۔ فری لینڈ ایبٹ نے انہیں ماورائیت پرست قرار دیتے ہوئے تعجب بھی ظاہر کیا ہے، کیونکہ ان کے خیال میں

جدیدیت پسندوں میں ماورائیت پرستی کا رجحان شاذ و نادر ہی ملتا ہے جو عام طور پر ماورائی تصور کی نفی کرنا چاہتے ہیں۔[۱] شاید یہ رائے دیتے ہوئے ایبٹ نے سرسید اور اقبال کو نظرانداز کر دیا تھا۔

خلیفہ عبدالحکیم نے فلسفے کو سائنس اور الٰہیات سے الگ کرنا چاہا ہے۔ برٹرینڈ رسل نے فلسفہ کو ان دونوں کے درمیان جگہ دینے کی سفارش کی تھی۔[۲] علامہ اقبال کی رائے اس سے زیادہ مختلف نہ تھی۔ خلیفہ عبدالحکیم کا کہنا یہ ہے کہ سائنس کی اہمیت اس کی افادیت پر مبنی ہے۔ اسی طرح مذہبی شخص بھی مطمئن فرد ہوتا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسے مکمل سچائی تک رسائی حاصل ہے۔ الٰہیاتی مفکر اس صداقت کی توجیہ و تعبیر کرتا ہے جس کو وہ قبول کیے ہوتا ہے۔ عام لوگ بھی اس صداقت کو پہلے سے قبول کیے ہوتے ہیں۔ الٰہیاتی مفکر سچائی کا متلاشی نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ سچائی تو پہلے سے اس کے پاس موجود ہے۔ اس کے برخلاف ''فلسفی انسان اور کائنات کے عظیم بھید کے مقابلے میں تنہا کھڑا ہوتا ہے۔ وہ ایک ایسا انفرادیت پسند ہوتا ہے جس کو نہ تو کسی جماعت کی حمایت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی وہ اس حمایت کا طلب گار ہوتا ہے۔''[۳] چنانچہ متکلم کے مقابلے میں فلسفی سچائی تک خود پہنچنے کا خواہش مند ہوتا ہے۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ اس بیان سے خلیفہ عبدالحکیم انسانی ذہن کی آزادانہ فکر و تحقیق کی صلاحیت کا اثبات کر رہے ہیں اور یہ کہ وہ آزاد فکر کو مذہبی فکر سے بہتر قرار دیتے ہوئے آزادیٔ فکر و نظر کی ترغیب دے رہے ہیں۔ ایسا نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ ان نئی اصطلاحوں کے پس پردہ ملا اور صوفی کی وہ فرسودہ کشمکش کارفرما ہے جو صدیوں سے صوفیانہ ثقافت کا اہم موضوع رہی ہے۔ صوفیا جسے عقل سے تعبیر کرتے تھے، آج کا متکلم اسے 'سائنس' کا عنوان دیتا ہے۔ خیر یہ بھی یاد رہے کہ خود خلیفہ عبدالحکیم ایک متکلم ہیں اور جب وہ علم کلام کے ماہرین کے گروہ پر نکتہ چینی کرتے ہیں تو گویا خود اپنی جماعت کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔

علامہ اقبال کی طرح خلیفہ عبدالحکیم ہمیں بتاتے ہیں کہ سائنس کا تعلق مظہری دُنیا کے اجزاء سے ہے۔ وہ حقیقت کے کسی ایک جزو کو کل سے جدا کر کے اس کا زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ طبعی علوم کا تعلق کمیت سے ہے، جب کہ زندگی کی حقیقتیں کیفی ہیں۔ لہٰذا سائنس ان کا مکمل فہم حاصل نہیں کر سکتی۔ یہاں خلیفہ عبدالحکیم کی راہ علامہ اقبال سے جدا ہوتی ہے۔ اقبال کا کہنا یہ تھا کہ اس صورتِ حال میں مذہب ہی سچائی کا

سرچشمہ ہو سکتا ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی رائے یہ ہے کہ ''اگر صرف متکلم پر بھروسہ کیا جائے تو انسانی روح جامد ہو کر رہ جائے گی۔ اگر صرف طبعی علوم پر تکیہ کیا جائے تو وہ تقسیم ہو کر رہ جائے گی۔ یوں زندگی کی اجمالی بصیرت محال ہو جائے گی۔'' [۴] سائنس اور الٰہیات کے بجائے فلسفہ اس معاملے میں بہتر ثابت ہو سکتا ہے جو ان اجزا کو یکجا کرتا ہے۔ لیکن فلسفہ خلا میں کام نہیں کرتا۔ اسے سائنس کی ترقی پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔ سائنس کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ نہ تو اپنے مسلمات اور بنیادی مفروضوں کا تجزیہ کرتی ہے اور نہ ہی کوئی سائنس مختلف سائنسی علوم کے حاصلات کو ہم آہنگ کر کے جہانی نظریہ مرتب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ یہ فرض فلسفہ سرانجام دیتا ہے۔ لیکن وہ محض طبعی علوم کے حاصلات ہی کی نہیں بلکہ انسان کے اخلاقی آدرشوں، مذہبی ضرورتوں اور خواہشوں، جمالیاتی امنگوں، انسانوں کی محبتوں، کامیابیوں، ناکامیوں اور المیوں کو بھی اپنے اجزائے ترکیبی میں شمار کرتا ہے۔ ''اگر ہم ان تمام حقائق کو اکٹھے لے کر ان پر غور کر سکیں تو یہ فلسفہ ہوگا۔'' [۵]

سائنس کے دائرہ کار کو محدود قرار دینے کا مقصد اصل میں یہ ہوتا ہے کہ ماورائے سائنس دُنیا کے لیے کوئی خفیہ دروازہ کھول دیا جائے۔ یہ نقطۂ نظر انسانی صلاحیتوں میں عدم اعتماد کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ عموماً اس کا جواز یوں پیش کیا جاتا ہے کہ سائنس کا تعلق محض طبعی مظاہر سے ہے۔ یہ مغالطہ آمیز تصور تجربی فلسفہ اور رویئے سے جنم لیتا ہے۔ اس کے برخلاف جدلیاتی نقطۂ نظر سائنس کی ہمہ گیری کا اثبات کرتے ہوئے انسان کو اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل بناتا ہے۔

اپنے طبقے کے دوسرے دانش وروں کی طرح خلیفہ عبدالحکیم کا المیہ یہ ہے کہ وہ نہ تو سائنس کی اہمیت سے منکر ہو سکتے ہیں اور نہ ہی سائنس پر مکمل انحصار کر سکتے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ ایک طرف تو ان کے طبقے کا وجود سائنس کے فروغ کا مرہونِ منت ہوتا ہے اور دوسری طرف سائنسی نقطۂ نظر کا ایک حد سے زیادہ فروغ اس طبقے کے خاتمے کا سبب بن جاتا ہے۔ لہٰذا وہ مجبور ہیں کہ وہ سائنس اور غیر سائنس کے مابین لٹکتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم اعلان کرتے ہیں کہ آج کا عہد سقراط، افلاطون یا ارسطو کی تلاش میں ہے جو انسانوں کو مظہری وجود سے ماورا ابدی حقیقتوں کا یقین دلا سکے۔ نیز یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ پاکستانی دانش وروں کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ وسیع تر انسان دوستی کے خطوط پر الٰہیات کی ازسرِنو

دانش وروں پر خلیفہ عبدالحکیم کا خاصا اثر رہا ہے۔ خاص طور پر اس اثر کو ان بحثوں کے حوالے سے محسوس کیا جا سکتا ہے جو ساتویں اور آٹھویں عشروں میں اسلامی اشتراکیت اور اس سے متعلقہ موضوعات پر ہوتی رہیں۔ پاکستان میں اسلامی اشتراکیت کے تصور کو اوّل اوّل خلیفہ عبدالحکیم ہی نے واضح اور مدلل انداز میں پیش کیا تھا۔ یہاں تک کہ یہ تصور پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور کی اساس بن گیا اور آٹھویں عشرے میں کسی نہ کسی حد تک اس نے سرکاری پالیسیوں کی تشکیل میں بھی کردار ادا کیا۔ اسلامی اشتراکیت کے ایک قابلِ ذکر مخالف نے اس فکری تصور وتحریک میں خلیفہ عبدالحکیم کے بنیادی کردار کا اعتراف کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ''اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر اس ملک میں جن لوگوں نے آواز اُٹھائی، ان میں سے بیشتر کے خیالات کو میں نے دیکھا ہے اور میں آپ کے سامنے خود اس کا اعتراف کروں گا کہ اس موضوع پر امکانی حد تک سب سے بہتر استدلال اگر کہیں ملتا ہے تو وہ خلیفہ عبدالحکیم کی کتاب میں ہے۔'' [11]

بعض دوسرے حوالوں سے بھی خلیفہ صاحب نے اپنے معاصرین کو متاثر کیا ہے۔ ان کا بنیادی مسئلہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہے، اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ نہ تو مغرب کی کورانہ تقلید سے ہو سکتی ہے اور نہ ہی ان فرسودہ اصولوں اور طریقوں سے چمٹے رہنے سے...... مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اسلام کے اساسی اصولوں پر غور کریں اور ان پر عمل پیرا ہوں اور اس احساسِ کمتری کو ختم کر دیں جس میں وہ مبتلا ہو گئے ہیں جو مغرب کی پیش کردہ ہر چیز کو اسلام کے مطابق ثابت کرنے پر انہیں مجبور کرتی ہے۔ مسلمان قوموں بلکہ مغرب کو بھی اسلام سے بہت کچھ سیکھنا ہے۔ اسلام میں حریت، اخوت اور مساوات کے تصورات نہایت ترقی پذیر اور حقیقی ہیں۔ اور ضرورت ہے کہ ان کو ٹھیک طرح سمجھا اور ان پر عمل کیا جائے۔ مغرب کا معاشرتی اور سیاسی نظام درہم برہم ہو رہا ہے۔ کیا ہم اپنے نظامِ حیات کی نئی عمارت ان شکستہ عمارتوں کے ملبے سے تعمیر کرنا چاہتے ہیں جو ناکارہ ہو جانے کی وجہ سے منہدم کی جا رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلم اور غیر مسلم دُنیا کی

تکمیل کریں۔[۶] الہیات کی خدمت کرنے کے باوجود الہیات مرتب کرنے کا مطالبہ
اظہار منطقی تضاد کا حامل دکھائی دیتا ہے۔ لیکن اگر اس منطقی تضاد کو انسانی حوالے سے دیکھا
جائے تو وہ بالائی متوسط طبقے کے نظریہ سازوں کی سب سے بڑی سچائی بن جاتا ہے۔
وسیع تر انسان دوستی کے خطوط پر مذہبی فکر کی تشکیل[۸]...... لیکن وہ مقصد ہے کہ
خلیفہ عبدالحکیم نے ہمیشہ پیش نظر رکھا۔ علامہ اقبال کے پیش نظر بھی [۳] سے زیادہ مختلف مقصد
نہ تھا۔ تاہم علامہ صاحب کی توجہ زیادہ تر مابعد الطبیعیاتی اور تجریدی مسائل پر مرکوز رہی تھی۔
خلیفہ صاحب نے زیادہ تر سماجی مسائل اٹھائے ہیں۔ ان کا سماجی شعور علامہ اقبال کے سماجی
شعور سے زیادہ حقیقت پسندانہ اور ٹھوس تھا اور انہوں نے اپنے خیالات شعر و نغمہ کے بجائے
سادہ اور عام فہم نثری پیرائے میں بیان کیے ہیں کیونکہ ”ایسی زبان میں فلسفہ طرازی بے فائدہ
ہے جسے پروفیسر لکھیں اور پروفیسر ہی سمجھیں۔“[۷]

جن مسائل کو خلیفہ عبدالحکیم نے اُٹھایا ہے، ان کا زیادہ تر تعلق سماجی تعمیر نو سے
ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ علامہ اقبال ایک ایسی فضا میں رہ رہے تھے جس میں مستقبل
غیر یقینی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں خلیفہ عبدالحکیم قیام پاکستان کے فوراً بعد کی فضا میں
لکھ رہے تھے۔ تب بہت سے مسائل تھے اور بہت سی اُمیدیں بھی تھیں۔ حوصلہ تھا اور جرأت
بھی۔ چنانچہ اُن کا کہنا یہ تھا کہ ”ماضی کی ابدی اقدار کے تحفظ کی کوشش کرو، لیکن ان کی مردہ
ہڈیوں تلے دب کر نہ رہ جاؤ۔“[۸]

ایک مغربی نقاد کا کہنا یہ ہے کہ ”عبدالحکیم نے وہ فلسفیانہ اساس فراہم کی جس پر
پاکستان میں جدیدیت کی تعمیر ممکن ہو سکتی تھی، اگرچہ اس معاملے میں ان کا بہت کم اثر ہوا
ہے۔“[۹] اس بے اثری کی وجہ بیان کرتے ہوئے یہی نقاد لکھتا ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم کا
اسلوب اس قدر فلسفیانہ تھا کہ وہ وسیع حلقے کو متوجہ نہیں کر سکتا تھا۔“[۱۰] یقیناً یہ رائے مبالغہ
آمیز ہے۔ خلیفہ صاحب کا اسلوب نہ صرف سیدھا سادھا بلکہ بسا اوقات پرکشش بھی ہے۔
اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں وہ ہلکے پھلکے انداز میں لکھتے ہیں۔ دُور از کار فلسفیانہ
اصطلاحوں سے بڑی حد تک گریز کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ چونکہ وہ فکری مسائل پر لکھتے
تھے، اس لیے یہ توقع کسی طور بھی نہ کی جا سکتی تھی کہ ان کی نگارشات عوامی مقبولیت حاصل کر
لیں گی۔ دوسری بات یہ ہے کہ فری لینڈ ایبٹ کی مندرجہ بالا رائے کے برخلاف پاکستانی

ہدایت اور نشاۃِ ثانیہ کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ ہم اسلام کے پیش کیے ہوئے زندگی کے عالمگیر اصولوں کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔"[۱۲]

ہیت اجتماعیہ انسانیہ کی نئی شکل کے سلسلے میں اکثر اوقات مندرجہ ذیل دو آرا پیش کی جاتی ہیں:

(۱) نئے سماج کی تعمیر محض قدیم اداروں اور روایات کے احیا سے ممکن ہے۔

(۲) سائنس اور حیاتِ و عالم کے سائنسی نقطۂ نظر کے فروغ سے مثالی معاشرہ تعمیر کیا جاسکتا ہے۔

اوّل الذکر رائے کی تجسیم ملائیت میں ہوتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اسے مکمل طور پر ردّ نہیں کرتے۔ لیکن پوری طرح قبول بھی نہیں کرتے۔ مذہب کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر ارتقائی ہے۔[۱۳] علامہ اقبال کی طرح وہ اجتہاد کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں۔ چنانچہ ان کے نزدیک مذہب کا تقاضا یہ ہے کہ اخلاقی اقدار کے تحت زندگی پر سے تمام بے جا اور ناروا بندشیں ختم کردی جائیں۔ انسانوں پر سے طوق و اغلال کو ہٹا کر ان کی ہمہ پہلو ترقی کے لیے راہ ہموار کی جائے۔ پاکستان کے ترقی پذیر بورژوا طبقے کے نظریہ ساز کی حیثیت سے وہ روشن خیالی کی اہمیت کا احساس رکھتے تھے اور اصرار کرتے تھے کہ ملائیت نے مذہب کی اس اساسی صفت کو ملیامیٹ کردیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ "ملا ظاہر پرست اور صورت پر فدا ہے۔ معانی اور روح تک اس کی کوتاہ نگاہوں کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ وہ حکمت سے بے بہرہ ہے۔"[۱۴] مسلمانوں کی موجودہ سیاسی، معاشی اور تہذیبی پس ماندگی کو ملائی ذہنیت کا نتیجہ قرار دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں کہ ترقی کی خاطر ہمیں "تنگ نظر ملاّ سے بھی اسی طرح بچنا ہے جس طرح کہ ایک ملحد بے دین سے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ کیونکہ بعض اوقات ملحد کی بے دینی کا اثر خود اس کی ذات تک محدود رہتا ہے، لیکن ملائی ذہنیت والے کا خراب اثر دُور دُور تک پھیلتا ہے۔"[۱۵] بلاشبہ یہ الفاظ ہمیں سرسیّد احمد خان کی یاد دلاتے ہیں۔

جہاں تک دوسری رائے کا تعلق ہے، خلیفہ عبدالحکیم اس ضمن میں سرمایہ داریت اور اشتراکیت کو موضوعِ بحث بناتے ہیں۔ اوّل الذکر کے بارے میں اُن کی رائے یہ ہے کہ

اس کے برعکس مادہ پرست جدلیات کارفرما ہے۔ ''زندگی کا مقصد ہر اس شے کو جو حقیقی ہے، تباہ کرنا نہیں بلکہ اس کی تکمیل کرنا ہے۔''[۱۸] چنانچہ اسلام ایک ایسا نظام زندگی فراہم کرتا ہے جس میں زندگی کا کوئی قابلِ ذکر پہلو نظر انداز نہیں کیا گیا اور جس میں ناگزیر مذہبی عقائد کے علاوہ سماجی، معاشی اور سیاسی وجود کی اساسیات کی تعلیم بھی دی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے[۱۹] کہ ''زندگی ایک مادی اساس بھی رکھتی ہے اور اس کی حیثیت کو اسلام نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ اس حقیقت سے باخبر ہے کہ انسان کو روحانی طور پر آزاد رکھنے کی خاطر اسے مادی خوش حالی کا یقین دلایا جائے۔''[۲۰] اشتراکیت اور اسلام میں ایک اور مابہ الامتیاز یہ ہے کہ اول الذکر نظریہ سماج پر فرد کو قربان کر دیتا ہے، جب کہ مؤخر الذکر اس کی انفرادیت کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے، بلکہ اس کی نشو و نما میں معاونت کرتا ہے۔

اس حوالے سے خلیفہ عبدالحکیم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ اسلامی سماج اشتراکیت سے زیادہ جمہوریت کے قریب ہے اور وہ سیاسی، سماجی اور معاشی جمہوریت کو فروغ دینا چاہتا ہے۔ آغازِ اسلام کا انقلاب ایک ہمہ گیر تغیر حیات کا متقاضی تھا اور ان تمام تغیرات کا رُخ جمہوریت کی طرف تھا۔ لیکن بہت جلد قدیم روایت پھر اُبھر آئیں۔ خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی۔ سرمایہ داری، جاگیرداری اور غلامی پھر سے عود کر آئی اور وہ اندازِ فکر و عمل نہ رہا جس نے بلال حبشیؓ کو سردارانِ قریش کا ہم رنگ بنا دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام کا جمہوری نظام ملیامیٹ ہو گیا اور مطلق العنان حکومت نے اس کی جگہ لے لی۔ یہ طرزِ حکومت جو ہر قسم کی سیاسی، معاشی اور اخلاقی تخریب کا سرچشمہ اور جملہ اقدارِ حیات کی تباہی کا باعث ہوتا ہے، نے بالآخر اسلامی سماج کو زوال کے سپرد کر دیا۔ پس یہ کہا جا سکتا ہے کہ ملل اسلامیہ کی تباہی کے دو اسباب ہیں:

(۱) وہ ملوکیت اور جاگیرداری جس کی بیخ کنی کے لیے اسلام آیا تھا۔

(۲) ملوکیت اور جاگیرداری کے پروردہ فقہا، ان کی تنگ نظری اور کم فہمی۔

یوں ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے فلسفی کے نزدیک ابتدائی صدیوں کی اسلام کی تخلیقی قوت جاگیرداری اور ملائیت کی نذر ہو گئی۔

خلیفہ عبدالحکیم نے اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی خاطر جو طریقِ کار تجویز کیا ہے، وہ یہ ہے کہ اہلِ اسلام جدید زندگی کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اپنے نصب العین میں وضاحت

اصول عدم مداخلت پر مبنی سرمایہ داری نے بھر و حریت اور مساوات کی تبلیغ کی۔ مگر مملکت تکارہ الیقاء میں غیر جانب دار رہ کر اس امر کا تدارک نہ کر سکی کہ ظالمانہ عدم مساوات سر نہ اٹھانے پائے۔ معاشرہ کو جاگیرداری اور شخصی حکومتوں کے ظلم اور زیادتیوں سے آزادی دلا کر اس نے ایک قسم کی زر خرید غلامی کو رائج کیا۔ آزادانہ معاہدہ اور آزاد رائے کا حق بے سود ثابت ہوا۔ سیاسی عمومیت غلامی کے ساتھ متحد ہو گئی۔ انگلستان اور امریکہ جیسے ملکوں میں سرمایہ دارانہ جماعت نے ان خرابیوں کو رفتہ رفتہ دور کرنے کی کوشش کی جو بے قید سرمایہ داری سے صورت پذیر ہوتی ہیں، لیکن جو مشکلات اور دشواریاں اس نظام کے مزاج سے پیدا ہوتی ہیں، وہ معاشرتی انتشار پیدا کرنے لگیں۔

سرمایہ داری کے اس تجزیے کے بعد خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ ان سماجی برائیوں کا حل اشتراکیت میں ڈھونڈا گیا۔ بنیاد پرست اشتراکی کے زاویۂ نگاہ سے حقیقتِ مطلقہ شعور یا ذہن کے بجائے مادہ ہے۔ مادیت پسندوں کا مادہ غایت اور مقصد سے محروم ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو اشتراکیوں کے مادے کو لامحالہ جملہ مقاصد اور نصب العینوں سے معرا اور اقدار کی تخلیق سے بے نیاز ہونا چاہیے۔ لیکن چونکہ ”اقدار کی حقیقت میں اعتقاد کے بغیر زندگی بے قدر ہونے کے علاوہ عمل کے لیے کوئی محرک فراہم نہیں کر سکے گی، لہٰذا مارکسیت نے مقاصد اور اقدار کو چور دروازے سے داخل کر لیا ہے۔ یہ مفروضہ گڑھ لیا ہے کہ مادہ جدلیاتی طور پر عمل پذیر ہوتا ہے۔ یہ ایک صورتِ حال کی تخلیق کرتا ہے اور پھر از خود اس کی نفی کرتا ہے، جس کی مزید نفی سے ایک اعلیٰ تر ترکیب وجود پذیر ہوتی ہے۔ کل وجود...... طبعی، ذہنی اور اخلاقی...... کی توجیہ مفروضہ طور پر اس عمل سے ہوتی ہے جو اصل میں ہیگل سے اخذ شدہ ایک ناقص تصور ہے جسے مادی صورت عطا کر دی گئی ہے۔ اس گمراہ کن استدلال کے ذریعے مادہ، جس کی ماہیت مادیت کے نقطۂ نظر سے غیر غایاتی ہونی چاہیے تھی، مقاصد حیات تخلیق کرنے اور انہیں ترقی دینے لگ جاتا ہے۔“ [۱۷]

خلیفہ عبدالحکیم کے نزدیک اشتراکی فلسفے کی بنیادیں اسی گمراہ کن مغالطے پر استوار ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جس فلسفے کی بنیادیں ہی ٹھوس نہ ہوں، وہ درست کیونکر ہو سکتا ہے۔ اشتراکیت کے برخلاف اسلام کا نقطۂ نظر ہے کہ زندگی ایک روحانی ماخذ، روحانی پس منظر اور روحانی آدرش کی حامل ہے۔ کائنات نہ تو اندھی، بہری اور میکانکی قوتوں کی غلام ہے اور نہ

پیدا کریں۔ اپنے عروج کے زمانے میں بھی انہوں نے دیگر ترقی یافتہ تہذیبوں کے ساتھ خذما صفا اور دع ما کدر کا عمل کیا تھا۔ اب بھی انہیں دوسروں کے تجربات سے فائدہ اٹھانا اور ترقی یافتہ اقوام کی تقلید کرنا ہوگی۔ یہ امر پیشِ نظر رہے کہ ترقی یافتہ اقوام سے خلیفہ صاحب کی مراد امریکہ اور مغربی یورپ کی قومیں ہیں۔ ان کا اصرار یہ ہے کہ جس طرح مسلمانوں کی عقلی ترقی نے یورپ کی تحریک احیائے علوم کی راہ ہموار کی تھی، اسی طرح اب انہیں مغرب کے گذشتہ دو صدیوں کے عقلی اور ثقافتی حاصلات کو قبول کر لینا چاہیے۔[۲۲]

کیوں؟ اس لیے کہ صدیوں سے مسلمان جمود کا شکار ہیں۔ ان کی ترقی رُکی ہوئی ہے۔ جب کہ بعض دوسری اقوام اس دوران میں تیزی سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ اور انہوں نے اسلام کو ایسا ''فرسودہ عقیدہ قرار دیا ہے جو تغیر پذیر حالات کی مطابقت اختیار کرنے کے نااہل ہو۔''[۲۳] اس تصور کی تردید اور حصولِ ترقی کی خاطر ضروری ہے کہ ''ہم اسلام کی سادہ اور حقیقی تعلیم کو روایات کے انبار سے الگ کریں اور ان چند صدیوں میں جب کہ ہم خفتہ اور بے کار رہے، دُنیا جو علوم وفنون پیدا کر چکی ہے اور اصلاحات کے جو نظام بر بنائے تجربہ قائم کر چکی ہے، ان کو اسلام کی روح کے مطابق انفرادی اور اجتماعی زندگی کا جزو بنایا جائے۔''[۲۴] اس راہ میں اسلام رکاوٹ نہیں کہ وہ تو ''فطرت کے غیر متبدل قوانین اور ان پر عمل کرنے کا نام ہے۔ یہ کسی قوم کا اجارہ نہیں۔ **الحکمة ضالة المومن**۔ جہاں بھی حکمت پیدا ہوئی، وہ مسلمان کا مال ہے۔ جہاں بھی عدل و اصلاح کا اقدام ہوا، وہ اسلام ہے۔''[۲۵]

خلیفہ صاحب نے اس معاملے کی طرف توجہ دلائی ہے کہ اسلام کے عہدِ زرّیں میں بھی یہ اصول مسلمانوں کی بنیادی تہذیبی قدر کی حیثیت رکھتا تھا۔ قرونِ وسطیٰ کے مسلمان اکابرین نے نوعِ انسانی کے جملہ معاصر اور متقدم علوم کی سرگرمانہ اور پرجوش تلاش و تدوین کی تھی اور ان کی اساس پر نئی نئی فکری موشگافیاں کی تھیں۔ تاہم اس زمانے میں بھی حقیقی اور امکانی رجعت پسند قوتیں موجود تھیں، جنہوں نے بالآخر ملوکیت و ملائیت کے روپ میں زندگی کی تخلیقی اور تعمیری قوتوں کو شکست دے کر مسلمانوں کے تہذیبی ارتقاء کا عمل ختم کر دیا تھا۔ مطلق العنایت نے سیاسی وسماجی اور ملائیت نے فکری، علمی اور ثقافتی قوتوں کی روح غضب کر لی۔ دیکھا جائے تو ملوکیت و ملائیت ہی وہ دو ادارے ہیں، جنہوں نے یورپ کے عہدِ تاریک

میں زندگی کو کچل رکھا تھا۔ ان کے خلاف بغاوت نے مغرب پر نشاۃ ثانیہ اور یوں نئی زندگی کے دروازے کھولے۔ چنانچہ خلیفہ عبدالحکیم کے نزدیک ملت اجتماعیہ انسانیہ کی نئی تشکیل کے باب میں ہمیں اپنی روایات اور نصب العینوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اہل یورپ کے تجربوں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے۔ مطلب یہ نہیں کہ زندگی کے ہر شعبے میں بغیر دیکھے بھالے ان کی تقلید کی جائے۔ نہیں۔ یہ کام تو قدیم و جدید کے تخلیقی امتزاج سے پایۂ انجام کو پہنچے گا۔ ''اسلام نے عروج و ترقی تقلید یا انتخابیت سے نہیں بلکہ تخلیقی اخذ و اختراع سے حاصل کی تھی۔ مسلمان اپنی اس سابقہ روش کو اختیار کر کے پھر سے ایک نئی زندگی حاصل کر سکتے ہیں۔'' [۲۶] یہ ہے خلیفہ صاحب کا پیغام۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اس طرح خلیفہ عبدالحکیم بورژوا جمہوری انقلاب اور بورژوا سماجی فکر کی راہ استوار کرتے ہیں۔ بلاشبہ پاکستان میں بنیاد پرستوں کے مقابلے میں انہوں نے ترقی پسند رجحانات کے فروغ کی خاطر فکری و ذہنی بنیادیں استوار کرنے کی کوشش کی۔ تاہم انہیں یہ احساس بھی تھا کہ بورژوا جمہوری نظام پاکستان کے مسائل حل نہیں کر سکتا۔ اسی احساس کے حوالے سے انہوں نے اسلامی سوشلزم کا تصور پیش کیا، جو اصل میں روشن خیال بورژوازی کا نقطۂ نظر ہے۔ اس کا مقصد سماجی انقلاب کے بجائے سماجی اصلاح ہے۔

اس باب میں خلیفہ صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اسلامی نشاۃِ ثانیہ کی خاطر شاہیت، جس نے عہدِ جدید میں سرمایہ داری کی صورت اختیار کر رکھی ہے، اور ملائیت سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے، ہمیں ایک ایسے سماجی نظام کی ضرورت ہے جو حریت، اخوت، مساوات اور جمہوریت کے اصولوں پر قائم ہو اور سماجی و معاشی ناہمواریوں کی بیخ کنی کر کے انسان دوست سماج کی تشکیل کرے۔ اکثر مذاہب کے برعکس اسلام کا زاویۂ نظر انفرادی نہیں، اجتماعی ہے اور وہ محض ذہنی و روحانی تبدیلی ہی نہیں بلکہ اپنے ماننے والوں کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں بھی انقلاب لانا چاہتا ہے۔ وہ سماج کو ہر قسم کے استحصال سے پاک کر کے ایک اجتماع پسند معاشرہ، یا جیسا کہ عام طور پر کہا جاتا ہے، اشتراکی سماج تعمیر کرنا چاہتا ہے۔ اگرچہ اس کا نقطۂ نظر لادینی اشتراکیت سے بہت مختلف ہے۔

سماجی تشکیلِ نو میں بنیادی مسئلہ فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق کا تعین ہے۔ اس لیے ہر قسم کے سماجی فلسفے کی صورت گری فرد اور اجتماع کے باہمی ربط کے کسی نہ کسی تصور پر ہوتی

پر مزید بحث کی ضرورت نہیں۔ بہر طور اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ ہمارا فلسفی فرد پرستی کی طرف مائل ہے اور یہ رجحان کم و بیش تمام پاکستانی فلاسفہ کے ہاں ملتا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم انفرادی آزادی پر اصرار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ آزادی ہر قسم کی سماجی، اخلاقی اور جمالیاتی اقدار کا منبع ہے۔ خیر، وہ اس معاملے میں انتہا پسند نہیں۔ وہ مانتے ہیں کہ انسانی تہذیب کا ذوالجہتین یہ ہے کہ اسے اپنے استحکام اور ارتقاء کی خاطر بیک وقت پائیداری اور تغیر کی حاجت ہوتی ہے۔ ''تاریخ کا پنڈولم نظم و تغیر کے درمیان...... یعنی اجتماعی نظم اور انفرادی آزادی کے مابین حرکت کرتا ہے۔'' [۲۹] ان دونوں میں سے کسی ایک کو نظرانداز کرنے کا مطلب دونوں کی تباہی ہے۔ سماج کو یہ حق نہیں دیا جا سکتا کہ وہ ہر قسم کی انفرادی آزادی اور انفرادی پیش رفت کو کچل دے۔ جملہ انسانی آزادی کی جڑیں آزادی میں پیوست ہیں۔ لہٰذا اس کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ البتہ مہذب سماج کے استحکام کی خاطر انفرادی آزادی پر کسی قدر پابندیاں بھی ناگزیر ہیں۔ آزادی پر بے جا اصرار سے ایک ہم آہنگ کل میں سماج کا ارتباط ممکن نہیں رہتا۔ اسی طرح اگر یکسانی اور نظم و ضبط کی لگن معقول حد سے بڑھ جائے تو اس سے جبر و استبداد کو فروغ ملتا ہے اور ظلم و تشدد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ پس ایک مثالی معاشرے کی ناگزیر خوبی یہ ہے کہ اس میں افراد کو روحانی اور مادی ترقی کے حقوق اور مواقع حاصل ہوں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہو کہ افراد کو ایک مربوط کل میں سمونے کی خاطر اجتماعیہ بھی بے بس نہ ہو۔

یہ خصوصیت ایک حقیقی منظم سماج میں ہو سکتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم اس امر سے انکار کرتے ہیں کیونکہ اس قسم کے سماج میں ذرائع پیداوار کی نجی ملکیت کی گنجائش نہیں ہوتی۔ خلیفہ صاحب دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ خوبی صرف اسلامی معاشرے میں پائی جاتی ہے جو فرد کو آزادی اور انفرادی ملکیت کا حق دینے کے ساتھ ساتھ ایسے ذرائع بھی اختیار کرتا ہے کہ انفرادی آزادی اور سماجی نظم میں توازن برقرار رہے۔ اس اسلامی نظام کو وہ ''سب سے زیادہ سائنسی اشتراکی نظام'' قرار دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس قسم کا نظام سرمایہ دارانہ فرد پرستی اور اشتراکی نظم پسندی دونوں کے خلاف اور ان کے درمیان کی راہ پر مشتمل ہے۔

ہے۔ اس سلسلے میں ایک مقبولِ عام نظریہ وہ ہے جسے صدیوں پہلے روم کے مشہور شاعر پلاٹس نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا کہ ''انسان، انسان کے لیے بھیڑیا ہے۔'' آج بھی بہت سے دانش ور اسی نقطۂ نظر کے حامل ہیں۔ مثلاً فرائیڈ کے نزدیک سماجی ادارے اپنی ماہیت کے اعتبار سے فرد کے جبلی رجحانات کو کچلنے کی طرف مائل ہیں۔ سارتر کے خیال میں دوسرے انسان جہنم ہیں۔ لہٰذا فرد اور معاشرے میں ایک دائمی کشمکش جاری ہے۔ گویا فرد اور سماج میں ہم آہنگی محال ہے۔ پس یا تو فرد کو اس قدر اختیارات دے دیئے جائیں کہ وہ سماجی اداروں کے دباؤ کا مقابلہ کر سکے اور ان پر حاوی ہو سکے یا پھر سماج کو اس قدر مضبوط بنا دیا جائے کہ فرد اپنی انفرادیت سے دست بردار ہونے پر مجبور ہو جائے اور یوں سماج کی بالادستی کو قبول کر لے۔ جن فلسفیوں نے پہلے نقطۂ نظر کی تائید کی، ان میں اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں کے رومان پرست اور انفرادیت پسند شامل تھے۔ دوسرے گروہ میں ہیگل اور اس کے پیروکار شامل ہیں۔ مارکس اور اس کے مقلدین کا کہنا یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام نے انسان کو انسان کے لیے بھیڑیا بنا دیا ہے۔ اس نظام کو ختم کر کے انسان دوستی کی اساس پر ایک نیا معاشرہ بنایا جائے تو یہ ناگوار صورتِ حال ختم ہو سکتی ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم مارکس کے اس تصور کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیتے ہیں اور یوں وہ مارکس کو دوسرے گروہ میں زبردستی دھکیل دیتے ہیں۔ یہ کھینچا تانی اس لیے ضروری تھی کہ خلیفہ صاحب درمیانی راہ کا اپنا تصور پیش کرنا چاہتے تھے۔ اس درمیانی راہ کے بارے میں ان کا کہنا یہ ہے کہ فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق کا حل ان دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے۔

اب معاملہ یہ ہے کہ خلیفہ عبدالحکیم درمیانی راہ کی وکالت تو کرتے ہیں، لیکن اس پر قائم نہیں رہتے۔ جلد ہی وہ فرد پرستی کی طرف جھکنے لگتے ہیں۔ چنانچہ وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ انسانی ارتقا اور تاریخ کا رُخ متعین کرنے کی قوت محض ''بڑے انسان'' ہیں۔ جملہ عظیم الشان انقلابات انفرادی جدوجہد اور عظیم انسانوں کے مرہونِ منت ہیں۔[۲۷] یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو سماج کے ساتھ ہم آہنگی اختیار نہیں کر سکتے اور یوں اس کے دباؤ اور اثرات سے آزاد رہتے ہوئے ایسی اقدار تخلیق کرتے ہیں جو نسلِ انسانی کے ارتقاء میں محرک ثابت ہوتی ہیں۔ پس انسانی ارتقاء ان افراد کا مرہونِ منت ہے جنہیں عام طور پر ''عجیب الخلقت'' خیال کیا جاتا ہے۔ تاریخ کے بارے میں اس نقطۂ نظر پر ہم پہلے ہی رائے دے چکے ہیں۔[۲۸] لہٰذا اس

حوالہ جات:

[۱] Freeland Abbott, Islam and Pakistan, p.206.

[۲] Bertrand Russel, History of Western Philosophy, Preface.

[۳] خلیفہ عبدالحکیم، خطبہ صدارت، پاکستان فلسفہ کانگریس، روداد ۵۴ء، ص ۱۰۔

[۴] ایضاً، ص ۱۱۔

[۵] ایضاً، ص ۱۲۔

[۶] ایضاً، ص ۱۸۔

[۷] ایضاً، ص ۱۸۔

[۸] ایضاً، ص ۲۸۔

[۹] Freeland Abbott, Islam and Pakistan, p.210.

[۱۰] ایضاً۔

[۱۱] نعیم صدیقی، اسلام سوشلزم کیوں نہیں؟ ص ۱۴۔

[۱۲] خلیفہ عبدالحکیم، مقالاتِ حکیم، ج ۱، ص ۱۰۔

[۱۳] K.A. Hakim, Islamic Ideology, pp.9-10.

[۱۴] خلیفہ عبدالحکیم، مقالاتِ حکیم، ج ۳، ص ۱۹۱۔

[۱۵] ایضاً، ص ۱۹۱-۱۹۲۔

[۱۶] خلیفہ عبدالحکیم، اسلام کا نظریۂ حیات، ص ۳۸۵-۳۸۶۔

[۱۷] K.A. Hakim, Islam and Communism, p.253-254.

[۱۸] K.A. Hakim, Islamic Ideology, p.109.

[۱۹] ایضاً، ص ۲۱۳۔

[۲۰] خلیفہ عبدالحکیم، مقالاتِ حکیم، ج ۱، ص ۱۴۱۔

[۲۱] ایضاً، ص ۱۸۵۔

[۲۲] خلیفہ عبدالحکیم، خطبہ صدارت، پاکستان فلسفہ کانگریس، روداد برائے ۱۹۵۸ء، ص ۲۳۔

[۲۳] Government of Pakistan, Marriage Commission Report,

p.1200.

[۲۴] خلیفہ عبدالحکیم، مقالاتِ حکیم، ج ۱، ص ۱۸۔

[۲۵] ایضاً۔

[۲۶] خلیفہ عبدالحکیم، اسلام کا نظریۂ حیات، ص ۲۳۵۔

[۲۷] K.A. Hakim, Islam and Communism, p.191.

[۲۸] دیکھیے باب: فلسفہ، تاریخ اور پاکستانی فلاسفہ۔

[۲۹] K.A. Hakim, Islam and Communism, p.193.

[۳۰] سید ابوالاعلیٰ مودودی، اسلام، سرمایہ داری اور اشتراکیت، ص ۸۔

35

مذہب کا پیرایۂ بیان اور خلیفہ عبدالحکیم کا نظریہ

زاہد حسین

ماہیات وجود کے متعلق انسانی زبان فقط تمثیلی ہوسکتی ہے،[ا] اس لیے مذہبی تجربات کا ابلاغ تشبیہ، اشارات و علامت کی صورت میں ہوتا ہے۔ نہ صرف اولیاء اور گیانیوں کے اقوال میں یہ بات ہوتی ہے بلکہ الہامی صحیفوں میں بھی یہی اسلوب پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قرآن شریف تمثیلات و اشارات بکثرت استعمال کرتا ہے۔ اس میں نہ صرف صفات الٰہی بلکہ یوم الفصل اور جزا و سزا کا نقشہ جن شگفتہ تشبیہات و استعاروں میں کھینچا گیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ اس طرز ادا سے بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں مگر ان میں سے بنیادی دو ہیں: ایک تو یہ کہ ان کے پیرایہ بیان کا اصل محل کیا ہے؟ دوسرا یہ کہ حقیقت کو اس سے کیا نسبت ہے؟ یہ صرف علمی سوالات ہی نہیں ہیں بلکہ اگر تاریخ مذاہب پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ثقافت و تمدن، روحانی تجربات اور نفسی روابط غرض

زندگی کے اساسی اجزاء کے باہم تعین پر یہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ بت پرستی سے لے کر سماجی بندھنوں، انفرادیت پسندی، روحانی آزادی اور خدا پرستی تک جملہ رجحانات جنہوں نے مختلف تمدنوں اور ثقافتوں کی تقدیر سازی کی ہے کسی نہ کسی طرح آخر کار ان نقاط نظر پر ہی مشتمل ہوتے ہیں جو ان سوالوں کے جوابات کی تہہ میں کارفرما ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں خلیفہ عبدالحکیم نے ''مذہب اور اشاریت'' کے مسئلہ کا بہت خوبی سے جائزہ لے کر اسلامی نقطہ نظر کو متعین کیا ہے اور اس خصوص میں نظریہ علم کے ان پہلوؤں کی بھی نشاندہی کی ہے جو دور جدید میں چنداں اجاگر نہ ہو سکے۔ جو کلام تشبیہوں اور استعاروں سے عبارت ہوتا ہے اس کے الفاظ و بیان کا تخاطب نہ ہو، بالکلیہ ظاہری حواس سے ہوتا ہے اور نہ ہی عقل مجرد سے۔ اس کا رخ اس مخصوص شعور کی طرف ہوتا ہے جو تخیل کی جان ہے۔ اگر فلسفہ و مذہب میں امتیاز قائم کرنا ہو تو صرف اسی امر سے دونوں کا فرق قائم ہو جاتا ہے کہ فلسفہ کا محل تصورات مجردہ کی دنیا اور مذہب کا مرجع تمثیلات و استعارات سے آباد عالم تخیل ہے۔ علم کے قدیم نظریے میں جس کا اثر آج تک باقی ہے شعور کے مقامات کی درجہ بندی میں سب سے ادنیٰ مقام حواس کو دیا گیا ہے، اس سے اونچا واہمہ یا تخیل کو اور سب سے بلند تعقل کو۔ یہ درجہ بندی ارسطو کے عہد سے سند کا درجہ رکھتی ہے۔ عہد یونان سے اب تک بہت سے نئے نئے انکشافات ہوئے، علم انسانی نے تیزی سے ترقی کی، نظریات کے نظریات بدل گئے مگر اس درجہ بندی میں کوئی فرق نہیں آیا۔ صرف چند ایسے لوگ ضرور ہوئے ہیں جنہوں نے اس کو مسترد کرنے کی کوشش کی ہے۔ بہر حال یہ تو صرف ایسی انفرادی کوششیں تھیں جو ہمہ گیر نہ بن سکیں اور علم میں بالاتر مقام مسلمہ طور پر ''علم معقول'' ہی کا سمجھا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ مذہب کو تخیل سے منسوب کر کے ہمیشہ فلسفہ سے اس کا رتبہ کم کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہیگل کے نقطہ نظر کی وضاحت کرتے ہوئے خلیفہ صاحب لکھتے ہیں کہ ''ہیگل فلسفہ کا مقام مذہب سے کہیں اعلیٰ و ارفع متعین کرتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ فلسفہ ایسے تعقلات پر مشتمل ہوتا ہے جن میں صداقت کی سب سے زیادہ واضح اور روشن پیشکش ہوتی ہے جب کہ مذہب اسی صداقت کو رمز و اشارہ کے پیرایے میں آشکار کرتا ہے۔'' [۲]

ہیگل عقلیت پسند تھا۔ اس کے اس بیان سے وہ اصول بھی واضح ہو جاتا ہے جو عقلیت پسندوں کے نزدیک مذہب و فلسفہ میں اتصال کی بنیاد بن سکتا ہے۔ مذہب بھی

صداقت کا داعی ہے اور فلسفہ بھی مگر مذہب صداقت کو استعاروں میں بیان کرتا ہے کیونکہ وہ عوام کے لیے ہے۔ اس کے برخلاف فلسفہ اس صداقت کو ان تصورات و تعقلات میں بیان کرتا ہے جو اہل عقل کے لائق ہیں۔ یہ تعقلات حقیقت کا نہایت ہی اصلی قائم مقام بلکہ عین ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ بات واضح کی جائے تو مناسب ہوگا کہ ہیگل کا یہ نظریہ نیا نہیں ہے۔ اس سے بہت قبل مذہب و فلسفہ میں موافقت پیدا کرنے کی کوشش میں ابن رشد نے اس کو موجودہ شکل بخشی تھی اور اپنا مشہور نظریہ ''صداقت کا دو اعتباری تصور'' پیش کیا تھا۔ اس تصور کے مطابق حقیقت تو ایک ہی ہے مگر یہ دو قسم کی صداقتوں میں ظاہر ہوتی ہے: ایک صداقت عوام کے لیے اور دوسری خواص کے لیے۔ یہ خواص ہی وہ ہستیاں یعنی اہل حق و دانش ہیں جو حقیقت کو اعلیٰ ترین صداقت یعنی تصورت مجردہ کلیات و اعیان کے وسیلے سے جانتے ہیں۔ ابن رشد کی عقلیت پرستی موسیٰ میمون اور سپینوزا سے ہوتی ہوئی ہیگل تک پہنچی اور اس نے ابن رشد کی طرح مذہب کو عوام کا خاصہ قرار دے دیا جو ہمیشہ واہمات پرستی میں مبتلا رہتے ہیں۔ خواص اور اہل عقل ان سے ارفع و اعلیٰ ہوتے ہیں کیونکہ ان کا اوڑھنا بچھونا مجرد کلیات کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ امر ''فی الحقیقت ایک ایسی عقلی عصبیت کی پیداوار ہے جو احساسات و جذبات کو کوئی مقام دینے کے لیے آمادہ نہیں۔'' [۳] ان کے اس قول میں جو بصیرت افروز نکتہ ہے وہ عقل کے معروض کی ماہیت کے بارے میں ہے۔ چنانچہ کسی تصور مجردہ کی ماہیت پر غور کیا جائے تو اس کے تار و پود میں صرف اور صرف ''آگہی'' یا صرف ''وقوف'' ہی کا وجود ہوگا۔ یہ تعقل محض ''وقوف'' و ''شعور'' یا علم و معلوم پر بھی مشتمل ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کا قوام بے رنگ ہوتا ہے، اس کے اندر نہ زندگی ہوتی ہے نہ روح نہ کیفیت۔ حقیقت اور تصور میں وہی تعلق قائم ہوتا ہے جو ایک زندہ ہستی اور پتھر کی مورتی میں ہے۔ بلکہ یہ تعلق بھی بہت زیادہ ہے، وہاں تو اس سے بھی کہیں کم تعلق ہے۔ تعقل اور (اس کی پیداوار) تصور مجردہ میں تو حسی ارتسام کا شائبہ بھی نہیں ہوتا پس زندگی سے اس کا جو تعلق ہے سو ظاہر ہے۔ عقلیت پرستی اسی کمزور تعلق کو حقیقت کی نہایت کامیاب پیشکش قرار دیتی ہے۔ یہ تعصب نہیں تو اور کیا ہے؟

تشبیہوں، استعاروں اور تخیلات کی دیگر تخلیقات میں کم از کم یہ بات تو ہوتی ہے کہ وہ جذب و تاثر میں ڈوبے ہوئے ہیں، التہاب و سوز حیات کی سیمابی سے عبارت ہوتے

ہیں، جوش وجود سے وہ مرتعش رہتے ہیں اور سننے والے میں جان ڈال دیتے ہیں۔ مگر عقلیت پسند جس جادہ کو اختیار کئے ہوئے ہیں وہ عجیب و غریب ہے۔ ان کے نزدیک جذبات، احساسات عقلی حرکیات میں خلل کا باعث ہوتے ہیں اس لیے ان کو بہر طور دبانا چاہئے تا کہ نور عقل زیادہ آب و تاب کے ساتھ چمک سکے۔ غلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ ''افلاطون سے بڑھ کر کون عقل کا پجاری ہوگا کہ اس کے نزدیک عالم تصورات ہی اصل حقیقت ہے۔ مگر اس کا تخیل بھی کچھ کم خلاق نہیں ہے، وہ بے تکلف تلمیحات، استعارات و تمثیلات کے موتی رولتا ہے اور فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتا ہے۔'' [۴]

کیا وہ ان اسطوریات کو صحیح مانتا تھا یا اس کے ہاں یہ محض صداقت کے ابلاغ کا ایک ادبی ذریعہ تھے؟ اس نے یہ تو کہا کہ ہومر کے بدکردار دیوتاؤں کو نکال دیا جائے اور خوش احوال دیوتاؤں کو باقی رکھا جائے۔ کیا وہ دیوتاؤں کے وجود پر یقین بھی رکھتا تھا؟ اس سوال کا جواب دیئے بغیر ایک بات تو کم از کم سامنے آتی ہے، وہ یہ کہ نری جدلیت اور منطقی ضابطہ بندی حسی اشاریت و تخیل کی مدد لیے بغیر ذہن انسانی میں رسائی پیدا نہیں کر سکتی۔ افلاطون اپنے مکالمات میں شاعرانہ علامات کے بغیر ایک قدم آگے نہیں بڑھتا حالانکہ اس کا منشاء اپنے قاری کو عالم تصورات سے ہمکنار کرنا ہے جہاں ہر حسی اشارہ بے معنی ہو جاتا ہے۔ [۵]

غالب نے خوب کہا ہے:

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ ولے گفتگو میں کام
بنتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

غالب نے یہاں پر اس نظریہ کو نظم کیا ہے کہ تعقل کا ذریعہ ابلاغ تخیل ہوتا ہے یعنی ہماری آگہی اپنے اثبات و انتقال میں تخیلات کے سانچوں کی محتاج ہے۔ اگر اس نظریے کو من و عن مان لیا جائے تو تمام تمثیلات فرضی، تمام بیانات محض استعارہ ہی ٹھہرتے ہیں جو اپنا وظیفہ انجام دینے کے بعد بے مصرف ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اہل دانش و بینش ان کے چکر میں نہیں پڑتے۔

یہ نظریہ کہ استعارے اور تشبیہیں محض ابلاغ ہیں بلا شک و شبہ درست ہوتا اگر تمام

حقیقت بے رنگ، بے بود، بے مزہ ہے، اس کے اندر ہو کا عالم ہے، وہ محض مجرد ہے، اس میں کوئی تشخیص نہیں، کوئی التہاب نہیں، کوئی جیشان نہیں، نہ کوئی سیماب صفت ہے نہ برق آسا، محض ہوا ہوا ہے۔ لیکن اگر حقیقت کہیں بالاتر ہے، زندہ ہے، فعال و متحرک ہے اور جیتی جاگتی ہے تو پھر ان تصورات مجردہ کا کیا مقام رہ جاتا ہے جن میں ہر رنگ و بو سے تزیہ و تصفیہ ہے؟ خود انسان اپنے وجود پر غور کرے تو اس پر یہ روشن ہو جاتا کہ کوئی تصور مجردہ یا تعقل بے کیف اس کے دامن کے تار کی بھی برابری کا مدعی نہیں ہو سکتا۔ جدلیت یا عقلیت جو مجردات کی دلدادہ ہے وہ کیوں کر اس کی مصور یا نقاش ثابت ہو سکتی ہے؟ کس طرح اس کو اپنے آئینہ میں اتار سکتی ہے؟

حقیقت کا یہ وجود جس میں ثروت کوائف ہے ایسا ہے جو عقل سے ماوریٰ جانا چاہتا ہے۔ شعور کے اندر عقل کے علاوہ کسی اور قوت یا ملکہ کا طلبگار ہے۔ ذہن کے تمام وظائف میں ''تخیل'' ہی ایسا وظیفہ نظر آتا ہے جو زندگی سے قریب تر ہے اور حقیقت مقرون کا دروازہ معلوم ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ تخیل روح کی آنکھ ہے۔[٦] چنانچہ تمام اعلیٰ ادراکات و تجربات، رُوحانی اقدار و اخلاقی احساسات کا سرچشمہ تخیل میں قائم ہے۔ تخیل صرف آلہ عقل ہی نہیں ہے، اس سے صرف ابلاغ کے ذرائع اور وسائل ہی مہیا نہیں ہوتے بلکہ یہ بذات خود ذریعہ علم ہے، دیدہ ور ہے، عارف معنی ہے، اس کا موضوع وجود مقرون ہے، دائم و قائم ہستی ہے، زندہ و سرزندہ موجودات ہیں۔ اگر عقل کی رسائی مجردات تک ہے تو تخیل کی رسائی حقائق تک ہے تخیل جذبات، احساسات کا پیراک ہے اسی لیے جب یہ ابھر کر ابلاغ پر آتا ہے تو اپنا مخصوص پیرایہ بیان بھی رکھتا ہے جو کنایوں اور اشاروں میں جاری و ساری ہوتا ہے جس کے وفور اظہار سے تشبیہات و استعارات پھولوں کی طرح بہار دیتے ہیں۔ یہ نرا بیان ہی نہیں ہوتا حقیقت بھی ہوتی ہے۔ شاعری اور مذہب کو اسی لیے تخیل سے ایک گونا مناسبت ہوتی ہے جس کی وجہ سے شاعری و مذہب فلسفہ سے مختلف ہو جاتے ہیں۔

خلیفہ صاحب اقبال کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''اقبال جو شاعر بھی ہیں اور فلسفی بھی اس موقف میں ہیں کہ شاعری اور فلسفہ کا تقابل کر سکیں۔ وہ کہتے ہیں کہ صداقت جس کے درس میں احساس شریک حال نہیں اور جس کے اظہار میں جذب کا فقدان ہو فلسفہ بن جاتی ہے لیکن یہی صداقت جذبے کی لمس سے شاعری بن جاتی ہے۔''[٧] خلیفہ صاحب

ابلاغ میں نشر ہوتے ہیں تو نہ صرف اشاریت، علامیت اور استعاریت میں ملبوس ہو جاتے ہیں بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے اختیار زیر و بم، اوزان اور قوافی میں ڈھلتے چلے جاتے ہیں اور ایسا کلام جاری ہو جاتا ہے جو اپنی تاثیر میں رس گھولنے والا، جادو سے زیادہ جادو جگانے والا ہوتا ہے۔ مگر آخر کار شاعر اور رسول میں ایک فرق ہوتا ہے اور اس فرق کو قرآن کریم نے یوں واضح کیا ہے کہ شاعر بلا قصد یعنی اضطراری طور پر تمام وادیوں میں آوارہ گرد ہوتا ہے اور جو من میں آئے موج کلام کے سپرد کرتا ہے۔ نیز اس کے اعمال اقوال کا ساتھ نہیں دیتے جبکہ ایک پیغمبر کے قول و فعل میں موافقت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ جو لوگ نرے شاعروں کی پیروی کرتے ہیں وہ گمراہ ہوتے ہیں۔ یہ فرق بہت غیر معمولی ہے۔ ایک میں اضطرار ہوتا ہے دوسرے میں استقامت ہے۔ چنانچہ ایک صرف صاحب کلام ہوتا ہے دوسرا صاحب رشد و ہدایت۔ مگر وادیوں کی جادہ پیمائی بہر حال ایک ایسا امر ہے جو شاعروں اور ان کے تخیلات کو زندگی سے قریب رکھتا ہے۔ شاعروں کے کلام میں اس لیے کبھی کبھی الہامی کلام سے مشابہت آ جاتی ہے۔ بحیثیت مجموعی شاعر مگر ہوتا ہے شاعر ہی۔ پیغمبر کا منصب حیات کی اصلی قدروں کی عقدہ کسائی ہے، اعلیٰ سطح کے معارف کا ابلاغ ہے۔ ہر قسم کی وادیوں میں گھومنے والوں کا یہ منصب نہیں۔ اسی لیے شاعر ہادی نہیں ہوا کرتے، ہاں مگر وہ شاعر جو ربانی سرچشموں سے سیراب ہوں تو بیشک ان کے کلام میں لوگوں کو کام کی باتیں مل جاتی ہیں اور یہ درجہ کسی شاعر کو صرف اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب کہ اس کا تخیل پیغمبرانہ تخیل کی اتباع میں ہو تب ہی وہ اصل زندگی کا صحیح ناظر ہو سکتا ہے، نرا وادیوں میں بھٹکنے والا نہیں ہوتا۔

سوال یہ ہے کہ ہر وہ کلام خواہ شاعری ہو یا الہام ربانی کیوں استعاروں اور تشبیہوں کا پیرایہ اختیار کرتا ہے؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ یہ تمام تشبیہیں اور استعارے اور تمثیلیں ہی زندگی کا کنایہ و اشارہ ہیں۔ مجردات اشارت کا حق ادا نہیں کر سکتے اس لیے کہ وہ زندگی اور مقرون وجود، بلکہ کن فیکون کے سیلان سے دور ہوتے ہیں نتیجتاً اتنے مفلس ہوتے ہیں کہ حیات کا بار ابلاغ نہیں اٹھا سکتے۔

اس ضمن میں ہمارا نقطہ آغاز ہستی باری کو قرار دیا جائے تو بات ذرا زیادہ کھل کر سامنے آئے گی کہ مجردات اپنی تہی دامنی کی وجہ سے ہمیں کن مشکلوں میں پھنسا دیتے ہیں جبکہ تخیل کی کارفرمائی سے ہم اس ہستی کے کسی نہ کسی مناسب احساس سے ضرور فیضاب ہو سکتے

مزید لکھتے ہیں کہ ابن سینا کا مدعائے فکر اور رومی کا منشائے جستجو اس حقیقت کی یافت ہے جو حسن زیر نقاب ہے۔ ناقہ حسن کی سرعت رفتار سے اٹھنے والی دھول فلسفی کی آنکھ کو کور بنا دیتی ہے۔ مگر شاعر اپنی جذبی قوت سے آگے نکل جاتا ہے اور نقاب اٹھنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ منطقی قیاسات کا جال ان اسرار کو اپنی گرفت میں نہیں لاسکتا جس کے اندر عشق کا بے پناہ ہیجان اپنے خلاق تخیل سے غواصی کر کے زندگی کا راز پا سکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں عقل کی نسبت عشق کو عقدہ کشائی کا زیادہ موقع رہتا ہے۔[۸] خلیفہ صاحب اپنے اس بیان میں یہ نکتہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ خلاق تخیل کا محل خود نیرو حیات ہے۔ اس کے اتار چڑھاؤ میں خود زندگی کا زیر و بم ہے جبکہ عقل محض آئینہ ہے۔ دور سے ایک بے جان سی صورت اس میں منعکس ہو جاتی ہے اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ کاشف زندگی ہونے کا اعزاز عقل کی نسبت "تخیل" کو حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ تخیل ہی وہ قوت مدرکہ ہے جس پر "تجلیات" کی بارش ہو سکتی ہے اور جس کے دائرہ پرواز میں بڑے بڑے معارف آجاتے ہیں۔

خلیفہ عبدالحکیم بیان کرتے ہیں کہ سب تخیل ایک ہی نوعیت کا نہیں ہوتا۔ دراصل اس کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک تو وہ تخیل ہے جو خواب میں تکمیل آرزو کی بازگشت کی طرح دن میں شیخ چلی کے نئے ہوائی محل بناتا ہے۔ دوسرا تخیل وہ ہے جو بقول آئن سٹائن تمام سائنسی ایجادات و انکشافات کی روح ہے۔ وہ تخیل کی سائنسی پرواز ہی تھی جس نے سیب کے درخت سے نیچے آرہنے پر نیوٹن کے سامنے کائناتی کشش کو عریاں کر دیا تھا۔ ایک تخیل وہ ہے جو شاعری میں ظاہر ہوتا ہے۔ اعلیٰ ترین تخیل وہ ہے جو شعور مذہبی سے مالا مال ہوتا ہے۔

مجردات کے پرستاروں نے مذہب کو انسانی تخیل کی ایسی پیداوار قرار دیا ہے جو واہمات کا جال ہے اور جسے متخیلہ خواہشات کے انصراف میں آکر پھیلاتا ہے۔ شاعری کا بھی اہل عقل اسی انداز میں تجزیہ کرتے ہیں کہ یہ اس کے حاصلات جذبات کی برول اندازی کا ثمر ہیں۔ چنانچہ وہ بحیثیت مجموعی شاعری، اسطوریات اور مذہب کو ایک ہی زمرہ میں شمار کرتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اس مسئلہ سے بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ مذہب کا اسلوب بیان اور شاعری کی زبان میں قربت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اپنے بہت ہی عمیق وجدانی و علوی کلام میں شاعروں کے ہاں بعض اوقات انبیاء کی سی مشابہت آ جاتی ہے اور بعض مرتبہ انبیاء بھی شاعر معلوم ہونے لگتے ہیں۔ وجہ یہ کہ حقائق جب جذباتی

ناکامی اس عقلیت پسندی کا لازمی نتیجہ ہے جو تمام ہندی مکاتیب فکر کی روح ہے اور جو سلبی الٰہیات سے بلند نہیں ہو سکتی۔

مگر ایمان محض سلبیت نہیں ہو سکتا۔ خلیفہ صاحب اس کی تشریح عرفی کے ایک شعر کے حوالہ سے کرتے ہیں۔ ''عرفی نے جو غالب کی طرح حکیم اور شاعر ہے ذات الٰہی کے ماورئ ادراک ہونے کے متعلق بہت لطیف اشعار کہے ہیں:

حد کنہ تو بہ ادارک نشاید دانست
وین سخن نیز باندازۂ ادراک من است

یہ کہنا کہ ادراک سے تیری کنہ تک نہیں پہنچ سکتے یہ سخن بھی کسی یقینی صداقت کا آئینہ نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ یہ بات تو میں اپنے اندازہ ادراک کے مطابق کر رہا ہوں۔ خود اس عجز کے دعویٰ کی حقیقت بھی بدیہی نہیں۔'' [۱۰] واقعہ یہ ہے کہ سلبیت محض متناقض مسلک ہے۔ اس کا احساس خود اس بات کا غماض ہے کہ حقیقت کے بارے میں ہم کم از کم اتنا جانتے ہیں کہ نہیں جان سکتے۔ پھر اس کو مطلق نہ جاننا کیسے کہہ سکتے ہیں۔

خدا کا شعور اور احساس ایک مثبت رجحان ہے جو محض ہر شئے و خیال و تصور یا شعور کی نفی سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ وہ محض غیب ہی غیب ہے لایعنی ہے۔ اس کا احساس اس بات کی دلیل ہے کہ اس سے آگہی ہو سکتی ہے، اس کا وجود ہماری سمجھ میں آ سکتا ہے۔ اس گفتگو سے یہ نتیجہ بدیہی طور پر نکلتا ہے کہ الٰہیات ایک ایجابی علم ہے۔ خدا کا اقرار اپنے مثبت پہلو رکھتا ہے۔

خدا کا اقرار نہ تو خالص تصور کی سطح پر ہو سکتا ہے نہ خالص حسی ارتسام کی سطح پر۔ اس کا محل وقوع ملکہ تخیل ہو سکتا ہے۔ ''غیب الغیب'' کے احساس میں جو عجز ہے وہ محض خلاء پیدا کرتا ہے۔ تخیل میں وہ قوت ہے جو اس خلاء کو پر کرتی ہے۔ تخیل کا یہ عمل فطرت انسانی کے مطابق ہے کیونکہ انسان زیادہ دیر خلاء میں نہیں رہ سکتا پھر وہ ہر شئے کو پوجنے لگتا ہے۔ ہر بت اس کا نمائندہ بن جاتا ہے، ہر ارتسام غیب الغیب کا قائم مقام قرار پاتا ہے۔ چنانچہ انسان ہر دہلیز پر پیشانی رگڑتا ہے۔ صنم پرستی کا یہی عالم ہے۔ چنانچہ صنمیاتی شعور سے لاتعداد دیوی دیوتا عالم اثبات میں آتے ہیں جو انسانوں کو باہم متفرق کر دیتے ہیں، سماج میں رخنہ ڈال دیتے ہیں، جاتیوں میں تقسیم کا باعث ہوتے ہیں۔ ہندی معاشرے کا یہی المیہ ہے کہ ایک

ہیں۔ تمام خدا پرستوں کا نہ صرف اس کی وحدانیت بلکہ اس کے علم کلی، ارادہ مطلق، بیکران رحم و کرم، بے پایاں عدل و احسان پر ایمان ہوتا ہے۔ مگر جب ہم مجردات کی صورت میں اس کے وجود کا تعقل کرنا چاہتے ہیں تو بالکل بے بس ہو جاتے ہیں کہ ایک ایک بات راز در راز معلوم ہوتی ہے۔ ہم کسی ایسی علت کو نہیں جانتے جس کا کوئی سبب نہ ہو۔ اس لیے خدا کا تصور بحثیت علت بھی محال معلوم ہوتا ہے۔ ہم کسی ایسی شئے کا تصور نہیں کر سکتے جو زمان و مکان میں نہ ہو۔ اگر زمان و مکان اس کی مخلوق ہیں تو پھر وہ کہاں ہے؟ ہم بغیر مخلوق کے خالق کا تصور قائم نہیں کر سکتے۔ اس سے وہ بلا شرکت غیرے معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس کو شعور کہنا محال لگتا ہے کیونکہ شعور فی نفسہ دوئیت پسند ہے۔ کسی نہ کسی شئے کا شعور ہوگا، اس کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ اس لیے شعور، خود نفس شعور کے علاوہ غیر کا طالب ہے۔ چنانچہ اب سوال ہوتا ہے کہ غیر از شعور کیا ہے؟ اگر ہے تو خدا پھر محدود ہو جاتا ہے۔ غرض ہر سوال ایک چیستاں ہے اور ہر جواب ایک معمہ...... اگر ہم اس کو شخصیت کہیں تو کیا یہ بے جا نہیں ہے اس لیے کہ شخصیت تو ہمیشہ ذات اور ماحول کے باہم تعامل سے ابھرتی ہے؟ ایسی صورت میں اگر خدا کی شخصیت ہے تو پھر کیسی ہے؟ غرض تعقلات میں ہر ایسا سوال کسی نہ کسی مخمصہ میں ڈال دیتا ہے؟ خلیفہ صاحب ان امور سے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ تمام منطق اور نفسیات یا تو ہمیں لا ادریہ کے مسلک تک پہنچا دیتی ہے یا منفی الٰہیات تک۔ یعنی یا تو ہم حسی دنیا سے ماورئی ہر دنیا کے انکار کو اپنا مسلک بنا لیتے ہیں یا پھر حقیقت کی ایسی تعریف میں پڑ جاتے ہیں جو سب کی سب نفیوں پر مبنی ہوتی ہے۔ خدا نہ یہ ہے نہ وہ ہے، ہر بات کی نفی۔ ہندی فلسفہ و مذہب نے خواہ گیان کو راہبر بنایا ہو یا دھیان کو، یہی راستہ اختیار کیا ہے اور انجام کار بدھ مت کے تہی الہ ''نروان'' کے تصور اور شنکر کے ''نرگن برہمہ'' تک پہنچ کر عاجز آ جاتا ہے۔ مگر جیسا کہ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں منفی الٰہیات پر کسی مثبت مذہب کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی کیونکہ ایسی الٰہیات کو عقلاً ارتیابیت سے مختلف قرار نہیں دیا جا سکتا۔[۹] اس سے وہ خلا پیدا ہوتا ہے جس کو ہندوستان میں صنم پرستی اور مظاہر پرستی نے پورا کیا۔ چنانچہ ہندی مذاہب کی قوس غیب الغیب تک چلی گئی ہے جہاں لا اور صرف لا کا سلسلہ ہے جبکہ اس کی جوابی قوس بے شمار دیوی دیوتاؤں کی پوجا ہے جہاں ہر قوت کے سامنے سر تسلیم خم ہے۔ چونکہ ہندی الٰہیات اثباتی انداز میں خداوند کا عقیدہ پیش نہیں کر سکی اس لیے کوئی اعلیٰ اخلاقی نظام بھی پیش نہیں کر سکی۔ یہ

طرف اپنے اپنشد کی تعلیمات ہیں جن میں ’’نرگن‘‘ ہے اور دوسری طرف ان گنت دیوتاؤں کی پرستش ہے۔ چنانچہ اس صورت میں ضمیر کو صرف ایک ہی بات مطمئن کر سکتی ہے کہ تمام انسان اور ان کے دیوی دیوتا غرض سب کو مایا ہی مایا سمجھا جائے اور بس۔ یہ پھر عقل کی فتح ہے مگر آخر کار ایک منفی رجحان ہے جو کسی صحت بخش اصول میں منتج نہیں ہو سکتا۔ ذات پات کے بندھن بھی مایا، اونچ نیچ بھی مایا، ہم اور تم بھی مایا تو پھر ان کا ہونا کیا اور نہ ہونا کیا! دیکھا جائے تو یہ اخلاقی طور پر ایک منافقانہ رجحان ہے جس کے اندر ہر قدر، ہر اہم بات، ہر آدرش بے ثبات ہو کر رہ جاتا ہے اور نظریاتی طور پر یہ سب کچھ منفی الٰہیات کے کارن ہے جس میں عقل کے مسکت ہونے کے بعد تخیل کو کارفرما ہونے کا موقع نہیں دیا گیا۔

تخیل غواص حقیقت ہے۔ یہ حقیقت وجود کا قریب ترین ساحل ہے جبکہ عقل کی برجی محض بہت دور سے ایک نظارہ ہے۔ تخیل کی شان یہ ہے کہ ایک طرف یہ زمان مکان، کب اور کہاں کا پابند ہے دوسری طرف احساس و جذبات، ارادہ و تحریک کا نباض ہے۔ اس طرح ایک طرف طول و عرض اس کے پر پرواز ہیں دوسری طرف عمق اور گہرائی اس کی داب میں ہیں۔ امتداد میں یہ عمق کا مدرک ہے اور عمق میں یہ امتداد کا ناظر ہے۔ اسی لیے اس کی چشم دیدہ میں کل وجود ہوتا ہے اور اسی لیے اس کے بیانات میں گو مادی رنگ ہوتا ہے مگر باطن اس میں چھلکا پڑتا ہے۔ چنانچہ مثبت الٰہیات کا قیام بھی اسی تخیل کا وظیفہ ہے۔ جب باری تعالیٰ کا کوئی اثباتی تصور عقل کے ذریعہ قائم نہیں ہو سکتا تو یہ تخیل ہی ہے جو اس کے اثبات کا داعی ہوتا ہے اور شعور انسانی کو اس کی ذات بے ہمہ سے قریب لاتا ہے۔ تشبیہات اور استعارات، تلمیحات و کنائے وہ ذرائع ہیں جن کے وسیلے سے انسان اس قربت کا ذائقہ چکھتا ہے۔ چنانچہ ’’خواہ یہ بلا واسطہ کشف و الہام ہو یا ایمان و ایقان یا فہم و ادراک خدا اور اس کی صفات کا ہر بیان علامت و اشارت میں ہوگا۔‘‘ [11] لوگ اس کو باپ سے تعبیر کرتے ہیں، پکارنے والے اس کو مالک یا آقا کہہ کر بھی پکارتے ہیں مگر یہ بھی دراصل اشارت یا علامت ہے۔ خلیفہ صاحب بیان کرتے ہیں کہ انسان میں ہم آہنگی و مشابہت کی جستجو کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ یہ اسلوب بیان دراصل اسی داعیہ کی پیداوار ہے۔ چنانچہ اسی داعیہ کے تحت وہ خدا کے لیے بھی کنائے اور تشبیہات وضع کرتا ہے جن سے فہم کو اس کی ہستی سے قریب لانے میں غیر معمولی سہولت حاصل ہوتی ہے۔ مگر اس مقام پر وہ خبردار کرتے ہیں کہ نفس انسانی میں ایک

اور تحریک پائی جاتی ہے۔ جب اشارات نہایت لطیف اور بلیغ ہوتے ہیں تو یہ میلان رکھتی ہے کہ اس کو حقیقت کا قائم مقام سمجھا جائے مگر یہ میلان صرف یہیں تک بس نہیں کرتا۔ رسم و تشبیہ بہت سے ناقص تصورات کا ماخذ بن کر اسطوریات و خرافیات کا جنم داتا بن جاتی ہے اور صاف ستھرے مذہب کو دیوستان بنا دیتی ہے۔ شعور انسانی کو توہمات کا شکار بنا کر ضعیف کر دیتی ہے مثلاً ''نور'' کی اشارت نوفلاطونیت میں حقیقت لایزال کا سب سے اعلیٰ ترین ''استعارہ'' ہے۔ مگر نوفلاطونیت اس کی ''استعاریت'' پر بس نہیں کرتی۔ اس کو عین حقیقت و جوہر وجود کا مقام عطا کر کے اپنی جملہ مابعد الطبیعیات کا اس کو مدار بناتی ہے۔ چنانچہ اشراقیت کا نظریہ ہے کہ جس طرح سورج سے نور اور حرارت کی ہر سمت اشاعت ہوتی ہے نفس حقیقت کے انوار سے بھی ہر سمت ضیا پاشی ہوتی ہے۔ یہی حقیقت ظہور ہے۔ چنانچہ اشاعت نور سے پہلے نور الانور ہے۔ اس سے جس تنویر کی ضوفشانی ہوئی ''شعور کلی'' یا عقل اول ہے۔ منبع انوار سے اقرب ترین ہونے کی وجہ سے یہ منور ترین و مجلی ترین ہے۔ جب انتشار و اشاعت اس کے دائرہ وجود سے اور آگے بڑھتی ہے تو ''نفس عالم'' کا دائرہ قائم ہوتا ہے۔ یہ عقل اوّل سے مقابلہ میں کم منور ہے۔ یہاں ''نور'' میں ظلمت کا اعتبار قائم ہو گیا ہے۔ چنانچہ یہاں ''تحریک'' و ''جذبہ'' اور ''داعیہ'' وغیرہ موجود ہوتے ہیں۔ انتشار نور اس ''نفسی وحدت'' کے دائرہ سے اور آگے بڑھتا ہے۔ نور کی شعاعیں اور ضعیف ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ نباتات کی دنیا شروع ہو جاتی ہے۔ شعاعیں اور آگے بڑھتی ہیں یہاں تک کہ تمام امکانات اشاعت ختم ہو جاتے ہیں اور آگے اندھیرے کا عالم شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اندھیرا ''مادہ'' ہے۔ اِس پر جو شعاعیں پڑتی ہیں ان سے عالم رنگ و بو یا عالم طبیعی کا وجود ہے۔ یہ مادہ کی ظلمت پر نوری ارتسام ہے اور بس۔ ساری صورتیں جو نظر آتی ہیں، تمام معطیات حواس جو مدرک ہوتے ہیں ظلمت پر نور حق کے ارتسامات ہیں۔ ہم نے نوفلاطونیت کی اشراقیت کو ذرا تفصیل سے یوں بیان کیا کہ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ایک معمولی کنایہ کتنا ہی لطیف اور روح پرور ہو اگر اس کو کنایہ کے درجہ سے اٹھا کر عین حقیقت کا درجہ دیدیا جائے تو کیسے کیسے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ بجائے حقیقت سے قریب ہونے کے فہم انسانی خود بہت سے اصنام تراش لیتی ہے۔ مثلاً ''ذہن عالم''، ''نفس عالم''، ''عقل اوّل''، ''عقل ثانی'' وغیرہ وغیرہ۔ افکار کے جتنے بڑے بڑے مغربی سلسلے نظر آتے ہیں اکثر و بیشتر ان کی کیفیت یہی ہے کہ کسی نہ کسی

''استعارہ'' کو اصل حقیقت قرار دے کر واہمی چکروں سے سارے وجود و کون و فساد کا خیال الٹ دیا گیا ہے۔ اب اس سلسلے میں تصوریت ہی کو لیا جائے۔ اس میں حقیقت مطلق کے لیے ''شعور'' کا استعارہ یا ''علم'' کی علامت کو مدار بنایا گیا ہے۔ ذات باری ازلی و ابدی کی حقیقت کی طرف شعور یا علم کی نسبت بذات خود ایک ایسی اشارت ہے جو انسان کو اس کی طرف لے جاتی ہے اور بالآخر حق کی تفہیم عطا کرتی ہے۔ لیکن اگر اس علامت کو خود حق کا قائم مقام بنا دیا جائے بلکہ خود عین حق قرار دیا جائے تو گمراہی پیدا ہوتی ہے۔ چنانچہ مزید اعتقاد سے کام لیں تو پتہ چلے گا کہ تمام تصورات کی تہہ میں ''اشارت'' کو ''حقیقت'' سمجھنے کا مغالطہ پایا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہم کیوں ان تشبیہوں اور استعاروں کے چکر میں پڑیں کہ ایسے مغالطے ہوں؟ خلیفہ صاحب اس کا جواب یوں دیتے ہیں کہ ''انسان نے جو زبان بنائی وہ مادی چیزوں اور ان کے باہمی ربط کو سمجھنے کے لیے بنائی۔ اس کے بعد جب اسے نفسی کیفیات، تاثری احوال، پھر تصورات کے بیان کرنے کی ضرورت پیش آئی تو ان کے لیے زبان موجود نہ تھی۔ مجبوراً یہ کرنا پڑا کہ نفسی کیفیتوں کے لیے بھی مادی الفاظ استعمال کیے جائیں۔ روح کو الفاظ بدن اور مادہ سے مستعار لینے پڑے[۱۲] لین دین کے اس عمل کی پشت پر انسانی تخیل کی فعالیت ہے جو بیک وقت تینوں رخوں یعنی طول، عرض و عمق میں گردش کرسکتا ہے۔ اظہار کے لیے طول و عرض یعنی مکانی استعاروں کا وہ محتاج ہے لیکن چونکہ خود عافر عمق ہے اس وجہ سے عمق کے اظہار کے لیے بھی مکانی استعاروں میں رشتہ بیان پیدا کرلیتا ہے اور نفسی اور روحانی واردات کو طبعی علامتوں میں واشگاف کرتا ہے۔ یہ اس کی علامت سازی ہے یا صناہی ہے۔ اس سے مفر نہیں۔ مگر خلیفہ صاحب یہ فرماتے ہیں کہ علامت و حقیقت، استعارہ و اصل کے امتیاز کو اگر مضبوطی کے ساتھ تھام لیا جائے تو ان مغالطوں سے بچاؤ ہوسکتا ہے جو علامتیت کی ناگزیر ضرورت سے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ حقیقت کے خواہ کتنے ہی ابعاد ہوں بیان میں وہ صرف دو ابعاد میں ظاہر کی جائیگی۔ اس لیے خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ حقیقت بذات خود اپنی کوئی ممیّز زبان نہیں رکھتی چنانچہ انسان کی وضع کردہ زبان ہی اس کا وسیلہ ہے۔ اس نکتہ کی وہ مزید شرح بیان فرماتے ہیں کہ ہماری زبان ایسی اختراع ہے جو انسانی رشتوں، انسان کے ماحول کے ساتھ روابط یا اشیائے ماحول کی ایک دوسرے

کے ساتھ اضافتوں کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ انسان دو جہانوں کا باسی ہے۔ ایک تو یہی عالم جس میں مادی اشیاء اور ان کی باہم اضافتیں پائی جاتی ہیں اور دوسرا عالم روحانی جس کے اندر انسانی رشتوں سے لے کر معبود و بندہ کے روابط پائے جاتے ہیں۔ انسانی زبان کی ایجاد حیاتیاتی اور طبعی احتیاجات کی رہین منت ہے۔ اس سبب سے روحانی تجربات کی اعلیٰ ترین سطح پر بھی انسان اظہار معنی کے لیے ان اصطلاحات و حدود کا محتاج ہے جو زبان کے مخصوص ارتقاء نے فراہم کیے ہیں۔ چنانچہ ہم ذہن کی وسعت، دل کی تنگی، خیالات کی گہرائی غلطی کے ہمالہ کا ذکر کرتے ہیں۔[۱۳]

خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ باطنی تجربات میں دو صورتیں نمودار ہوتی ہیں۔ ملکہ تخیل معرفت کے اصل لمحات ہی میں جاری و ساری ہو کر ان میں ڈرامائیت پیدا کر کے قابل اظہار بنا دیتا ہے یعنی معرفت کو مکانی شبیہوں میں ڈھال دیتا ہے۔ چنانچہ خدا جو تمام معارف کا موضوع ہے مکانی طور پر انسان سے باہر نہیں ہے۔ وہ خود انسان کے باطن میں موجود ہے لیکن خود خدا کی ماورائیت ملکہ تخیل کی ماورائیت سے مکانی شبیہ میں یوں ظاہر ہوتی اور معلوم ہوتی ہے کہ وہ آسمانوں سے پرے ہے اور اپنے محبوب بندوں سے فرشتوں کے ذریعہ نام و پیام رکھتا ہے۔[۱۴] مرشد رومی کہتے ہیں کہ اصل تجربہ سے جب حقیقت روز روشن کی طرح نمودار ہوتی ہے تو عقدہ کھلتا ہے کہ عالم روحانی میں مکانیت کا تو سایہ بھی نہیں پڑتا۔ مکانیت اور اس کے اضافات کا حقیقی مصداق عالم مادی ہے لیکن روحانی تجربہ ملکہ تخیل کے عمل سے مکانی علامت اختیار کر لیتا ہے۔[۱۵] خدا کلام مجید میں ارشاد فرماتا ہے کہ ''ہم تم سے رگ جان سے بھی قریب ہیں۔'' اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی خودی اور ذات اللہ میں کوئی مکانی فاصلہ نہیں ہے۔ بے شک انائے ربی اپنی غیر متناہیت میں انسانی خودی سے ماورئ ہے لیکن یہ ماورائیت کوئی پھیلاؤ یا امتداد نہیں ہے۔ جب کوئی صاحب وحی الٰہی یہ محسوس کرتا ہے کہ ایک فرشتہ ہے کہ اُس کے پاس پیغام لایا ہے اور اس فرشتہ کو وہ ایک مخصوص پیکر میں دیکھتا ہے تو اس صورت میں ہوتا یہ ہے کہ سرچشمہ معارف خود اس حامل پیام و رسل کے باطن میں سے پھوٹتا ہے لیکن روح ملکہ تخیل کے وظیفہ سے...... اس تجربہ کو آسمان سے اترنے والے یا خارج سے پیام لانے والے فرشتہ کے روپ میں دیکھتی ہے۔ مولانا رومی اس مکانی اشارت کی تشریح خوابوں کی نفسیات کی مثالوں سے کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جب تک کوئی انسان

وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اعلیٰ ترین عرفان ایک ایسے بیکران لطف پر مشتمل ہوتا ہے جس کے سامنے ہر بیان و احساس عاجز ہے۔ کوئی لذت جس سے ہم واقف ہیں اس کی ہمسری نہیں کر سکتی۔ جو اس کو نہیں جانتا وہ اس پر مصر ہوتا ہے کہ عارف باللہ کچھ تو اس کا اتہ پتہ دے۔ چنانچہ عارف طبعی تمثیلوں اور کنایوں کے لیے اپنے کو مجبور پاتا ہے۔ وہ ایک ایسی جنت کا مرقع کھینچتا ہے جس میں ان تمام فطری اور جبلی خواہشات کی لاانتہا تشفی کا سامان ہوتا ہے۔ جو عام زندگی میں تنگیٔ داماں کی وجہ سے پوری نہیں ہو پاتیں۔ اس جنت کے اندر باغات ہیں دودھ اور شہد کی نہریں ہیں۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ ہر مذہب اپنی فطرت کی مناسبت سے جنت فردوس کی خیال آرائی کرتا ہے۔ خطہ حارہ میں رہنے والوں کی جنت ایسی نہیں ہوتی جس کا تخیل باردہ والوں کی جنت سے ملتا جلتا ہو۔ اگر کوئی قوم موسیقی کی دلدادہ ہے تو اس کی جنت مسلسل نغمہ و موسیقی ہے۔ چنانچہ جنت کے یہ نقشے سب کے سب اعتباری و اضافی ہیں مگر ہاں سب میں ایک بات البتہ قدر مشترک ہے کہ جنت اچھی زندگی کا ایسا انعام ہے جس کے اندر حیات کے فتنے و فساد، تناقضات و مناقشات مٹ جاتے ہیں اور سامان راحت موجود ہوتا ہے۔ جنت کی اشاریت میں یہ دائمی عنصر ہے جو سب اعتباری تخیلات میں یکساں طور پر شناخت پذیر ہے۔[۱۸]

خلیفہ صاحب اشاریت کی عام توضیح و تشریح کے بعد اسلام کا رویہ واضح کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جو مذاہب "علامتوں" اور استعاروں کو فی الحقیقت من و عن عین حق خیال کرتے ہیں ان کو بجائے الہامی مذہب تسلیم کرنے کے خرافیاتی مذاہب کے زمرہ میں شمار کرنا بہتر ہوگا۔[۱۹] خرافیاتی شعور اور اعلیٰ شعور میں فرق یہی ہے کہ خرافیاتی شعور علامت اور حقیقت کے اعتبار کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ علامتیں سب مذاہب استعمال کرتے ہیں مگر وہی مذہب اصلی اور روحانی ہے جو علامتوں اور حقیقتوں کے اعتبار کو مضبوطی اور دیدہ ریزی سے قائم رکھتا ہے۔ جب یہ امتیاز ابہام کا شکار ہو جاتا ہے تو شعور روحانیت کی سطح سے نیچے گر کر خرافیات میں زوال پذیر ہو جاتا ہے۔ کتنے ہی اسلامی فرقے خرافیات کا شکار ہو گئے۔ کئی ایک فرقے ہوئے جنہوں نے خدا کی تجسیم کو ہی عقیدہ بنا لیا اور خدا کو انسان کی طرح کا ایک مادی پیکر سمجھا۔ یہ لوگ بشر مرکزی شعور کی گرداب میں پھنسے ہوئے ہیں۔ قرآن شریف عقیدہ توحید کی تعلیم دیتا ہے مگر خرافیات سے انسان کو بچاتا ہے۔ بشر مرکزی خرافیات خدا کو انسان

خواب دیکھتا رہتا ہے ڈرامائیت کا عمل جاری رہتا ہے۔ چنانچہ ''اشارت'' یا علامت خواب کی زبان ہے۔ انسان خواب میں بہت سے افراد سے معاملہ کرتا ہے۔ یہ سب آدمی، اس کے اپنے تصورات و خیالات کی تلبیس و ڈرامائیت کے لیے کچھ بھی نہیں ہوتے۔ سوائے اس کے اپنے نفس کے اور کوئی نہیں ہوتا۔[۱۶] رومی فرماتے ہیں کہ پیامبروں کے باب میں یہی ہوتا ہے۔ کوئی معنی یا صداقت خود ان ہی کے شعور کے اندر سے ابھرتی ہوئی ہوتی ہے، کیونکہ خدا خود اندر ہے، اس کو باہر سے پیام بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ پیامبر کے بیدار شعور میں خود اس کی اپنی گہرائیوں میں سے گہر معنی نکلتے ہیں۔ معراج بھی یہی ہے۔ ملکہ تخیل کی برکت سے یہ زمینوں اور آسمانوں کی سیر معلوم ہوتی ہے مگر بقول سرمد اس کی حقیقت یہ ہے کہ خود زمان و مکاں ذات مصطفوی میں سے واشگاف ہوئے تھے۔ نبی کی یہ یافت معنی جسے الہام یا وحی کہتے ہیں ایک ڈرامائی پیکر اختیار کر لیتی ہے کہ ایک فرشتہ ہے جو اُسے اقراء باسم ربک الذی سکھ رہا ہے۔ اس یافت کی یہ صورت ظاہری ہے مگر اس میں جو اصل ہے وہ حقیقت ہے اور اسی وجہ سے وحی نبوت واہمات بے بنیاد اور خواب ہائے پریشان سے اپنی حقیقت ماہیت و مافیہ میں بالکل جدا اور ارفع واقعہ ہے۔[۱۷]

جدید نفسیات کے اکتشافات ملکہ تخیل کی کارفرمائی کی تائید کرتے ہیں کہ لاشعور سے جو خواہشیں یا تاثرات، محرکات و تصورات عرشہ شعور پر آتے ہیں تو ایک باطنی محتسب کے ڈر سے جو شعور کے دروازہ پر بیٹھا ہوا ہے ناپسندیدہ خواہشات و تجربات، پسندیدہ روپ اختیار کر کے سطح شعور پر نمودار ہوتے ہیں۔ گو کہ تحلیلی نفسیات کا مکتب اپنے دائرہ بیان کو ناپسندیدہ جذبات کی حد تک رکھتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ روپ دھارنا اور پسندیدہ لباس میں ظاہر ہونا صرف غیر پسندیدہ تجربات تک محدود نہیں ہو سکتا۔ ایسے تجربات و مشاہدات جن کے اظہار کا کوئی وسیلہ نہیں وہ بھی شعور پر جب آنا چاہتے ہیں لاشعوری طور پر علامت سازی اور ڈرامائیت کے عمل سے ہو کر گزرتے ہیں۔ اس سے ان تجربات کی حقانیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اولیاء اور اہل معارف یہاں تک کہ انبیاء مرسلین ان دیکھی حقیقت یعنی ''غیب'' کے تجربات و حقائق کی نشاندہی کے لیے کثرت سے کنایوں۔ تلمیحوں اور استعاروں کا سہارا لیتے ہیں۔ چنانچہ ان دیکھی حقیقت کو وہ حسی ادراک کی زبان میں بیان کرتے ہیں۔ اس اظہار میں بھی قوت متخیلہ کے جوہر کھلتے ہیں۔ مولانا رومی اس کو سمجھانے کے لیے ایک مثال لاتے ہیں۔

کبیر بنا دیتی ہے یعنی اس میں انسان خود اپنے خدا کو تراشتا ہے، پھر اپنے تراشیدہ ہی کو خود ہی پوجنے لگتا ہے۔ چنانچہ ''زاہد کم نظر کے تصور میں جو خدا ہے وہ مشخص ہونے کی وجہ سے ایک بت ہی ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ برہمن کا بت پتھر یا لکڑی کا ہے اور خارج میں نظر آتا ہے، شیخ ظاہر پرست کا بت اس کے سر میں ہے، دوسروں کو دکھائی نہیں دیتا۔'' [۲۰] قرآن مجید کی سورہ اخلاق ذات باری کے سلسلے میں پوری اسلامی تعلیم کا خلاصہ ہے۔ خلیفہ صاحب نے مذہبی اشاریت کے ضمن میں اس کی تفسیر کی ہے کہ اس کے ذریعے انسان ہر قسم کی خرافیات، تجسیمیت اور غلط قیاسات وغیرہ سے اخلاص پاتا ہے۔ اسی سورت کی پہلی آیت ہر قسم کی الٰہی کثرتیت کی نفی کرتی ہے خواہ وہ فلسفیانہ ہو یا مظہری ہو۔ دوسری آیت میں اس کی صمدیت ہے۔ تیسری آیت میں یہ بیان کہ وہ کسی سے تولد ہوا نہ وہ کسی کا مولد یا والد ہے۔ افلاطون کا خدا تولد شدہ ہے۔ تصور خیر اور فطری قوتیں اس کے موالید ہیں۔ ویدانت میں حقیقت مطلقہ کے مایا سے اتصال پر انائے کلی یا برہم آتما کا انحصار ہے۔ الیگزینڈر کے ہاں مکان و زمان سے نشاۃ پاتی ہوئی کلی زندگی یعنی خدا ابھی ''حالت کون'' میں ہے۔ اسلام ایسے تمام خیالات کو باطل ٹھہراتا ہے۔ آخری آیت ایسے تمام خیالات کو باطل ٹھہراتی ہے۔ یہ آیت واضح کرتی ہے کہ کوئی اس کا کفو نہیں۔ اسلام کا بنیادی مقصد عقیدہ توحید کا اخلاص ہے۔ ہر قسم کی تعداد الٰہ، تثلیث، حلول، فلسفیانہ مطلقیت اور بشر مرکزیت سے عقیدہ توحید کا تزکیہ اس کا نصب العین ہے۔ اگر ان آیات اخلاص پر غور کیا جائے تو نہ صرف ان سے خدا کی نفی والی تعریف حاصل ہوتی ہے بلکہ مثبت بھی۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام کے اندر سلبی الٰہیات ہی نہیں، محض غیب اور غیب ہی نہیں بلکہ مثبت الٰہیات بھی ہے۔ چنانچہ ان آیات میں اس کا ''احد'' ہونا ایک ایجابی تصور ہے۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ نہ صرف یہ مذہبی بلکہ سائنسی اصول موضوعہ ہے۔ اس ایجابی احدیت سے سائنسی افکار وحدت پاتے ہیں اور سائنس اس کے سوا کیا ہے؟

سورہ فاتحہ کے ضمن میں خلیفہ صاحب واضح کرتے ہیں کہ اس سورت میں انسان اور خدا کا رشتہ واضح کیا گیا ہے جو ایجابی الٰہیات کو مقرون اور قطعی بنا دیتا ہے۔ ''سب تعریفیں خدا کے لیے ہیں جو رحمان اور رحیم ہے۔ یوم حساب کا مالک ہے۔'' پوری مذہبی زندگی کا خلاصہ ان آیتوں میں آ گیا ہے۔ ''ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے اعانت مانگتے

ہیں۔ ہم کو سیدھے راستے کی ہدایت کر...... ایسے لوگوں کے راستہ کی جن پر تو نے انعام کیا نہ ایسے لوگوں کے راستے کی جو گمراہ ہوئے۔" سورہ فاتحہ اور سورہ اخلاص کے درمیان تمام قرآن مجید توحید و ہدایت کی تفصیل و تشریح ہے۔ چنانچہ جہاں چوبیسویں سورہ کی ۳۵، ۳۶ آیات میں خدا کو نور کہا گیا ہے کہ جو نہ شرقی ہے نہ غربی وہاں وضاحت سے کہہ دیا گیا ہے کہ یہ تو ایک مثال ہے۔ نور کی مثال ہدایت کو واضح کرتی ہے جس کے مقابل ظلمت ہے جو گمراہی کا استعارہ ہے۔

قرآن شریف نے واضح طور پر اس مسئلہ کا تصفیہ کر دیا ہے کہ مذہبی اشاریت جو تشبیہوں اور استعاروں سے عبارت ہوتی ہے، اس کے بارے میں کیا رویہ اختیار کیا جائے۔[۲۱] قرآن شریف نے آیات کی دو قسمیں کی ہیں: محکمات اور متشابہت۔ مذہبی زندگی کی بنیاد محکمات پر ہے جو صاف صاف کھلے بیانات پر مشتمل ہیں۔ آیات متشابہات اس زمرہ سے باہر ہیں۔ ان ہی کے معنی و دلالت میں اختلاف ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب یہ واضح کرتے ہیں کہ قرآن شریف فرماتا ہے کہ وہ لوگ جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ متشابہات کی طرف جاتے ہیں، گمراہی کا باعث ہوتے ہیں اور اپنی سی تعبیر کرتے ہیں۔ لیکن ان کی تعبیر سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا (سورت ۳۔ آیت ۷)۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ خود متشابہات کے دو معنی ہیں۔ یہ لفظ عربی مصدر "شبہ" سے مشق ہے جس کے معنے ہیں مماثل ہونا یا "ایک جیسا ہونا۔" کسی تمثیل، تلمیح یا استعارہ میں یا تو یہ ہوا ہے کہ بیان اور تذکرہ میں اس حقیقت سے موازنت و مماثلت پائی جاتی ہے جس کا وہ بیان اور تذکرہ ہے۔ مثلاً اس بیان میں کہ "خدا دیکھتا ہے اور سنتا ہے" حقیقت ذات باری سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ اس قسم کے بیان میں "دیکھنا" اور "سننا" جیسے الفاظ کی تعبیر میں اختلاف ہو سکتا ہے مگر نفس معاملہ میں نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کا دیکھنا اور سننا ایسا نہیں ہوتا جیسا ہمارا ہے۔ ہمارے لیے تو یہ امور آلات حس کے محتاج ہیں جب کہ خدا سب سے غنی ہے۔ اور وہ کسی کا محتاج نہیں۔ ہمارے دیکھنے اور سننے اور اس کے دیکھنے اور سننے میں جو قدر مشترک ہے وہ آگہی اور ادراک ہے اور بس۔ اگر اس باریک امتیاز و فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو خدا کے سمیع و بصیر ہونے کی معرفت ظلم اور جہل کا شکار ہو جائے۔ بہت سی خرافی الٰہیات اسی جہل کی پیداوار ہے جو تشابہ میں مندمج فرق کو محسوس کرنے سے قاصر ہے۔

بے شمار درجے ہیں۔ چنانچہ ایک فرد کو ایک آیت متشابہ لگتی ہے تو دوسرا فرد حقیقت کے اس درجہ میں ہوتا ہے کہ وہ ''محکم'' معلوم ہوتی ہے۔

قرآن کے معارف تک پہنچنے کی بہترین کوشش یہ ہے کہ انسان کو جو محکمات معلوم ہوں ان پر وہ عمل پیرا ہو۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو اوامر و نواہی کے بیانات تمام انسانوں کے لیے پہلی نظر میں ہی محکم ہیں۔ ان محکمات پر عمل پیرا ہونے سے وہ صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے جو انسان کے ماحول، اس کے باطنی کیفیات، اس کے نفس کے رجحانات کو بدل دیتی ہے اور اس کے شعور کو پہلے سے کہیں زیادہ طاقتور اور بلند پرواز بنا دیتی ہیں۔ یہی بلند پروازی جو تقویٰ کا نتیجہ ہے انسان کو عرفان کے خزانے کے عطا کرتی ہے اور وہ آیات الٰہی میں لامتناہی سفر کرتا ہے یعنی مقامات متشابہات سے محکمات کی طرف۔ جہاں تک خود عبادات کا تعلق ہے چشم بصیرت ہو تو انسان دیکھے تو ان کی حقیقت بھی اشارت علامت ہے۔ اگر محبت انسان کی حقیقت ہے تو خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ یہ ایک معنوی حقیقت ہے، ایک ذوقی اور وجدانی چیز ہے، کوئی مادی شئے نہیں لیکن اس کا اظہار اور اس کا ثبوت ظاہری اعمال سے ملتا ہے جو محبت کا نتیجہ ہوتے ہیں اور محبت کی گواہی دیتے ہیں۔ انسان جس عالم میں زندگی بسر کرتا ہے وہ صورت و معنی کا مرکب عالم ہے۔ یہاں پر معنی صورت کا جامہ پہن لیتے ہیں۔ خدا سے محبت اگر محض فکری اور معنوی حیثیت میں رہتی تو پھر نماز روزہ وغیرہ عبادت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔ مولانا رومی فرماتے ہیں کہ دوست ایک دوسرے کو تحفے دیتے ہیں جو مادی اشیاء ہوتی ہیں حالانکہ محبت مادی نہیں۔[۲۴] اس تشریح سے خلیفہ صاحب شریعت اور روح مذہب کا رشتہ واضح کرتے ہیں۔ نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ تمام ظاہری رسومات، طور اور طریقے اپنی اصل میں اشارات ہیں، حقائق غیر مرئی ہوتے ہیں۔ ظاہری صورتیں ان کی ترجمان بن جاتی ہیں۔ جب صورت کو محض صورت کے طور پر برتا جائے اور اسی کو اصل اور عین سمجھا جائے تو دین کی روح مٹ جاتی ہے۔ اسی کو سچ پوچھئے تو کورانہ تقلید کہتے ہیں۔ جب دین اپنی اصل کھو بیٹھتا ہے، روح پرور ہونے کے بجائے ظاہرداری اس کا ماحصل بن جاتی ہے تو اعمال شریفہ یعنی عبادات اپنی رمزی علامتی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ان سے کسی معنی کی طرف رفعت نصیب نہیں ہوتی۔ اس وجہ سے تمام شرعی احکام میں ایمان باللہ کو بنیادی درجہ حاصل ہے۔ یہ مغز ہے باقی سب پوست ہے۔ اسی ایمان کی بدولت ظاہری رسوم

دوسری قسم کی مشابہت اشیاء کے مابین ہوتی ہے۔ جب مختلف چیزیں ایک جیسی ہوں تو متشابہ کہلاتی ہیں۔ یہاں بیان وتذکرہ کے تشابہ پر نہیں بلکہ اشیاء کے ایک دوسرے کے مثل ہونے پر تاکید ہے۔ لیکن چونکہ کوئی شئے خدا کے مثل نہیں اس لیے آیات متشابہات کو سمجھنے کے لیے بیانی تشابہ پر ہی اکتفا کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ مثلاً اس کو وسیع و بصیر کہتے وقت جیسا کہ اوپر گزرا کسی اور جاندار کی سماعت و بصارت کا خیال ذہن میں نہ رکھا جائے یا اس کو "علی العرش استواء" کہتے وقت انسانی بادشاہوں کی طرح تخت پر قائم نہ سمجھا جائے۔

قرآن مجید ایک مقام پر خود اپنے آپ کو پورے کا پورا محکم بتاتا ہے (سورت ۱۱، آیت ۱) اور ایک دوسرے مقام پر متشابہ قرار دیتا ہے (سورت ۳۹ آیت ۲۳)۔ خلیفہ صاحب کہتے ہیں کہ ان دعوؤں میں کوئی تناقض نہیں ہے۔[۲۲] ان دونوں وعدوں کا کلی مفہوم یہ ہے کہ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے پورا کا پورا قرآن محکم ہے۔ قطعی، بالکل واضح، ایہام وابہام سے پاک ہے جیسا کہ سورہ بقر آیت ۶ میں ہے کہ "یہ کتاب ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔" لیکن جب قرآن اپنے متشابہ ہونے کا ذکر کرے تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کی تمام آیات متشابہ ہیں۔ ان میں رموز کی ایسی سطحیں ہیں جن تک فہم انسانی پہنچ سے قاصر ہے۔ اس کی ہر آیت ایسی معرفت کا سرچشمہ ہے جو شعور انسانی سے ماوریٰ ہے۔ قرآن شریف کے کنایوں اور تلمیحوں میں جو ابہام ہوتا ہے وہ فہم انسانی کے عجز کی وجہ سے ہے۔ اس وجہ سے بعض آیات، آیات متشابہات ہیں اور بعض نہیں۔ عجز کی ایک اور بلند سطح ہے جہاں پر سب ہی آیات متشابہات بن جاتی ہیں یہاں تک کہ محکمات بھی۔ اسی طرح علم کی ایک سطح ہے جہاں متشابہات ہی محکمات بن جاتی ہیں۔ پورا کا پورا قرآن صاف واضح اور آسان ہے، اس کے اندر کوئی ابہام یا اشکال نہیں۔ خلیفہ صاحب کا ایک اور بیان اس نکتہ پر مزید روشنی ڈالتا ہے:

"حقیقت حیات میں کوئی روپوشی نہیں، فطرت میں بے انتہا ذوق ظہور ہے۔ لیکن ہر اظہار میں کچھ ظاہر ہوتا ہے اور کچھ روپوش رہتا ہے۔ ظہور بھی ہے لیکن اس کے باطن میں حسن مستور بھی ہے۔ جمال فطرت پر زمانی مکانی اور مادی حجاب آجاتا ہے لیکن یہ حجاب بقول غالب پردہ ہے پردہ ساز کا، فطرت نظارہ ساز بھی ہے اور نظارہ سوز بھی۔[۲۳] قرآن شریف کے بیانات کا اصطلاحی نام آیات ہے یعنی نشانیاں۔ نشانیوں میں اظہار وستر دونوں پائے جاتے ہیں اس لیے وہ سب کی سب متشابہات بھی ہیں اور محکمات بھی۔ اس سے یہ لازم آیا کہ معرفت کے

حوالہ جات:

[۱] خلیفہ عبدالحکیم، حکمتِ رومی، ص ۸۔

[۲] Khalifa A. Hakim, Religious and Symbolism (an unpublished paper).

[۳] ایضاً۔ [۴] ایضاً۔

[۵] ایضاً۔ [۶] ایضاً۔

[۷] ایضاً۔ [۸] ایضاً۔

[۹] ایضاً۔ [۱۰] افکارِ غالب، ص ۱۷۷۔

[۱۱] Religion and Symbolism

[۱۲] افکارِ غالب، ص ۱۵۷۔

[۱۳] Religion and Symbolism

[۱۴] حکمتِ رومی، ص ۱۶۵ تا ۲۰۶۔

[۱۵] ایضاً، ص ۸۳ تا ۱۰۳۔

[۱۶] Religion and Symbolism

[۱۷] Ibid.

[۱۸] اسلامی نظریۂ حیات، ص ۳۰۶ تا ۳۰۸۔

[۱۹] Religion and Symbolism

[۲۰] افکارِ غالب، ص ۱۷۶-۱۷۷۔

[۲۱] Religion and Symbolism

[۲۲] Religion and Symbolism

[۲۳] افکارِ غالب، ص ۴۱۹-۴۲۰۔

[۲۴] تشبیہاتِ رومی، ص ۱۱۷۔

[۲۵] تشبیہاتِ رومی، ص ۵۸۹۔

اور قوانین میں مسلسل اشارت پائی جاتی ہے اور ان میں رجوع الی اللہ ہونے کا داعیہ پایا جاتا ہے۔ جس آدمی کا ایمان اس کے اعمال پر ہی مشتمل ہو گیا یعنی اپنے اعمال میں ہی تشفی کلی سے ہمکنار ہو گیا تو یہ اعمال ایمان کے قائم مقام نہیں بلکہ خود عین ایمان بن جاتے ہیں، چنانچہ اب ان میں کوئی رفعت باقی نہیں رہتی۔ ان ہی میں داعیہ ایمان کی تشفی ہونے لگتی ہے۔ اس سبب سے وہ محض عادتوں کی حیثیت سے قائم ہو جاتے ہیں، ان میں وہ شان و رمزیت، اشارہ و کنایہ باقی نہیں رہتا جو روح کو بالاتر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ انفرادی روح اور اجتماعی حیات پر مردنی چھا جاتی ہے۔ اس نکتہ کو سامنے رکھ کر انبیاء اور اولیاء کے احوال کو پرکھنے کی کوشش کی جائے تو معلوم ہوگا کہ کوئی نبی اپنی عبادت سے تشفی نہیں پاتا، اس میں ہمیشہ ناتمامی کا احساس رہتا ہے۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتا ہے کہ اے اللہ مجھ سے تیرا حق ادا نہیں ہو سکا۔ یہی وہ فقید المثال اور جیتا جاگتا تجربہ ہے جو تمام اعمال و عبادت کو حق کا اشارہ و علامت بنا دیتا ہے۔ نبی میں یہ تجربہ بے مثال بلندیوں پر ہوتا ہے اور زاہد خشک یا نرے ملا میں اس کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

بہر حال اگر اس عالم کو عالم صورت کہا جائے تو اصلی عالم، عالم معنی ہے۔ اس عالم صورت کا جواز ثابت ہی اس بات سے ہوتا ہے کہ یہ عالم معنی کسی مسلسل بلکہ لامتناہی اشارہ پر مشتمل ہے۔ ہماری تمام شریعت، ہمارے تمام قوانین، معاشری رسوم، غرض انسانی دنیا کی تمام اشیاء عالم صورت کی رکن ہیں اور اسی وجہ سے ان کا وظیفہ عالم معنی کا اظہار رہے۔ تمام رمزیت اور اشاریت کی بنیاد میں یہی فلسفہ ہے۔ جب صورتیں معنی سے منقطع ہو جاتی ہیں تو بت پرستی شروع ہو جاتی ہے۔ خلیفہ صاحب اس مقام پر پھر مولانا روم کا حوالہ دیتے ہیں۔ ''صورتوں کو مستقل حقائق سمجھنے سے انسان بت تراش و بت پرست ہو جاتا ہے۔ صورتوں کو معنی کے جام سمجھنا چاہئے، بادہ نوش کی غرض شراب سے ہے نہ کہ جام سے۔

زیں قدمہائے صور کم باش مست
تا نگردی بت تراش و بت پرست
از قدمہائے صور بگزر ماایست
بادہ در جام است لیک از جام نیست [۲۵]

خلیفہ عبد الحکیم ایک نئے شعور کا نشان ہیں جس کی پہنائیاں ابھی پورے طور پر واضح نہیں ہو سکی ہیں۔ ظاہراً ان کے کئی منصب ہیں۔ وہ شارح ہیں، قرآن مجید اور حدیث رسول کے ترجمان ہیں۔ وہ ان منتخب انسانوں میں سے ایک ہیں جو اس گہرائی تک پہنچ چکے تھے جہاں سے مثنوی مولانا روم کے سوتے پھوٹتے ہیں۔ پھر وہ ان وادیوں میں بھی گھوما کیے ہیں جو ''انا البحر'' کے ان مقامات سے ہیں جہاں غالب نغمہ سنج ہوتا ہے

ہم ہیں تو راہ میں ہے سنگ گراں اور

پھر وہ اقبال کے بھی ہم سفر ہیں:

یک دست جام بادہ و یک دست زلفیار
رقص چنیں میانہ میدانم آرزوست

خلیفہ عبد الحکیم کے ان سارے تجربات کا حاصل، ان تمام باطنی وارداتی کی غواصی کا مال کار، فکر کا وہ گہرا آبدار اور معرفت کا وہ درشہوار ہے جسے تصور ''رحمت اللعالمین'' کی تفسیر کہیں تو بجا ہے۔ خلیفہ صاحب کا اصول آفاقی اقدار کی تاسیس ہے جن کی ضیاء پاشیوں میں وہ انسانوں کے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی مسائل کے حل کرنے کا راستہ دکھاتے ہیں۔

(۱)

حسب عادت لوگ پوچھا کرتے ہیں کہ خلیفہ صاحب کا فلسفہ کیا ہے؟ اس سوال کا جواب قدرے تفصیل چاہتا ہے، اس لیے کہ ہماری روایات میں وہ اصطلاح ہی موجود نہیں جو خلیفہ صاحب کے فلسفہ پر چسپاں ہو سکے۔ مولانا روم کا قصہ بڑے مزے سے خلیفہ صاحب بیان کرتے تھے کہ ایک مرتبہ مولویوں نے آپس میں گٹھ جوڑ کر کے ایک ملا کو ان کے پاس مجادلہ کے لیے بھیجا۔ ملا نے ان سے پوچھا کہ اسلام کے بہتر فرقوں میں آپ کس سے متفق ہیں؟ مولانا روم نے جواب دیا کہ پورے بہتر فرقوں سے۔ وہ ملا صلواتیں سنانے پر اتر آئے۔ کہنے لگے آپ ملحد و دھریہ معلوم ہوتے ہیں۔ مولانا نے ہنس کر جواب دیا کہ میں اس سے بھی متفق ہوں۔ کچھ یہی حال خلیفہ صاحب کا بھی تھا۔ وہ فلسفہ کے بہتر فرقوں سے متفق تھے۔ سب مدرسہ ہائے فکر ان کے اپنے تھے اس لیے کہ وہ زندگی کو اصل قرار دیتے ہیں اور تمام فلسفے مختلف اطوار سے زندگی ہی کی خوشہ چینی ہیں۔

36

خلیفہ عبدالحکیم کا فلسفۂ عمومی

عبدالحمید کمالی

خلیفہ عبدالحکیم کے افکار میں باطنی وحدت کی تلاش بہت مشکل ہے اور اس سے زیادہ مشکل ان کی کلیت کی یافت ہے۔ وہ ان ارباب نظر میں سے ہیں جن کے اقتراب میں فکر کے روایتی سانچے کارآمد نہیں ہوتے اور پابند رسوم شعور کے لیے نئے سانچوں کا تجربہ آسان نہیں ہوتا یہاں تک کہ نیا زمانہ آتا ہے جو نئے شعور کے ساتھ ان تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہے۔ آخر کوئی نہ کوئی زمانہ ان تجربات کی گہرائی تک پہنچ جاتا ہے اور اس باطنی وحدت کو پالیتا ہے جس سے اس فیلسوف، شاعر یا حکیم بے بدل کا انشراح قلب ہوا تھا۔ اس طرح ہماری ہر سعی سچ پوچھئے تو ایک سعی مسلسل کا حصہ ہے جس میں نسلوں کی نسلیں شریک ہیں اور اسی سعی مسلسل میں ہم افکار کے ان بلند پرواز دیوتاؤں کے زیر عنوان دراصل خود بھی نئے حقائق کا تجربہ کرتے رہتے ہیں۔ یہی ان کی عظمت کا راز ہے۔

بندی و نظام سازی سب زندگی کے مظاہر یا آثار ہیں، اس لیے زندگی کا مقولہ ہی کل فلسفہ کی کلید ہے؛ اساس بھی یہی ہے اور انتہا بھی یہی ہے۔

(۲)

سوال یہ ہے کہ کیا زندگی بحیثیت ایک تصور عام مرکب ہے یا بسیط؟ تمام فلسفوں کا عرصہ دراز سے یہ مسلک ہے کہ وہ تمام حقائق کی تشریح سادہ یا بسیط ترین تصورات سے کرتے ہیں۔ یہ سوال بھی دراصل اسی مسلک کا غماض ہے۔ اس مسلک کو آپ دیما قریطی روایت بھی کہہ سکتے ہیں۔ دیکارت نے اس کو بحیثیت منہاج یوں زندہ کیا کہ جب کوئی ''معطیہ'' شعور کے سامنے ہو تو اس کو تحلیل کرو، ٹکڑا دن ٹکڑوں میں بانٹو یہاں تک کہ ایسے اجزاء تک پہنچو جن کی مزید تحلیل نہ ہو سکے۔ یہی سادہ ترین عناصر یا بسیط تصورات ہیں۔ اشیاء کو سادہ ترین اجزاء میں تحویل کر کے سمجھنا ایک علمی طریق ہے یعنی یہ ایک اسلوب ہے جس کے ذریعے انسان معلومات حاصل کرتا ہے۔ مگر اس سے بہت سے فلسفے اس گمراہ کن مغالطے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ اشیاء کی ماہیت یا کائنات کی حقیقت بھی اسی اسلوب کی پابند ہے۔ بالفاظ دیگر ہمارا طریق علم، وجود کائنات کا بھی آئین ہے۔ چنانچہ جن بسیط تصورات میں ہم اپنے معطیات علم کی تحویل کرتے ہیں وہ مبادی کائنات ہیں، ان معطیات و اشیاء سے متقدم اور برتر ہیں جو ہمارے ادراک میں آتی ہیں۔ چنانچہ تمام سیر فی الوجود میں یہ قائم و دائم حقائق ہیں حالانکہ بات صرف اتنی ہے کہ ''تحویل در عناصر بسیط'' انسانی فہم و استفہام کا ایک اسلوب ہے جس سے زیادہ سے زیادہ انسانی شعور کے بارے میں تو روشنی پڑ سکتی ہے مگر خود اسلوب وجود کے بارے میں کوئی امر منور نہیں ہوتا۔

لیکن اسی مغالطے میں آ کر کہ تجزیہ کے عناصر بسیط خود کائنات کے بھی عناصر قوام ہیں بہت سے نظریات اس طرف گئے ہیں کہ یہ اجزاء پہلے ہیں اور اس کے بعد وہ اشیاء وجود میں آئی ہیں جن کے وہ اجزاء ہیں۔ چنانچہ جب انسان خود زندگی پر تحلیلی اسلوب سے نظر ڈالتا ہے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ زندگی ایک بہت عظیم مرکب ہے اور جب اس اسلوب کو مابعد الطبیعی رنگ دیتا ہے تو یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ اجزاء زندگی سے قبل ہیں، وہ اس سے پیشتر موجود تھے اور پھر ان کے تواصل و تعامل سے زندگی نمودار ہوئی ہے چنانچہ ارتقائے کائنات میں یہ آخری

خلیفہ صاحب ''فلسفہ زندگانیت'' کے داعی ہیں۔ زندگی اصل ہے اور تخیل، ارادہ، شعور، نفس، روح، جسد، حرکت، زمان، مکان، مادہ اور معطیات حواس سب اس کے برگ و بار ہیں۔ چنانچہ محسوسات پر جو فلسفہ استوار ہوتا ہے یعنی ہیوم و ماج کی ''ہمہ ارتسامیت'' یا باقلانی اور اشعری کی ''زراتیت'' خلیفہ صاحب اس سے بھی متفق ہیں۔ اسی طرح ارادہ پر جو فلسفہ قائم ہوتا ہے خلیفہ صاحب اس سے بھی متفق ہیں۔ شعور پر جس فلسفہ کی بنیاد ہے یعنی تصوریت یا روحانی تجربیت خلیفہ صاحب اس سے بھی متفق ہیں۔ خلیفہ صاحب بیک وقت افلاطون و ارسطو، کانت و ہیگل، ابن سینا، غزالی و برگستان اور ولیم جیمیز، ہیرا قلیطس اور ابن العربی، حافظ اور ٹینی سن، رازی اور آئن سٹائن سب سے ہی یگانگت محسوس کرتے ہیں کیونکہ ہر ایک زندگی کے کسی نہ کسی پہلو، داعیہ یا اعتبار کی بزم آراستہ کرتا ہے۔

وہ تمام فلسفے جو حیات کے کسی ایک اعتبار کو کس ہستی اور وجود پر پھیلا دیتے ہیں جزو کو کل سمجھنے کے مغالطہ کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ زندگی ہی ہے جس میں حرکت یا فعل پایا جاتا ہے اس لیے محض حرکیت کے فلسفے بھی جزوی فلسفے ہوتے ہیں۔ وہ زندگی ہی ہے جس میں شعور و علم پایا جاتا ہے اس لیے کائنات کی تعمیر ''عالم اور معلوم'' سے کرنے والے فلسفے جن کے علمبردار ملا جامی بشپ برکلے اور عبد الماجد دریا بادی ہیں بعض پہلوؤں کی شیراہ بندی تو کر سکتے ہیں مگر نقد وجود کی گرد تک کو نہیں پہنچ سکتے۔ اسی طرح شوپن ہاور کا ''ارادہ عنان گسیختہ''، نطشے کا ''جلال شمشیر بکف'' اور برگستان کا ''حیشان ناصبور'' بھی جزو پرستی میں کہیں کھو گئے ہیں۔ خلیفہ صاحب کا مسلک ان فلسفوں کا ابطال نہیں بلکہ ان کی جزئیت سے ارتفاع ہے۔ چنانچہ وہ ان میں حقانیت کے اجزاء تلاش کر ہی لیتے ہیں اور اسی لیے ان کے منہاج میں ایک ہمہ گیری ہے، روا داری ہے۔ جب وہ رد و قدح بھی کرتے ہیں تو سب مکتبوں سے اپنائیت ہویدا ہوتی ہے اور اسی لیے ان کے فلسفہ زندگانیت میں بھی سب فلسفوں کی شیرازہ بندی، ہم آہنگی اور موازنت نظر آتی ہے۔

وہ اس معاملہ میں قطعی اثباتی انداز رکھتےہیں کہ خود زندگی کو اصل و جوہر سمجھا جائے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خود ہستی باری کے لیے جو ہم حیؔ قیوم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ان کا موضوع خود عین ذات مطلق ہے۔ روح نباتی، روح حیوانی اور روح عقلی خود زندگی ہی کے تجریدات یا مشخصات ہیں۔ خواہش و عمل، تعقل و آگہی، تخلیق و مشیت، صنعت و ابداع، ضابطہ

شئے ہے۔ تموج، اضطرار، حسیت، حرکت، شعور وغیرہ وغیرہ زندگی کے اجزاء ہیں جو ایک بعد دیگر حیاتی ارتقاء میں نمودار ہوئے ہیں۔ پھر یہ اجزاء خود بھی دیگر سادہ عناصر میں تحویل ہو جاتے ہیں۔ اسی مغالطہ کا اثر ہے کہ شعور وارادہ ایسے حقائق معلوم ہوتے ہیں جو ارتقائے کائنات میں آخری مظاہر بنتے ہیں۔ مادی فلسفے ہی اس مغالطہ کا شکار نہیں ہوئے بلکہ روحانی فلسفے بھی مثلاً ہیگل کا یہ خیال کہ انائے مطلق کا ظہور ارتقاء کی آخری منزل ہے، اسی تحلیلی اسلوب کی مابعد الطبیعیاتی تعبیر ہے یا یہ خیال کہ خدا مستقبل کی بات ہے، جیسا کہ الیگزینڈر کا نظریہ ہے، اسی مغالطے کا ترجمان ہے۔ اگر اور زیادہ اوپر جائیں تو حقیقت سادہ میں انا کی نمود جو ویدانتی فلسفوں میں عالم سرمدی و نروان سے متاخر ہے وہ بھی اسی نقطہ نظر کی غماض ہے کہ تحویل در بساطت علمی اصول ہی نہیں وجودی اصول بھی ہے۔ زندگی کو سارے ارتقاء کا حاصل سمجھنا اور تمام ارتقائے وجود میں سادہ ترین عناصر سے حیات کا نمود، پھر شعور کا، پھر نفس کا، پھر روح عالم کا ظہور اصول تحلیل کو اصول وجود قرار دینا ہے جو دور جدید کے اکثر مادی اور روحانی فلسفوں میں قدر مشترک ہے۔

خلیفہ صاحب کا فلسفہ زندگانیت اسی مغالطہ پر ضرب کاری لگاتا ہے۔ وہ جب خود زندگی کو اصل قرار دیتے ہیں تو خود زندگی ہی تمام موجودات سے متقدم حقیقت قرار پاتی ہے۔ چنانچہ یہ صرف ایک علمی طریق ہے کہ جب ہمارا شعور خود زندگی کو ''معطیہ علم'' بناتا ہے تو وہ ہمیں بے شمار اجزاء میں قائم معلوم ہوتی ہے۔ کبھی تو ایک نقطہ منورہ میں کہ انا ہے، کبھی ارادہ میں، کبھی نیت میں، کبھی خواہش میں، کبھی حرکت میں، کبھی تخیل میں، بلکہ بیک وقت ان سب میں۔ اس سے یہ سمجھنا کہ زندگی ان سب سے آخر میں آنے والی شئے ہے محض ایک مغالطہ ہے، طریق علم کو طریق وجود سمجھنا ہے۔ یہی مغالطہ ویدانت میں ہے، دیما قریطس میں ہے، دیکارت میں ہے، تصوریت مطلقہ میں ہے اور آج کل کے نظریات ارتقائے بارز میں ہے۔

خود زندگی کیا ہے؟ یہ حیات سے بالاتر شئے ہے۔ حیویت تو نباتات میں بھی پائی جاتی ہے اور تغذیہ نمود و باز آفرینی کے وظائف انجام دیتی ہے۔ شعور وخواہش تو حیوانات میں بھی ہیں جو غضب وشہوۃ کی قوتوں کے زیر اثر متحرک ہوتے ہیں۔ البتہ انسان میں ایک امر زائد معلوم ہوتا ہے اور وہ ہے انا کی فعالیت۔ یہاں ہمیں زندگی سے سابقہ پڑتا ہے۔ خلیفہ صاحب کے نظریہ کے مطابق یہ محض انا اور انانیت نہیں بلکہ ''انا در جستجوئے کوئے یار'' بھی ہے،

مقولات کا پابند ہے۔ چنانچہ جب خود وجود انسانی کے معطیات پر اہل زندگانیت کی نظر جاتی ہے تو یہ مقولات شعور کے ملکات بن جاتے ہیں اور زندگی کے معطیات خود زندگی ہی کے واسطے سے سمجھ میں آتے ہیں۔ ہوالاول کے تحت وہ تاریخ کی صورت میں منظم ہوتے ہیں، ہوالاخر کے تحت ان کی قدریات کی تدوین ہوتی ہے، ہوالباطن کے تحت ان کی نفسیات اور ہوالظاہر کے تحت ان کی طبیعیات مرتب ہوتی ہیں۔ زندگی اس لیے صرف ایک ایسے جامع شعور کی معروض بن سکتی ہے جو بیک وقت تاریخ (زماں)، عیار (تقدیر)، معنی (روح) اور صورت (ہیئت طبیعی) کا درک کر سکے۔ ان میں سے ہر ایک زندگی کی تجرید ہے چنانچہ ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ اثبات ہوسکتا ہے، مگر درک نہیں ہوسکتا۔

(۳)

تاریخ فکر پر اگر تامل کیا جائے تو یوں محسوس ہوگا کہ یونانی فلسفہ سے عہد متوسط تک ہوالاخر کے مقولے کا دور دورہ رہا ہے۔ ہر امر کی تعبیر مقصدیت سے کی گئی۔ اس انداز تفکر کی کوتاہیوں سے جو تضاد پیدا ہوتے تھے ان کے سبب آہستہ آہستہ شعور ''الموجود'' کی طرف مبذول ہونے لگا۔ چنانچہ ظاہر و باطن کے مسائل زیر بحث آنے لگے۔ لیکن آخر کار مقولہ ''الظاہر) نے فوقیت حاصل کی اور تمام علوم کی تدوین مسلک کے طور پر اسی مقولے پر ہونے لگی۔ اس کا شدید ردعمل لازمی تھا۔ چنانچہ انیسویں صدی کے نصف آخر سے مغرب میں دبستان زندگانیت کے نام سے اس ردعمل نے باضابطہ شکل اختیار کر لی۔ خلیفہ صاحب کے فلسفہ زندگانیت اور یورپ کے اس مکتب زندگانیت میں جو قدر مسترک ہے وہ یا تو صرف نام کا اشتراک ہے یا صوریت کے خلاف بغاوت۔ یہ مبحث قدرے تفصیل کا محتاج ہے تاکہ خلیفہ صاحب کے افکار کی ندرت کا خاطر خواہ اندازہ ہوسکے۔

پورا جرمن فلسفہ انیسویں صدی کے وسط میں وجود اور صورت کے مسئلے سے نبرد آزما تھا۔ افکار کی اس رو میں اس مسئلے کا یوں تصفیہ ہوا کہ وجود پر صورت نے فتح حاصل کی اور المانوی فکر ''کیا ہے؟'' کے سوال سے گزر کر ''کیسا ہے؟'' کے سوال پر مرتکز ہوگئی۔ یہی ''صوریت'' ہے جو ہیگلیت کے زوال کے بعد سب سے زیادہ طاقتور تحریک کی حیثیت سے تمام المانوی افکار پر چھا گئی۔ اس سے پیشتر کانت نے وجودیات کے امکان سے انکار کیا تھا

احساس قدر سے اس کا وجود تابناک ہے، ہجر سے اس کا سینہ چاک چاک ہے۔ سوز دروں سے نالہ خروش ہے، ان دیکھے کے لیے اس میں تڑپ ہے۔ یہ زندگی ہے اور خلیفہ صاحب کے نزدیک زندگی ہی تمام فلسفہ کی اساس اور اس کی انتہا ہے۔ شعور انسانی کو اپنے منہاج و اسلوب سے ماورئ ہونا بھی سیکھنا چاہئے۔ جب وہ خود اپنی ہی روایت و عادت کو ترک کرنا سیکھ جائے تو حقیقت وجود اس پر منکشف ہوسکتی ہے۔ جب وہ یہ جان لیتا ہے کہ ''تحویل در بساطت عین وجود نہیں بلکہ خود اس کے اپنے شعور کا تعین ہے تو وہ اس کا آسانی سے اقرار کرسکتا ہے کہ زندگی ''ارتقائے کائنات'' میں آخری مظہر نہیں بلکہ متقدم حقیقت ہے۔ اپنے اس اقرار میں وہ ذات باری کے وجدان و اثبات سے قریب ہو جاتا ہے۔ خدا کوئی مستقبل کی شئے نہیں، اس کی مطلقیت کسی ارتقاء و بروز کا حاصل نہیں بلکہ وہ سراپا قائم و دائم حقیقت ہے۔ وہ ایسی زندگی ہے ازل و ابد جس کی شانوں میں سے صرف دو شانیں ہیں۔ وہ ''انا'' ہے...... یہ اس کی ایک شان ہے۔ وہ غیر انا ہے...... یہ اس کی ایک دوسری شان ہے۔ وہ شعور ہے، وہ ارادہ ہے، وہ عمل ہے، وہ قدر ہے اور احساس قدر ہے، ہستی ہے اور محسوس ہے، وجود ہے اور موجود ہے، آرزو ہے اور احساس قدر ہے، ہستی ہے اور محسوس ہے، وجود ہے اور موجود ہے، آرزو ہے اور تکمیل آرزو، خواہش ہے اور تسکین ہے۔ غرض وہ زندگی ہی زندگی ہے اور سب کچھ زندگی سے متاخر ہے۔ پھر سب سے آخر میں بھی زندگی ہے۔ ہر شان کا مال کار خود زندگی ہی ہے۔ اسی طرح ہر شان میں ظاہر تو خود زندگی ہی ہے اور ہر شان میں باطن بھی زندگی۔ فلسفہ زندگانیت کا اسلوب علمی تحلیل و تجزیہ سے زیادہ لطیف ہے۔ اس کا منہاج ہے ہو الاول و الاخر و الظاہر و الباطن۔

جس حقیقت پر یہ چاروں مقولات، اول و آخر، ظاہر اور باطن صادق آئیں وہ زندگی ہے۔ جدید سائنس کے معطیات پر صرف ''ہوالظاہر'' کا مقولہ ہی صادق آتا ہے۔ چنانچہ یہ زندگی سے فروتر ہیں۔ برگسانی مسلک اور وجودیت کے معطیات پر ''ہوالباطن'' کا مقولہ صادق آتا ہے چنانچہ وہ بھی زندگی سے فروتر ہیں۔ اسی طرح دہریت اور مادی جدلیت کے معطیات پر ''ہوالاول'' کا اصول صادق آتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ ''ہوالاخر'' کیا ہے؟ ٹھیک اسی طرح غایات زدہ نظریات میں ''ہوالاخر'' کے مقولے کے سوا کسی کا اعتراف نہیں چنانچہ وہ بھی زندگی سے عاری ہوتے ہیں۔ فلسفہ زندگانیت اپنے طریق علم میں ان سب

اور اس انکار سے لامحالہ ''صوریت'' ہی علمی مسلک قرار پا سکتی تھی۔ کا نظام اس طرح پیش کیا کہ معلوم ہوتا تھا کہ فکر میں انقلاب آ گیا۔ مگر طلسم سامری کی طرح ہیگل کا یہ دور جلد ہی ختم ہو گیا۔ ارباب نقد و نظر نے دیکھا کہ ہیگل کی ساحرانہ فکر میں خود صوریت پوشیدہ ہے چنانچہ اس کے ہاں وجود کا معقول ہونا خود وجود کو صورت تعقل کے تابع بتاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب انتقاد و تفحص سے ہیگل کی صورت پرستی واضح ہونی شروع ہوئی تو لوگ کانت کی طرف پھر متوجہ ہوئے۔ اب کانٹیت کے عروج کا زمانہ آیا۔ تمام افکار صوریت میں رنگے گئے۔ فکر کے وہ زاویے بھی جن کے بارے میں کانت نے اپنے نظریات کا اطلاق نہیں کیا تھا صوریت کی زد میں آ گئے یہاں تک کہ ''صوریت'' تمام حکمت و فلسفہ کا نقطہ ماسکہ بن گئی۔ راقم الحروف نے اس سارے نشیب و فراز اور تغیر و تبدل میں جو بات مشاہدہ کی ہے وہ یہ ہے کہ صوریت اپنی انتہائی شکل میں ایک ایسا بھرپور فلسفہ ہے جو ''کیا ہے؟'' کا جواب ''کیسا ہے؟'' سے دینا چاہتا ہے۔ اس کی تمام دلچسپی ''ماہیہ'' سے ہے چنانچہ خود ''مافیہ'' کو بھی یہ ''ماہیہ'' سے ماخوذ کرنا چاہتا ہے۔

المانوی افکار میں صوریت میں مزید بروز واقع ہوتا ہے اور وہ ''مکتب قدر'' میں نشاۃ پذیر ہوتی ہے۔ یہ بروز اس کا اگلا قدم ہے جس میں وہ ''تمام وجود'' میں ''صورت کلی'' کی تحقیق یافت و اثبات کو حاصل علم قرار دیتی ہے۔ چنانچہ حقیقت و مجاز کا امتیاز ''صورت کلی'' سے عینیت یا اختلاف میں تلاش کرتی ہے۔ ''صورت کلی'' سے مراد ایسی صورت کا حصول ہے جس کو بلا تضاد تعمیم دی جا سکے۔ اس تعمیم سے انحراف کو یہ فلسفہ سیمیائی نمود گزشتن، مجاز، مایا، فریب اور اسی قبیل کے مراتب سے نوازتا ہے کہ اس مذہب میں ''عموم'' کے اثبات میں ''منفرد'' پر خط تنسیخ پھیر دیا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے نقطہ نظر سے ہر علم محض قدر یعنی کلی کے اتباع پر مشتمل یا منحصر ہے۔ ہر وہ منطقی حکم جس کو بلا تضاد تعمیم مل سکے حکم حق ہے، عین قدر ہے اور ہو المطلوب ہے۔ پس اس مسلک میں ''شعور'' ''وقوف'' اور ''آ گہی'' بھی بذات خود کوئی امر ایجابی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کسی شئے کا ذہن کے لیے حاضر ہونا ہے۔ بلکہ صرف عینیت بالکلیت ہے، استقرار فی العموم ہے۔ وحدت، عمومیت، دوام، یہ ازلی و ابدی اقدار ہیں۔ وقوف میں ان ہی اقدار کا نام صداقت ہے۔ عمل میں یہی خیر ہیں، تحسین میں یہی جمال ہیں۔ مذہب قدر میں ہر دائرہ کا انکار ہے کیونکہ سب کچھ قدر میں تحویل پذیر ہے۔ دیکھا جائے تو یہ

موضوعیت کے اس سیلاب میں سرمایہ حیات لگانے کے لیے آمادہ نہیں جس میں کسی معروضیت کی گنجائش نہیں۔ وہ اس مغربی دبستان زندگانیت کے ہمنوا نہیں ہیں جو کیف وجود میں غرق ہو کہ ہر برہان و دانش سے فرار اختیار کرتا ہے۔ ان کے فلسفہ زندگی میں باطن ہے تو اس کے ساتھ ظاہر بھی ہے۔ وہ پست کو پوست ہی کہتے ہیں اور مغز بغیر پوست کے رہ نہیں سکتا۔ زندگی مافیہ ہے مگر ہر مافیہ ماہیہ کا محتاج ہے۔ جرمن قدر پرستی کا قصور یہ تھا کہ اس نے اپنی دنیا بلا مافیہ تعمیر کرنی چاہی تھی اس لیے اس کی تعمیر کو منہدم ہو جانا چاہئے تھا۔ مغربی مغز پرستی یا موضوعیت جے زندگانیت کے فلسفے کا دلفریب نام دیا جاتا ہے اور آج کل وجودیت کہا جاتا ہے اس کا قصور یہ ہے کہ بغیر صورت اور ہیئت کے محض ''کیفیت'' کو زندگی سمجھتی ہے۔ یہ روح بلا جسد ہے اس لیے زندگی نہیں، محض تاثر یہ جذبہ ہے، جوش یا ہیجان ہے، عقل و دانش نہیں۔

خلیفہ صاحب کا فلسفہ ظاہر اور باطن، مافیہ و ماہیہ، عشق و عقل، طریقت و شریعت ان سب میں توازن چاہتا ہے کیونکہ عموم کا وجود خصوص کے وجود سے ہی ثروت پاتا ہے، معطیہ صورت سے ہی متجلی ہوتا ہے، طریقت کو شریعت میں ہی ثبات ملتا ہے۔ دوسری طرف قانون و آئین خود زندگی سے ہی بامعنی ہوا کرتے ہیں۔ یہ زندگی ہے جو دونوں رخوں میں اصل واحد ہے۔ فلسفہ زندگانیت خلیفہ صاحب کے ہاں ایک ایسا اعتدال آفرین رجحان اختیار کرتا ہے جس میں صورت کی رونق معنی سے قائم اور کیفیت ہیئت کی رگ جان ہے۔ ظاہر اور باطن کی اس موافقت سے زندگی کے خور کی تشکیل ہوتی ہے۔ خلیفہ صاحب فرماتے ہیں کہ ''حکمت مظاہر و صور میں معنی کی تلاش ہے۔''

مولانا روم کے ہمنوا ہو کر وہ کہتے ہیں کہ ''جس طرح ہر ظاہر کا باطن ہوتا ہے اسی طرح ہر باطن کا ظاہر بھی ہوتا ہے، اس لیے عالم خلق میں صورت سے گریز نہیں۔'' خلیفہ صاحب اپنی تصانیف میں ہو الظاہر اور ہو الباطن کی نامیاتی وحدت کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ یورپی وجودیتی اور موضوعی تحریکوں سے ان کا فلسفہ ایک شان کے ساتھ منفرد و ممیز نظر آتا ہے۔

(۴)

خلیفہ صاحب کے افکار کو اختصار کے ساتھ یوں رقم کیا جا سکتا ہے کہ ان کے خیال

ملک وحدت الوجود کا سب سے زیادہ جدید ور اچھوتا شمارہ ہے جس کے اندر ہر مخصوص ومنفرد حالت وکیفیت، رنگ ومزہ کا پورا پورا سقوط ہو جاتا ہے۔ اس کے اندر کوئی التہاب نہیں جوش نہیں۔ دریائے وجود پر عمومیت کا راج، ہر طرف بے رنگی ہے، سکوت ہے۔

المانوی قدر پرستی کا یہ فلسفہ مقولہ ''ہوالظاہر'' کی عقلی تفسیر ہے۔ یونانی غائیت پرستی تو ''ہوالاخر'' پر قائم تھی اور یہ ہوالظاہر پر مگر اس اصول کے ساتھ کہ اس میں صرف اسی ظاہر کو قدر وعیار کا درجہ دیا گیا ہے جس میں تعمیم مطلق ہو۔ اسی سبب سے قدر اپنی ذات میں واحد ہی ہوسکتی ہے۔ علم سے لے کر اخلاق وآرٹ میں ہر عمل کا یہی اصلی موضوع ہے۔ عموم کی ترازو میں ہر شئے تلتی ہے، کسی جذبہ یا خطرہ، تقابل یا تعامل کو کوئی اہمیت حاصل نہیں، کسی وجود کی کوئی ہستی نہیں، سب کچھ اسی واحد کے تابع ہے۔ قدر مطلق ہی ہر ایک کا معیار ہے چنانچہ ہر بات کا تصفیہ اس کی صورت سے ہوگا، اس کا باطن نہیں دیکھا جائے گا۔ اس کی گہرائی کی بجائے اس کی تعمیم پر نظر ہوگی۔ تمام تاریخ، تمام انسانی جدوجہد، تمام حرکت وعمل، تمام علم و عرفان سب کا یہی معیار ہوگا۔

المانوی قدر پرستی کو آپ ہمارے ہاں کے علماء ظاہر پرست کے غلو سے سمجھ سکتے ہیں اور اس غلو کے ردعمل سے بھی آپ واقف ہیں کہ فرقہ ملامتیہ کا ظہور ہوا۔ بادہ نوش، رند مشرب، قلندر صفت لوگ پیدا ہوئے۔ عام انسانوں نے انہیں کے دامن میں پناہ لی۔ جرمن فکر کے اس دور میں بھی یہی ہوا۔ قدر کا پیمانہ ٹوٹ گیا اور لوگ کیف پرستی پر ٹوٹ پڑے۔

زندگی اور جذبہ، حال وکیفیت، مستی وبے خودی، شخیت وخودی، اپنی ذات اور اپنا ذوق، اپنا مزاج اور اپنی واردات؛ اب ان معطیات، ان کی ماعیت، ان کی غواصی کو علم وعمل، آرٹ اور وجدان کا موضوع قرار دیا جانے لگا۔ اس سے جرمن مسلک زندگانیت پیدا ہوا جس کا ایک عظیم شارح ڈلتھائے ہے۔ ''ہوالباطن'' نے ''ہوالظاہر'' کو تار تار کر دیا۔ نطشے اور برگستان اسی سیل حوادث کی پیداوار ہیں۔ عقل اور اس کے مقولات کی مذمت، حال اور اس کی کیفیات کی پرستش...... یہ ارتقائے فکر میں بار پاتی گئیں۔ اب ان سب تحریکات کی آماجگاہ وجودیت ہے جس کے اندر ظاہر، ناموس، عموم، دستورالعمل، ضابطہ عام، یکسانیت وغیرہ وغیرہ کے خلاف بے تحاشا مواد ہے۔ مگر یہ ہے ردعمل ہی جواب تک کوئی تعمیری فلسفہ نہ بن سکا۔

خلیفہ صاحب کو مغربی فکر کے اس اتار چڑھاؤ سے گہری ہمدردی ہے مگر وہ

میں زندگی کا ایک باطنی رخ ہے جو روحانی معطیات پر مشتمل ہے۔ لیکن اسی زندگی کا ظاہری رخ بھی ہے جو ثقافتی اور تمدنی معطیات پر مشتمل ہے۔ ارباب وجودیت کے ہاں ظاہر اور خروج محض پھیلاؤ ہے۔ اس کی ماہیت عدم وجود ہے جو زندگی کو پارہ پارہ کرنا چاہتا ہے۔ چنانچہ زندگی امتداد کی قوتوں کے خلاف باطن کے عمق میں اپنے آپ کو مجتمع کرنے پر قائم ہے۔ کیفیت میں ڈوبا رہنا اس کا وجود ہے اور اس کی شدت میں محو و مست غرق ہونے سے اس کا استحکام ہے۔ خلیفہ صاحب اس موضوعیت پرستی کے خلاف ہیں۔ وہ خروج کرنے اور پھیل جانے کی تعلیم دیتے ہیں۔ وہ زندگی کے خارج کظ ثقافتی مظہر قرار دیتے ہیں جہاں عدم کا اندھیرا نہیں بلکہ وجود کا میخانہ ہے۔ یہ صحیح ہے کہ زندگی اپنے باطن میں حال اور کیفیت ہے لیکن یہ باطن ''ہوالظاہر'' میں آکر ثقافت بن جاتا ہے۔

انفرادی زندگی کا باطن ادعائے انا اور اس کا ظاہر ''شخصیت'' ہے۔ زندگی پر اندر سے نظر ڈالیں تو یہ ''خودی'' معلوم ہوتی ہے اور اگر باہر سے اس پر نظر کریں تو ''شخصیت'' معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے وہ حکماء جنہوں نے اپنے فلسفہ کا سنگ بنیاد انفرادی زندگی پر رکھا تکمیل خودی یا تعمیر شخصیت کو مقصود قرار دیتے ہیں۔ ایسے حکماء کا تعلق روحانی کثرتیت کے مسلک سے ہوسکتا ہے جیسا کہ جیمز وارڈ اور میکٹا گرٹ تھے۔ ان حکماء کے سامنے آخری یا انتہائی سطح نظر صرف شخصیت کا اثبات ہوسکتی ہے۔ اس سے آگے کسی مقولہ وجود کی سن گن ان میں نہیں ہوتی۔ چنانچہ ان کے شعور کی پیشرفت صرف انفرادی دائرہ کے اندر ہی گشت کرتی رہتی ہے۔ ایسے حکماء میں برطانوی افادیت پسندوں سے لے کر عصر حاضر کے وجودئین بھی شامل ہیں۔ ان لوگوں سے ذرا بلند حکمائے وحدت الوجود ہیں...... بلند ان معنوں میں کہ ان کا مسلک انفرادیت پسندوں کے مقولہ کی تعیم سے خود بخود منطقاً حاصل ہوتا ہے۔ ان کے مسلک کے جدید نمونے مغرب میں براڈلے، بوسانکے، کروچے، جنٹائل وغیرہ ہیں۔ ہندو پاکستان میں حسن نظامی، ذوقی شاہ وغیرہ ہیں۔ ان کے نظریات کے بموجب تمام ہستی اپنے باطن میں ایک واحد انائے مطلق ہے اور ظاہر میں کائنات ہے۔ بالفاظ دیگر تمام کائنات کا مرتبہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ الٰہی شخصیت ہے یعنی اس انائے مطلق کا خارجی نظام وجود۔ جہاں انفرادیت پسندوں کا آخری مقولہ ''شخصیت'' ہے وہاں ان وحدیت پسندوں کا بھی یہی مقولہ ہے، صرف تعمیم کا فرق ہے۔ دونوں مکاتیب تصور ''شخصیت'' سے ایک قدم آگے نہیں جاتے۔

آگے مقامات اور بھی ہیں ورنہ یہ سارا عالم ایک کھلا ہوا دفتر ہے۔

خلیفہ صاحب اناؤں کے روشن چراغوں کی کثرت کو ایک حقیقت قرار دیتے ہیں جن کے نور واحد سے زندگی کا باطن منور ہے۔ اس کثرت کی بنیاد ''غیب'' میں ہے اس کا کیوں اور کیا ایک الٰہی راز ہے۔ اس بارے میں ابن سینا نے بھی کچھ اشارات کیئے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب سالک اعلیٰ ترین مقامات تک پہنچ جاتا ہے تو وہ عاجز آجاتا ہے۔ من وتو کا اثبات تو کرتا ہے مگر اس امتیاز کی لم اس کے دائرہ ادراک میں نہیں آتی۔ وحدت میں کثرت کی اور کثرت مس ی وحدت کی لپک جھپک ہوتی رہتی ہے۔ اقبال فرماتے ہیں یہ متناہی خودیوں کا وجود، محدود مراکز شعور کی کثرت، یہ ایسی آخری حقیقتوں میں سے ہے جو ناقابل تردید بھی ہے اور ناقابل تشریح بھی۔ یہی اقرار غیب کا اقرار ہے اور ہر فلسفہ غیب کے کسی نہ کسی اقرار تک ہی پہنچتا ہے۔ جو فلسفہ اس غیب سے آگے چھلانگنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ محض گمراہ کن خبریں لاتا ہے۔ فلسفہ تعینات، نظریہ صدور اور اشراقیت اسی قسم کی کوشش ہیں جس کے نتیجے میں تمام کثرت محض مظہری، گریزپا، ناقابل اعتبار، نمود سیمیائی، وجود بے بود اور مایا جال قرار پاتی ہے۔ ان تمام فلسفوں سے پیشتر عہد مہا بھارت میں بھی ایسی ہی کوش کی گئی تھی تو خود انائے ربی (برہم آتما) ایسا مجاز مطلق معلوم ہوا تھا جس کے ماوریٰ بھی حقیقت ہے کہ اس کے ''نروانؑ میں یہ انا بھی ساقط ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اعلیٰ ترین ہندی حکمت میں خدائے قدوس بھی مایا ہے۔ ان تمام کوشش میں اگر یہ بات مجہول نہ بن جاتی کہ اگر تمام وجود ''زندگی'' ہے زندگی ''اشیئے بے جان'' کی طرح اپنے آپ کو کھلے عام کس طرح رسوا کر سکتی ہے۔ تو شاید ارباب معارف اس حقیقت تک پہنچ جاتے کہ غیب زندگی کی شان ہے اور ہماری وہمی موشگافیاں محض جھوٹی خبریں ہیں۔ جہاں اصل زندگی کی حد شروع ہو جاتی ہے وہاں برسر بازار کوئی اپنا مایہ حیات نہیں لگاتا اور اسی وجہ سے جلوہ اہل تماشہ کا حق نہیں ہوتا، بلکہ زندہ رو کا فیض وعطاء ہوتا ہے۔

خلیفہ صاحب نے ٹھیک اسی مقام سے اپنے فلسفے کا آغاز کیا تھا اور اسی لیے انہوں نے اناؤں کی کثرت یعنی ازم وجود کے راز کے اندر جھانکنے کی نہ کوشش کی تھی نہ ضرورت سمجھی تھی۔ ان کے نزدیک کل زندگی اس طرح جاری وساری ہے کہ اس کے اندر نور واحد ہے اور یہ نور انا کے بہت سے چراغوں سے روشن ہے۔ یہاں ظاہر اور باطن کوئی مکانی تشبیہ نہیں ہیں

خلیفہ صاحب کے فلسفہ زندگانیت کا انداز ان دونوں فلسفوں یعنی انفرادیت پسندی اور مطلقیت پسندی سے مختلف ہے۔ وہ اس طرح کہ ایک رف وہ زندگی کے باطن کی تعیر ایک نور سے کرتے ہیں اور دوسری طرف اس کے خارج کی تعبیر ایک ایسی حقیقت سے کرتے ہیں جسے ''ثقافت'' کہتے ہیں۔ خلیفہ صاحب اصول شخصیت سے آگے بڑھ کر اصول ثقافت میں ''ہو الظاہر'' کی تفصیل مرتب کرتے ہیں اور اس طرح ان کا مسلک ایک طرف مل اور اسپنسر سے مختلف ہوتا ہے، دوسری طرف براڈلے اور کروچے سے اور تیسری طرف اپنی کلی حیثیت میں المانوی زندگانیت اور فرانسیسی ''نیروُحیات'' سے منفرد ہو جاتا ہے۔

(۵)

جب خلیفہ صاحب زندگی کے باطنی رخ کی تعبیر ایک نور سے کرتے ہیں تو وہ ایک مخصوص رعایت سے کام لیتے ہیں جس کی گنجائش اسلامی فلسفہ کی طویل تاریخ سے پیدا ہوتی ہے۔ نور ایک وحدت ہے گر کیسی؟ بہت سے چراغ روشن ہیں۔ یہ روشن چراغ انا ہیں مگر ان سب کے مجموعہ سے جو روشنی حاصل ہوتی ہے وہ واحد ہے، اس میں من و تو کا فرق نہیں۔ یہی روشنی زندگی کا باطن ہے۔ وہ چراغوں کی اس کثرت کی کوئی توضیح نہیں کرتے۔ ان کے فلسفہ میں یہ ناتمامی ''تخلیلہ حریم'' کے تصور سے ہم آہنگ ہے۔ جس طرح ایمان کی بناء ''غیب'' پر ہے اسی طرح تمام فلسفہ کی اساس بھی ''غیب'' پر ہے۔ یہ غیب دراصل خود زندگی کی ایک شان ہے جس کے پس پردہ جانا علم و ادراک کا کام نہیں۔ یہاں شوق و عشق، دل داری و ہمدردی، ناز برداری و ذوق صحبت سے کچھ راز معلوم ہو جائیں تو ہو جائیں ورنہ وقوف و ادراک پر نہیں مار سکتے۔

اس امر سے عقل کا بے مایہ ہونا ثابت نہیں ہوتا، ہاں زندگی کا وجود ثابت ہوتا ہے۔ زندہ وہی ہے جس کے تخلیہ میں بلا اذن کوئی قدم نہیں رکھ سکتا۔ ھست وہی ہے جس کو حفظ اسرار پر قدرت ہے۔ چنانچہ جس سے چاہتا ہے بے تکلف ہوتا ہے اور جس سے چاہتا ہے تکلف برتتا ہے۔ کسی کے لیے چشم براہ ہوتا ہے تو کسی پر اپنا دروازہ بند کرتا ہے۔ یہ ایک روشن خاص ہے جو صرف زندگی کے ساتھ منفرد ہے۔ گو شریک حال ہونا اور شریک حال بنانا زندگی میں کو بہ کو شامل ہے مگر کچھ غیرت کا بھی تقاضہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علم و ادراک کے

ہاں یہ ایک نظام اضافات ہے جو ان واحدات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ خلیفہ صاحب کے فلسفہ میں زندہ ارواح نہ تو کھڑکی بند ہی اور نہ ہی ایک دوسرے سے بے التفات ہیں۔ ہر روح میں تمام ارواح کا جلوہ ہے۔ ہر ایک کو سب سے نسبت ہے۔ ہر ایک کے ساغر ہستی میں تمام کا تقاضا ہے اسی لیے ان کی باہمی اضافتوں کا نظام ثقافت ہے۔ وہ حقیقت جس کو لائبنز مکان سمجھا کیا، درحقیقت ''ثقافت'' ہے۔ جب ثقافت زندگی سے تہی ہو جاتی ہے، جب التفات ومودات کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں، جب ہر روح کے باطن میں تمام ارواح کے تقاضے سرد پڑ جاتے ہیں اور ہر فرد دریچہ بند ہو جاتا ہے تو بے شک پوری ثقافت محض مکانیت کی نظر ہو جاتی ہے...... ایک خارجی نظارہ بے آب و گیا صحرا۔ یہ وہ انحطاط وجود ہے جہاں ظاہر ہی ظاہر ہے، نہ ختم ہونے والا امتداد۔ حیات سے منقطع ہو کر ثقافت محض ایک ڈھکوسلا ہے یا پھر قید خانہ ہے، ایک خول ہے جس میں گھٹن ہے، صورت بے معنی ہے، سراب ہے، جس میں آبلہ پا روحیں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر ختم ہو جاتی ہیں۔

(٦)

جب ہر روح محض ایک نقطہ بے معنی بن جاتی ہے تو ثقافت محض مکان کے سوا کچھ نہیں رہ جاتی، اس کے سلسلے طوق وسلاسل بن جاتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ روح ایک نقطہ پر آ کر کب اور کیوں قید ہو جاتی ہے؟ اس جواب یہ ہے کہ جب اس کا سلسلہ اول و آخر سے ٹوٹتا ہے تو زندگی ایک وہمی نقطہ سے زیادہ وقیع نہیں رہ جاتی۔ زندگی مداومت ہے، استقدام ہے، اسی لیے اس کی نبض کی ہر حرکت سے ایک دو تین کا سلسلہ لامتناہی جاری ہے۔ یہ تسلسل کمی اور کیفی دونوں ہے اور اسی کو زندگی کی تاریخ کہتے ہیں۔ اپنی پوری تاریخ سے معریٰ ہو کر ذات کیا رہ جاتی ہے؟ محض ''ہونے کا احساس'' جس کا کوئی معطیہ نہیں، کوئی مایہ یا مواد نہیں، اسی لیے تاریخ سے زندگی کا تار و پود ہے۔ زندگی کو اگر ایک آن میں دیکھا جائے تو یہ ہمیشہ موجود الوقت حال معلوم ہو گی جو بذات خود ناقابل فہم، ناقابل بیان ہوگا۔ وہ ماضی ہے جس کے واسطہ یہ حال، زندگی کا حال بنتا ہے۔ لیکن خود ماضی ہے کیا؟ یہ خود زندگی ہے۔ ہر حال کے عقب میں زندگی موجود ہے، اس سے آزاد یا معریٰ ہو کر کوئی حال برقرار نہیں رہ سکتا۔ اگر طاری بھی ہو تو زندگی کی کاریت کی ایک

کہ ایک کمرہ ہے جس کے اندر کی چیزیں باطن اور اس کے باہر کی چیزیں ظاہر بلکہ منطقی تصور ہیں۔ تمام ہستی یا زندگی کا ایک بطون ہے جو نور ہے اور جس کے منطقی تقدم میں بہت سی ''سراج منیرہ'' ہیں۔

یہ تمام ''نور'' مظہر بنتا ہے، عالم ظہور میں قدم رکھتا ہے اور اس سے ثقافت ترتیب پاتی ہے۔ خدا سے میرا تعلق تصوریتی فلسفہ مغرب میں ''عالم اور معلوم'' کا تعلق ہے۔ خلیفہ صاحب کے فلسفہ میں ''ثقافتی تعلق'' ہے۔ جب میرے ماحول میں بیجان اشیاء ہوتی ہیں تو میرا اور ان کا تعلق عالم اور معلوم کا تعلق ہے۔ لیکن جب میں کسی مجلس میں جا بیٹھتا ہوں تو اس میں شریک تمام افراد کا باہمی تعلق ایک دوسرے سے عالم و معلوم کا نہیں ہوتا بلکہ ''ثقافتی تعلق'' ہوتا ہے۔ اس تعلق میں عالم و معلوم کا علاقہ ایک بہت ہی معمولی سے ریشہ سے زیادہ نہیں ہوتا۔ تمام کائنات ایک ثقافت مظہر ہے۔ یہ نہ انائے واحد کی ''شخصیت'' ہے نہ مادی وجود ہے، نہ بہت سے اناؤں کا قالب ہے بلکہ ایک مدنی ثقافتی نظام ہے۔

خلیفہ صاحب کے فلسفہ کا اس وجہ سے اعلیٰ ترین مقولہ ''ثقافت'' ہے۔ ثقافت زندگی کا عقلی تعین ہے، اس لیے زندگی کا فلسفہ نظریہ ثقافت کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ زندگی بلا واسطہ سیلان اور وجدان میں محض ایک تاثر معلوم ہوتی ہے لیکن جب وہ اپنے تعین پر آتی ہے تو ثقافت بن جاتی ہے اس لیے جو مذاہب فکر محض زندگی کے اثبات پر ہی مصر ہیں یا تو تاثری ہیں یا شاعرانہ۔ ان فلسفوں میں سوائے ''احساس وجود'' کے کچھ نہیں۔ وجودیت کی بہت سی شاخوں کا یہی حال ہے کہ احساس اور صرف احساس سے ایک قدم آگے نہیں بڑھ سکیں۔ زندگی صرف احساس زندگی پر ہی مشتمل نہیں ہو سکتی۔ یہ کہنا کہ ''اقرار زندگی'' بہت بڑی فلسفیانہ صداقت ہے درست ہو سکتا ہے مگر اس کو فلسفیانہ بصیرت نہیں کہہ سکتے۔ فلسفہ کا کام احساس سے شکل، عین سے تعین، وجود سے شان، ہستی سے حرکت کی طرف بڑھنا ہے۔ اسی وجہ سے فلسفہ اپنی ماہیت میں متشاکلت ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب کے نزدیک جب فلسفہ اپنے اس منصب کو پورا کرتا ہے تو نظریہ ثقافت بن جاتا ہے۔

لائبنز نے مونادات کا نظریہ پیش کیا تھا۔ یہ واحدات ایسے نانا ہیں جو ایک دوسرے سے خارج ہیں، زندہ ارواح ہیں، کھڑکی بند ہیں، کسی کو کسی سے راہ نہیں۔ ان مونادات کی خارجی نسبتوں کو اس نے ''مکان'' کا ادراک کہا تھا۔ مکان کیا ہے؟ لائبنز کے

اگر زندگی ''ھو الظاہر'' ہے تو ہر ''ظہور'' تاریخ زندگی کا ایک گزرتا ہوا لمحہ ہے۔ یہ زندگی کا تاریخی شعور ہے۔ تاریخی شعور زندگی کے ادراک کا ناگزیر غیر منفک حصہ ہے اور یہ شعور اپنے تمام حسن و کمال کے ساتھ صرف پیغمبروں کو عطا ہوتا ہے اور جس کو اس میں سے کچھ حصہ مل جاتا ہے وہ اپنے زمانے کا حکیم بن جاتا ہے۔ کلیات تو بڑی آسانی سے ازبر ہو جاتے ہیں، ان کی دریافت آسان نہیں تو مشکل بھی نہیں۔ مگر حکیم اور زندگی کا رازداں وہی ہے جس کو زندگی کی تاریخیت میں سے کچھ عطا ہو جائے۔ خیر! اگر زندگی کے کسی ظہور کو زندگی کی تاریخ کے بہاؤ سے جدا کر دیا جائے اور یہ عمل محض ادراک کا کھیل یا التباس ہے تو وہ ظہور ناقابل فہم بن جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی باہر سے عائد کی جانے والی حد ہے۔ ہمیں یہ تمام عالم خارجی کیوں معلوم ہوتا ہے؟ اس لیے کہ وہ تاریخی بہاؤ جس میں یہ سب اجزاء یعنی معطیات حواس زندگی کا ظہور ہیں ہماری نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ جب زندگی اپنی تاریخ سے نابلد ہو جاتی ہے تو اس کا شیرازہ بکھر جاتا ہے اور جو ظہور یا علامت اس تاریخی بہاؤ سے جدا ہو گیا وہ زندگی سے الگ ہو کر ایک خارجی تو دہ بن جاتا ہے۔ تمام عالم طبیعی کا وجود ہماری نسبت سے اسی طرح ہے۔ خلیفہ صاحب کے فلسفہ کے مطابق ہمارے تمام زندہ رشتے، ان کے تقاضے، ہماری جملہ ثقافت دراصل ہماری تاریخ کے عضوی بہاؤ کے نقاط ہیں جس کے سیلان میں ہو کر وہ نمودار ہوتے ہیں۔ مگر جب یہ تاریخ خود فراموشی کی نظر ہو جاتی ہے تو ہماری روح میں ان کے لیے کوئی مقام نہیں رہتا؛ وہ بھی طبیعی عالم کے پھیلے ہوئے اجزاء بن جاتے ہیں۔

تاریخ روح ثقافت ہے۔ جو اس روح سے آشنا ہے وہ ثقافت کا دیدہ ور ہے اور اسی میں یہ قدرتی ہوتی ہے کہ زندگی کی صورت سازی کرے۔ ہر صورت جو زندگی کا ظاہر ہے تاریخ کے گزرتے ہوئے لمحہ کی حیثیت سے ہی وجود میں آتی ہے اور تاریخ میں ہی گم ہو جاتی ہے۔ اس لیے زندگی کی وجدانی اکائی اگر کوئی ہے تو تاریخی عمل ہے، اسی میں ہو کر زندگی کے باطن اور ظاہر میں مغز و پوست کا رشتہ قائم ہے۔ جب یہ رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو تمام ثقافت جو ''ھو الظاہر'' کے مقولہ کی مصداق ہے ایک بیرونی تعین معلوم ہوتی ہے اور جب یہ بیرونی تعین معلوم ہوتی ہے تو زندگی کے بہاؤ میں فرق آ جاتا ہے۔ زندگی جس کی فطرت تاریخ ہے وہ ایک نقطہ پر ٹھہر جاتی ہے۔ ماہ و سال تو گزرتے رہتے ہیں مگر زندگی میں حرکت کا شعور بھی باقی نہیں رہتا۔ جب کوئی سماج ایسی منزل پر آ جاتا ہے تو اس کا رفتہ رفتہ ٹوٹ جانا زیادہ دن کی

سوچ نہیں بن سکتا۔ زندگی کے اس تمام انجرار کو "ہوالاول" کے تحت جمع کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ زندگی کا مسلسل تقدم اس کا جوہر ہے۔ اس کے اندر کوئی تکرار یا اعادہ نہیں۔ کوئی ایسا نقطہ موجود نہیں جو لوٹ کر آئے۔ اسی لیے زندگی میں ہر حال، ہر موجود، ہر کیفیت یکتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نظریات ٹوٹ جاتے ہیں۔ نظریہ تو اس وقت پیدا ہوتا ہے جب معطیہ میں بار بار لوٹ آنے کا امکان ہو۔ اسی وجہ سے زندگی کے بارے میں بصیرت گیری تو ہو سکتی ہے مگر نظریہ سازی نہیں ہو سکتی۔ اس کی تاریخ تو بن سکتی ہے مگر کلیات پر مبنی سائنس نہیں بن سکتی۔ کوئی ایسا کلیہ نہیں جس پر زندگی کو قرار حاصل ہو سکے۔ چنانچہ زندگی صرف بیان میں آ سکتی ہے، نظریہ میں نہیں۔ اسلیے زندگی علوم نظری کی بجائے علوم بیانیہ کا موضوع ہے۔ اگر فلسفہ کا موضوع زندگی ہے، جیسا کہ ہونا چاہیئے کہ خود زندگی ہی حقیقت ہے، تو فلسفہ نظری علم نہیں، بیانی علم نہیں، بیانی علم ہے۔ فلسفہ اپنی معنوی انتہا پر پہنچ کر کسی کلیات کے نظام میں تبدیل نہیں ہوتا بلکہ بیان اور صرف بیان سے عبارت ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں عقل اور وجدان کے مناقشات خود بخود طے ہو جاتے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں: خلیفہ صاحب نے نظریہ سازی کیوں نہیں کی؟ اس کا جواب بہت سادہ سا ہے: اس لیے کہ وہ فلسفی تھے۔ وہ قیاسات کے چکر کے خلاف تھے، اس لیے کہ اصلی فلسفے میں قیاسات یا تو فنا ہو جاتے ہیں یا حل ہو جاتے ہیں۔ مقدمات و استخراج کا دور دورہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں ظن و گمان ہو یا پھر وہاں جہاں بار بار پلٹ کر آنے والے مظاہر سے واسطہ ہو۔ اصلی مابعد الطبیعیات میں یہ بات نہیں ہوتی۔ وہاں تو صرف بیان ہوتا ہے...... ایسا بیان جو بیک وقت عقل اور وجدان دونوں کا معروض ہو۔ اس کو تسلیم کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ کلیات کا بھی ایک فلک ہوتا ہے مگر اس فلک کے نیچے بے جان عناصر کی ظہور ترتیب کا عالم ہے جو نفسیات اور طبیعیات کا موضوع ہے۔ مگر حقیقت اس فلک سے پرے ہے۔ اس کا آسمان فلم الافلاک ہے جو کلیات سے باہر ہے۔ اگر زندگی ہی اصل حقیقت ہے تو کلیہ کے اس بحر ناپیدا کنار میں سالم نہیں رہ سکتا۔ ہر لحظہ زندگی کی نئی شان نئی آن ہے چنانچہ زندگی کی داستان تو بن سکتی ہے مگر نظریہ نہیں۔ اعیان ثابتہ نہیں بلکہ واقعات تاریخ اس کا لباس ہیں۔ اسی لیے کل زندگی "ہوالاول" کے اعتبار میں ہمیشہ ہمیشہ نمودار ہوتی رہتی ہے۔ یہ ایسا اعتبار ہے جس میں آکر ہر خیال سوخت ہو جاتا ہے۔ فلسفہ خیال آرائی سے کہیں ارفع دید و نظر بن جاتا ہے۔

ہے مگر بحیثیت فلسفی ان کا منصب اس قسم کی کوششوں سے ارفع ہے اور وہ ہے خود زندگی کو "مبین" بنانا۔ چنانچہ ان کا اپنا جو فلسفہ ارتقاء ہے اس کا منبع مغرب نہیں بلکہ بنیادی اسلامی عقیدہ ہے اور اسی وجہ سے وہ ثقافت کا حرکی نظریہ پیش کرتے ہیں۔ ثقافت اور شریعت، مخصوص اسلامی فکر کے لیے، ہم معنی الفاظ ہیں۔ خلیفہ صاحب نے یہ بات بجا طور پر محسوس کی کہ ہمارے ارباب شریعت تاریخی شعور سے کورے ہیں، زندگی کی کنہ و ماہیت کے راز سے ناآشنا ہیں، اس لیے وہ ایک جامد شریعت کے ذریعے اسلام کو قائم رکھنا چاہتے ہیں مگر اس غیر حقیقی اور زندگی کی فطرت کے خلاف رجحان کی وجہ سے وہ ایک طرف خود زندگی کے لیے عارضی مزاحمت پیدا کر رہے ہیں تو دوسری طرف خود اسلامی ثقافت کے دائمی مفاد کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ خلیفہ صاحب کا یہ نقطہ نظر انہیں ثقافت اسلامیہ کی تشکیل جدید کے مسئلہ کی طرف لے گیا اور انہوں نے اس کے بنیادی مسائل مثلاً معاشیات، نظام سیاسی، نظام مدنیت وغیرہ کا تاریخ کے موجودہ لمحات کے لحاظ سے حل پیش کیا۔ خلیفہ صاحب کے اصلی مقام کے تعین میں ان کاوشوں کو ہمیشہ اولیت دی جائیگی۔

(۷)

زندگی کا تاریخی درک "ہو الاول" کے مقولہ کا عین ہے۔ اس کا مفہوم ہے کہ ہر مظاہر سے اول زندگی ہے اور زندگی کے تمام احوال اسی طور تاریخی شعور میں منضبط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ یورپ میں "ہمہ تاریخیت" ایک فکری وبا کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر "امر" کی حیثیت تاریخی ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔ گویا کسی چیز کا تاریخ میں وقوع پذیر ہونا ہر اعتبار سے اس کے لیے سند ہے۔ اس مسلک کے تضادات ظاہر کرنے کا یہاں موقع نہیں ہے۔ امریکہ کی جدید نتائجیت پر بھی اس کا اتنا ہی اثر ہے جتنا کہ روسی اشتراکی مادیت پر۔ اگر ایک زمانہ میں کلیسا کا زور تھا تو یہ تاریخ کا تقاضہ تھا اور اگر آج نہیں ہے تو یہ بھی تاریخ کا ہی تقاضہ ہے اس استدلال کے ذریعہ کسی چیز کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کرنا یا اس کے خیر و شر ہونے کا حکم لگانا تاریخ پسندوں کا اساسہ حکمت ہے۔ مگر زندگی تاریخی شعور سے زیادہ گہرہ شعور رکھتی ہے اور وہ ہاں یا نہیں کے احکامات میں صرف تاریخ کے فیصلہ پر قائع نہیں ہوتی، اس کی نظر ایک اور حقیقت پر جاتی ہے جو خود زندگی کا ہی ایک رخ ہے اور وہ

بات نہیں رہتی۔ مگر زندگی تاریخ مسلسل ہونے کی وجہ سے ارتقاء ہے۔ آج کا حال کل نہیں آئے گا، کل کا حال کچھ اور ہوگا۔ زندگی میں یہ دوامی وصف ہے اور اسی وجہ سے ہر وہ ثقافت کو کچھ دن، دھوں اور صدیوں کے لیے تو زندگی کا راستہ روک سکتی ہے۔ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ خود ثقافت زندگی سے مسلسل ٹکراؤ کے سبب پارہ پارہ ہو کر یا تو تباہ ہو جاتی ہے یا متغیر ہو جاتی ہے۔ زندگی کا ارتقاء جاری رہتا ہے۔ وہ کسی دوسری ثقافت کی صورت میں انحطاط و انتشار کے بعد نمودار ہونے لگتی ہے۔ یہ ارتقاء ہے جس میں ثقافتیں حیاتیاتی انواع کی طرح فنا ہو جاتی ہے یا فعال ہونے کی وجہ سے ترقی کرتی جاتی ہیں۔

خلیفہ صاحب کے نزدیک ارتقاء ایک کائناتی عمل ہے۔ چونکہ کائنات کی حقیقت زندگی ہے اس لیے علم کائنات علم ارتقاء ہے۔ خلیفہ صاحب کے فلسفے میں ارتقائیت حیاتیاتی فلسفہ و نظریہ کی محتاج نہیں نہ ہی وہ ڈارون اور ہکسلے کی خوشہ چین ہے۔ ان کا نظریہ ارتقاء اتنا ہی پرانا ہے جتنا اسلامی فلسفہ اگرچہ کہ مسلم فلاسفہ کا بڑا گروہ اعیان ثابتہ کا شکار ہو گیا تھا مگر خال خال ایسے مفکر بھی ہوئے ہیں جو ارتقائے روحانی پر نظر رکھتے تھے۔ چنانچہ مسلم فکر اعیان کے فلسفے کے تابع ہونے کے باوجود اپنے کئی گوشوں میں ارتقائی رہی ہے اور تاریخی تغیر و تبدل کو زندگی کے قانون کی حیثیت سے ہمیشہ جگہ دیتی رہی ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اسلام کی بنیادی تعلیم میں منصب رسالت کا تاریخی ارتقاء اور آنحضور ﷺ کی ذات میں اس کی تکمیل کا تصور اتنا اہم ہے کہ اس کو اعتقاد کا مرتبہ حاصل ہے کہ اس پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص دائرہ اسلام میں قدم نہیں رکھ سکتا۔ اہل اسلام میں اس وجہ سے یہ بنیادی شعور رہا ہے کہ انسانی سماجوں کا ارتقاء ہوا ہے۔ ہر سماج میں اس کے ارتقاء و حالات کے مطابق انبیاء مبعوث ہوتے رہے ہیں یہاں تک کہ انسانی ارتقاء اس منزل پر پہنچ گیا کہ الٰہی مشن کی پوری تکمیل کا لمحہ آ گیا اور ایک واحد نبی تمام انسانوں کا پیامبر بنا یہ تاریخی شعور فلسفیانہ نقطہ نظر سے خود زندگی کا شعور ہے۔ خلیفہ صاحب کے فلسفہ ارتقاء کا سرچشمہ بھی دراصل اسی بنیادی اسلامی شعور میں ہے اگرچہ کہ انہوں نے کونیاتی مفکر کی حیثیت سے حیاتیاتی ارتقاء اور سماجی ارتقاء کے مقام اتصال کے بارے میں قیاس آرائی بھی فرمائی ہیں جو سرسید اور اقبال کے اس مسلک کے مطابق ہیں کہ علوم کی ترقی اور قرآن کی تعلیم کے درمیان موافقت ڈھونڈی جائے۔ اس قسم کی موافقت کی تلاش کونیاتی مفکر کا منصب ہوتا ہے۔ خلیفہ صاحب کی کئی حیثیتوں میں سے ایک حیثیت یہ بھی

تمام آرزوں کو آفاقی آدرش کی لڑی میں پرو دیتی ہے جس کی بناء پر ثقافت ایک مادی سلسلہ کے باوجود روحانی سلسلہ بن جاتی ہے۔ قانون و آئین محض صورت گری ہیں، شریعت و فقہ محض سنت آزری ہیں، اگر ان میں مقصدیت کارفرما نہیں ہے۔ ہمارے ارباب مذہب، شریعت کے انضباط میں، غایت و مقصد کو بھول جاتے ہیں اسی وجہ سے محض رسوم خارجی کا مجموعہ وہ معلوم ہوتی ہے۔ تمام دستور یا ماضی کی یادگار معلوم ہوتا ہے یا بے جا بندشوں کا مجموعہ۔ محض یہ امر کہ کوئی فرد اس سے مستثنیٰ نہیں ہے اس کا کلی جواز نہیں پیدا کرسکتا اور نہ ہی اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ اس کو برقرار رہنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ صاحب آئین و ناموس، دستور و شریعت یعنی ثقافت کے پوری صوری نظام کو مقصدیت سے وابستہ کرتے ہیں۔ مقصد سے وابستہ کر کے ہی یہ فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ قاعدہ یا رسم اس قابل ہے یا نہیں کہ اس کو جاری رہنے دیا جائے۔ اس طرح سے اجتماعی ریت کی ہر لیکھ کے بارے میں حکم لگایا جا سکتا ہے اور اسی طریقہ سے ''ہو الظاہر'' کے کسی سلسلہ کی معنویت کا حساب لگایا جا سکتا ہے۔

قومیں اپنی زندگی میں اکثر اوقات ہوالظاہر کا شکار ہو جاتی ہیں، ان میں کوئی مقصدیت باقی نہیں رہتی اور ان کی ثقافت محض ریت و رسوم کی گراں بارے تکثیر بن جاتی ہے۔ ایسے میں خود وحدت اجتماعی کا پہچاننا دشوار ہو جاتا ہے اور پورے انسانی رشتے کھوکھلی ظاہر داری اور تکلیف دہ تکلفات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ ایک روح اور دوسری روح کے درمیان رسم و رواج کے ان گنت پردے حائل ہو جاتے ہیں۔ لوگ اس کو مدنیت کے فروغ سے تعبیر کرتے ہیں مگر یہ تکثیر رسوم پوری زندگی کو دیمک کی طرح چاٹ جاتی ہے یا گھن کی طرح کھا جاتی ہے ایسے میں صرف مقصدیت زندگی کے سلطان کی حیثیت سے نجات کا باعث ہوتی ہے۔ خلیفہ صاح کے فلسفہ میں مقصدیت کو خاص مقام حاصل ہے۔ وہ اس زمانہ کی ضرورت ہے اور پوری ثقافتی میراث کا آلہ تنقید ہے۔ اسی مقصدیت سے عالم اقدار کی رونمائی ہوتی ہے جس پر عالمگیر شریعت کو استوار کیا جا سکتا ہے۔

(۸)

عالم اقدار ایک نورانی عالم ہے جس سے انسانی دنیا میں ثقافت کا دیا روشن ہے اور

ہے عالم قصویٰ ''ھو الآخر۔'' اس کی حقیقت بھی زندگی ہی ہے۔ یہ ایک میزان ہے جس پر ہر تاریخ رکھی جاتی ہے۔ اس لیے ہر شئے کی تقدیر و تقسیم ہے، یہ عالم غایات ہے۔ اگر زندگی کا کہیں وجود نہ ہوتا تو غائیت یا مقصد کا بھی کہیں وجود نہ ہوتا۔ اس لیے غایت زندگی کا مخصوص نشان ہے، نشان ہی نہیں بلکہ آیت و سلطان ہے۔

غایت پرست فلسفوں میں مقصد کا درجہ اور اونچا ہے، وہ اس کو زندگی کا قیوم بنا دیتے ہیں۔ اسباب و علل میں وجہ قائم، جو ہر امر کی تشریح ہے، میکانیت کی، زمان و مکان کی، حرکیت کی، تقویم کی۔ مگر نری مقصدیت اتنے اہم وظائف انجام نہیں دے سکتی۔ حیوانات میں نقل مکان کا جو مادہ ہے وہ ان کے پر پرواز کی تقویم کی وجہ کافی نہیں بن سکتا ٹھیک اسی طرح ذرائع حمل و نقل کی ایجاد محض خواہش کی مرہون منت نہیں ہو سکتی۔ فنیات، قانون حرکت، کیمیاوی تعامل اور انجینئرنگ کی ترقی کے بغیر دخانی جہاز، ریل گاڑیاں اور ہوائی جہاز معرض وجود میں نہیں آ سکتے تھے۔ اسی طرح کائناتی طبیعی قوانین اور ارتقاء کے بغیر کہکشاں، نظام شمسی اور زمین کا وجود ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔ غایت پرست فلسفوں میں یہ تمام پہلو نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس غلو سے بچتے ہوئے غایات کا ایک مقام متعین کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ غایات زندگی کی مخصوص آیات ہیں۔ زندگی کی رونمائی میں مقصد کوشی سلطان محکم ہے جس سے ایک طرف ٹھہرا ہوا زمانہ حرکت میں آ جاتا ہے اور دوسری طرف ''موجود'' و ''مطلوب'' کے درمیان اتصال قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ فرق جو ''وجود'' اور ''معیار'' کے درمیان قائم ہوتا ہے مقصد آفرینی میں مرتفع ہو جاتا ہے۔

مقصدیت عالم امر کی مظہر ہے اور یہ اظہار خود زندگی میں ہوتا ہے جس سے ''ھو الظاہر'' کے استقبالی رخ کی تشکیل ہوتی ہے۔ خلیفہ صاحب کے فلسفہ میں تمام ظاہر کی معنویت کا سرچشمہ یہی استقبالی رخ ہے۔ اسی کے سبب سے زندگی کے تمام اطوار اور عادات و رسوم زندہ و سرزندہ عمل بن جاتے ہیں۔ ان ہی کو اقدار کہا جاتا ہے۔ یہ زندگی کا مقصدی پہلو ہیں جن کی وجہ سے زندگی کی حرکیت میں معنی کی آفرینش ہوتی رہتی ہے۔ خلیفہ صاحب مانتے ہیں کہ زندگی کا براہ راست وجدان تہیج و خواہش میں ہوتا ہے مگر اس سیل آرزو میں غایت سے تہذیب پیدا ہوتی ہے۔ اس طرح خلیفہ صاحب کے نظریہ ثقافت میں مقصدیت پورے تمدن و انسانی ارتقاء کا استقبالی رخ ہے۔ تمام ثقافتی مظاہر کی تہہ میں سیل آرزو ہے۔ مقصدیت ان

یہ دیا ایک طاق میں رکھا ہوا ہے اور وہ طاق انسانی قلب ہے۔

افلاطون نے ہمیشہ اقدار کو ہستی سے ماورئی دیکھا۔ رہبانیت نے اقدار کی تائیں نفی ہستی میں تلاش کی۔ ترک وجود اور ترک دنیا اہل روحانیت کا دین و مذہب بنے۔ ایسا کوئی ایک مرتبہ نہیں ہو۔ گزشتہ تین ہزار سال میں مختلف ثقافتوں میں وجود اور قدر کا تضاد بار بار ابھر کر سامنے آیا ہے۔ جنہوں نے وجود کا پیمانہ اٹھایا ان سے قدر کا دامن چھوٹ گیا اور جو مئے قدر سے رند خراباتی بنے اُن سے ہستی کا بوجھ اٹھایا نہ جا سکا۔

خلیفہ صاحب کا فلسفیانہ افتراب اس تضاد کو رفع کرتا ہے وہ قدر کو خود زندگی کا مہتم بالشان رخ سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک تمام اقدار کا معطیہ خود زندگی ہے اور خود زندگی ہی ان کا مقصود ہے۔ خلیفہ صاحب زندگی کو قدر الاقدار قرار دیتے ہیں اور پورے عالم قدر کی تعمیر اسی کے خمیر سے کرتے ہیں۔ اسلامی فکر کی عظیم روایت میں موجود کو خیر اور عدم کو شر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلیفہ صاحب کا فلسفہ اسی روایت کا ارتقاء ہے جس کے اندر اثبات زندگی تمام اقدار کا سرچشمہ ہے۔ زندگی اپنے سے ماورئی کسی معیار اور میزان کی پابند نہیں۔ تمام معیار اور میزان زندگی اور صرف زندگی سے مستعار ہیں اسی لیے زندگی ہی تمام اقدار کا آخر پیمانہ ہے، یہی ''ہو الاخر'' ہے۔

خلیفہ صاحب کا یہ نظریہ ''ایغو مرکزی مغالطہ'' میں جو تصوریت کی سب سے بڑی گرداب ہے، نہیں الجھتا۔ تصوریت اپنی مطلقیت میں آخرکار ایسے نقطہ نظر تک پہنچ جاتی ہے جہاں انا کے فشارات قدر کا درجہ اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ تصوریت میں قدر اور رضا قدر انا کی مرضی پر موقوف ہے۔ جس کو کہا کہ ''ہاں'' وہ قابل قدر، جس کو کہا کہ ''نہ'' وہ قابل گردن زدنی۔ خلیفہ صاحب جب زندگی کو قدر الاقدار کا رتبہ دیتے ہیں تو ہرگز اس ''ایغو مرکزیت'' میں وہ مبتلا نہیں ہوتے۔ چنانچہ وہ ہاں یا نہ کو مدار قدر نہیں خیال کرتے، بلکہ خود زندگی کو مدار قدر سمجھتے ہیں، زندگی جس کی فطرت بطون و خروج ہے، وہ ماضی اور استقدام ہے، وہ قدر ہے۔ زندگی ''ہونا'' ہے اور وہ قدر ہے۔ دم مبدم پیدا ہونے والی خواہشیں تسکین کے سامان چاہتی ہیں مگر یہ خواہشیں وجہ قدر نہیں ہیں بلکہ ان کا سرچشمہ یعنی زندگی اپنے پورے رخوں کے ساتھ قدر ہے۔ زندگی کی ماہیت پر اگر غور کیا جائے تو اس کی حقیقت بے مثال حریت ہے۔ وہ زندگی جو خواہش کی غلام ہو اپنی قدر کھو دیتی ہے، اس کے ہاں اور نہیں میں کوئی خوبی نہیں

37

خلیفہ عبدالحکیم: ایک محترم اور ہردلعزیز استاد

پروفیسر محمد رضی الدین صدیقی

یہ مضمون تشنہ رہے گا اگر شعبہ فنون کے اُن اساتذہ کا ذکر نہ کیا جائے جن کی کلاسوں میں نصابی تدریس کی خاطر تو ہم شریک نہ ہو سکے۔ لیکن مشرق کی تہذیبی روایات کے زیرِ اثر ہم انہیں اتنا استاد تصور کرتے تھے کیونکہ ایک تو وہ ہماری طالب علمی کے زمانہ میں اساتذہ کرام کے زمرے میں شامل تھے اور دوسرے اس لیے بھی کہ ہم نے ان سے کلاس کے باہر بہت کچھ استفادہ کیا تھا۔ ان اساتذہ میں ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نمایاں حیثیت رکھتے تھے۔ نہ صرف تعلیمی حلقوں میں بلکہ ملک میں عام طور پر ان کا نام بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ خلیفہ صاحب فلسفی ہونے کے علاوہ شاعر بھی تھے اور دونوں حیثیتوں میں علامہ اقبال کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے بلکہ ان کے شارح اور مفسر بھی تھے۔ اس بنا پر وہ طلبا اور عوام میں ہردلعزیز تھے اور اکثر جلسوں میں تقریر کرنے کے لیے بلائے جاتے تھے اور بے تحاشہ بولنے

ہوتی۔ وہ تو منبع شر بن جاتی ہے کیونکہ اپنے اقرار و اثبات میں، استرداد اور ابطال میں، وہ خود وجہ اصلی نہیں ہوتی۔ اس کی اگام تو کسی اور کے ہاتھ میں ہوتی ہے خواہ وہ غیر اندر ہو یا باہر۔ وہ زندگی جو اپنے آپ میں ہو یا کسی کی اسیر نہ ہو، بے مثل حریت میں قدر الاقدار ہے۔ اس کا فروغ تمام اقدار کا حاصل و مقصود ہے۔

زندگی، زندگی کی تکثیر چاہتی ہے۔ ہر قسم کے اغراض سے پاک اس کا مقصود فروغ زندگی ہے۔ اس لیے عشق زندگی اس کی ماہیت ہے۔ یہ عشق اپنی ذات کا عشق نہیں ہوتا۔ حب ذات تو خود غرضی ہے، کل زندگی کا عشق ہوتا ہے۔ زندگی جہاں کہیں ہو اس کی پرورش اور اس کا ارتقاء نصب العین ہوتا ہے اور یہی رحمت ہے۔

زندگی اپنے اظہار اور مقصود میں رحمت ہے۔ یہ رحمت کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتی۔ اس لیے تمام عالموں میں، تمام دنیاؤں میں رحمت ہی قدر مطلق ہے۔ تمام ظہور اسی قدر کے تابع ہے۔ زندگی کی تمام حرکیت کی یہ استقبالی وجہ ہے اس لیے کائنات کا سفر رحمت مطلق کی طرف ہے۔ زندگی جب اپنے پورے وجود میں خالص ہوتی ہے تو اپنی اقدار سے وہ آپ واقف ہوتی ہے۔ محبت، شفقت، رحم و کرم، جود و سخا، عطا و بخشش، ربوبیت و سرپرستی، دست گیری و ہمدردی، غرض تمام اقدار کا وہ مطلع بن جاتی ہے۔ اس کا قہر و جبر بھی ان ہی اقدار کی قوت ہے، اس کا جاہ و جلال بھی ان ہی اقدار کا محافظ ہے۔

خلیفہ صاحب کے فلسفہ میں یہی اقدار تمام ثقافت کی عالمگیر اساس ہیں۔ دوسرے لفظوں میں عالمگیر ثقافت کی یہی اقدار تشکیل قوتیں ہیں۔ عالمگیر ثقافت اس لیے رحمت اللعالمین کے تصور سے روشن ہے۔ اس تصور سے رہنمائی حاصل کرتی ہے۔ یہی ثقافت زندگی کا اثبات ہے، اسی میں وجود اور عیار کی ثنویت فنا ہو جاتی ہے۔ ان اقدار کی صورت گری آئین سازی و نفاذ شریعت ہے۔ ان کا تحفظ اصول مملکت ہے۔ ان کا فروغ معاشرہ کی تشکیل ہے۔ ان کا قیام معاشی انقلاب ہے۔ یہی خلیفہ صاحب کا عمومی فلسفہ ہے۔

بیا کہ قاعدہ آسمان بگر دانیم
قضا بگردش رطل گراں بگر دانیم

کی وجہ سے جلد رونق محفل بن جاتے تھے۔ ان کی صاف گوئی اور حسِ مزاح کے چند نمونے درج ذیل ہیں:

۱۹۳۵ء میں یونیورسٹی کلب نوبت پہاڑ پر واقع تھی۔ جو اساتذہ اس کے رُکن تھے وہ سہ پہر میں وہاں ٹینس کھیلنے جمع ہوتے تھے۔ کلب کی طرف سے وقت بوقت منعقد ہوا کرتی تھی جس میں مختلف محکموں کے عہدہ دار بھی بلائے جاتے تھے تاکہ رابطہ قائم رہے۔ ایک جج صاحب (جن کا نام لینا ضروری نہیں) جامعہ عثمانیہ کے شدید ناقدین میں سے تھے کیونکہ اس وقت تک وہ بھی اُردو میں اعلیٰ تعلیم کے قائل نہیں تھے۔ ایک موقع پر بھری محفل میں بظاہر مزاحیہ انداز میں لیکن دراصل طنز کے ساتھ فرمایا: ''بھئی ایک طرف تو ہم آئن سٹائن جیسے پروفیسروں کا نام سنتے ہیں۔ اور ایک آپ حضرات بھی پروفیسر ہیں۔'' یہ سن کر ہم لوگ نہایت برہم ہوئے لیکن خاموش رہے کیونکہ وہ ہمارے مہمان تھے۔ لیکن خلیفہ صاحب کہاں خاموش رہنے والے تھے۔ کہنے لگے: ''جناب ہم لوگ بھی انگلستان کے بڑے بڑے قابل ججوں کے نام سنتے ہیں اور ایک آپ بھی جج ہیں تو جیسے آپ جج ہیں ویسے ہی ہم پروفیسر ہیں۔'' اس طرح یہ تلخ بات ہنسی میں رفع دفع ہوگئی۔

عثمانیہ یونیورسٹی کے سٹاف کلب میں علمی ادبی گفتگو ہوئی تو کبھی مقامی مسائل پر تنقید ہوتی اور کبھی پھکڑ چلتا۔ ان محفلوں میں خلیفہ صاحب کی ذات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ خلیفہ صاحاب کا خطاب اکثر ڈاکٹر عبدالحق مرحوم سے رہتا جو عربی کے عثمانیہ یونیورسٹی کے صدر شعبہ تھے۔ ان کا رنگ گہرا سیاہ تھا۔ ایک ایسا سیاہ جس میں اوداپن آجاتا ہے۔ خلیفہ صاحب بڑے ہی سرخ و سفید انسان تھے کلب والے ان دونوں کو ''بلیک اینڈ وائٹ'' کہتے تھے۔ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا اور خلیفہ صاحب کا معاملہ کم و بیش اسی نوعیت کا تھا جو سر شہاب الدین اور علامہ اقبال کا تھا اور خلیفہ صاحب کے لطیفے اور چٹکلے بھی تقریباً اس ہی قسم کے ہوتے تھے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ ایک مرتبہ سر شہاب الدین کورٹ میں سیاہ رنگ کا سوٹ پہن کر چلے آئے تو علامہ اقبال نے کہا: ''کیوں شہاب الدین۔ آج بغیر کپڑے پہنے ہی کورٹ میں چلے آئے؟'' اس طرح کا ایک واقعہ مجھے یاد ہے کہ ایک شام ہم لوگ کلب کے برآمدے میں ٹینس کے بعد بیٹھے ہوئے تھے کہ شام ہوگئی اور ابھی چراغ روشن نہیں ہوئے تھے۔ جب تاریکی کچھ زیادہ ہوئی تو خلیفہ صاحب نے یکایک حاضرین سے سوال کیا ''ہوں بھئی ابھی

یہاں عبدالحق بیٹھے ہوئے تھے۔ کہاں غائب ہو گئے؟'' حالانکہ وہ وہیں موجود تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق کی شادی کے موقع پر جو مزاحیہ سہرا خلیفہ صاحب نے لکھا۔ اس کے چند اشعار یہ تھے:

یہ عالم ہے کس زور کا یا الٰہی پسینے سے سنی ہے جس کی سیاہی
شبِ وصل دیتی ہے دلہن دہائی کہ یا رب نہیں دیتا دولہا دکھائی

حیدر آباد دکن سے ۱۹۴۳ء میں جب آپ کو کشمیر امر سنگھ کالج کی پرنسپلی پر مقرر کیا گیا تو کچھ عرصہ تک مکان کی تلاش جاری رہی۔ آخر ایک مکان پسند آ گیا اور عنقریب اسمیں منتقل ہونے ہی والے تھے کہ پتہ چلا کہ وزیر تعلیم جن کا نام لالہ حویلی رام تھا۔ انہیں بھی چونکہ وہی مکان اپنے لیے پسند آ گیا۔ لہٰذا خلیفہ صاحب کے ہاتھ سے نکل گیا جس کا انہیں افسوس تو ہوا لیکن صرف گھڑی بھر کے لیے۔ فی البدیہہ شعر میں صورتِ حال یوں بیان کی:

حویلی لے گئے لالہ حویلی، غریبوں کا بھی ہے اللہ بیلی
خدا بھی لامکان بندہ بھی بے گھر۔ خدا کی ایک صفت بندے نے لے لی۔ خلیفہ

صاحب کے اس ہی طرح کے کی برجستہ فقرے مشہور ہوئے مثلاً ''جس طرح بلا مقصد اور بے معنی گفتگو کو بکواس کہتے ہیں۔ اس ہی طرح بے تحاشا لکھے ہوئے معمولی مضامین اور کتابوں کی بھرمار کو ''لکھواس'' کا نام دینا چاہیے۔''

حاصل کی۔ ان دنوں پنجاب میں سرسید کی تعلیمی تحریک سے بڑی دلچسپی اور وارفتگی پائی جاتی تھی اور اس زمانے کے اکثر بزرگ اپنی اولاد کو علی گڑھ تعلیم حاصل کرنے بھیجا کرتے تھے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ خاص وجوہ کے باعث وہاں کی زندگی خلیفہ صاحب کو راس نہ آئی اور وہ بہت جلد دہلی کے سینٹ سٹیفن کالج میں داخل ہو گئے جہاں سے سنہ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے بی۔اے آنرز اور سنہ ۱۹۱۷ء میں ایم۔اے (فلسفہ) پاس کیا۔ ان دونوں امتحانوں میں انہوں نے نمایاں حیثیت حاصل کی۔ ایم۔اے کے امتحان میں انہوں نے رومی پر ایک مقالہ لکھا جو آج تک پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ ہے۔ ۱۹۱۹ء میں اقبال کی سفارش پر خلیفہ عبد الحکیم کا تقرر حیدر آباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں ہو گیا اور وہیں انہوں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ بسر کیا۔ ۱۹۲۲ء میں وہ ہائیڈل برگ یونیورسٹی (جرمنی) گئے جہاں سے انہوں نے فلسفہ میں ڈی فل کی ڈگری لی۔ ان کا مقابلہ ''رومی کی مابعد لطبیعیات'' بعد میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔ جس کے کوئی تین مختلف ایڈیشن نکل چکے ہیں۔

چالیس سال سے کچھ اوپر انہوں نے حیدر آباد کے علمی ماحول میں بسر کیے۔ وہ اپنی گفتگو میں اس زندگی کے متعلق باتیں کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس جگہ کے ماحول سے کافی حد تک مطمئن تھے۔ وہ اکثر وحید الدین سلیم پانی پتی مرحوم کے منجھے ہوئے ادبی ذوق کا ذکر کیا کرتے تھے۔ تقلید اور اجتہاد پر بحث کرتے ہوئے وہ اکثر وحید الدین سلیم مرحوم کا نام لیتے۔ جامعہ عثمانیہ کی مجلس وضع اصطلاحات میں کئی بزرگ ہوتے تھے۔ کسی انگریزی اصطلاح کے اُردو مترادف کی تلاش ہوتی۔ وحید الدین سلیم مرحوم انگریزی دانوں سے اس لفظ کے لاطینی یا یونانی مادوں کے معنی دریافت کرتے اور پھر ایک عمدہ اُردو اصطلاح، بالکل نئی، تیار کر کے پیش کر دیتے۔ اس پر تقلید کے پرستار سند کے طالب ہوتے، تو وحید الدین سلیم فوراً ایک شعر کسی استاد کے نام سے پیش کر دیتے۔ وہ شعر بالکل جعلی ہوتا تھا لیکن کسی استاد کے نام سے منسوب ہونے سے اسے سند کی حیثیت حاصل ہوتی اور وہ اصطلاح تسلیم کر لی جاتی۔ اسناد پرستی کی بات سے ایک دوسرا واقعہ یاد آیا جو خلیفہ صاحب اکثر سنایا کرتے تھے۔ دیو بند کے ایک بزرگ استاد چھوٹے قد کے تھے اور ان کے پڑھاتے وقت طلباء کچھ تکلیف محسوس کرتے۔ بعض نے مشورہ دیا کہ آپ ایک اونچی مسند بچھالیں تاکہ طلباء کو آپ کی طرف متوجہ ہونے میں آسانی ہو۔ لیکن سوال وہی سند کا تھا۔ کیا ایسی مسند بچھا کر درس دینا کبھی اسلاف کا

38

خلیفہ عبدالحکیم مرحوم

خواجہ بدر

خلیفہ عبدالحکیم لاہور کے ایک کشمیری متوسط گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے دادا ہزاروں دوسرے کشمیری مہاجرین کی طرح کشمیر کے بے رحم حکمرانوں کے ظلم وستم سے تنگ آکر لاہور میں آبسے تھے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ اگرچہ دولت وثروت کے لحاظ سے وہ نمایاں حیثیت کے مالک نہ تھے لیکن وجاہت وعزت کے لحاظ سے اس خاندان کو اپنے علاقے میں نمایاں جگہ حاصل تھی۔ ان کے دادا ایک چھوٹے کارخانے کے مالک تھے۔ جس میں چند کاریگر کام کرتے تھے اور اسی بناء پر ان کو خلیفہ کا لقب ملا جس سے ڈاکٹر عبدالحکیم بعد میں معروف ہوئے۔

خلیفہ صاحب کی پیدائش ۱۱ جولائی سنہ ۱۸۹۴ء کو لاہور ہی میں ہوئی اور یہیں انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے مشہور اور قدیم اسلامیہ ہائی اسکول شیرانوالہ دروازے میں تعلیم

معمول رہا ہے؟ آخر حضرت امام مالک کی زندگی میں ایسی مسند کا ذکر ملا اور اس سند کے ہوتے ہوئے مسند کا استعمال شروع ہوا۔ خلیفہ صاحب اکثر مسلمانوں کی اس متشدد اسناد پسندی کے خلاف آواز بلند کیا کرتے تھے۔

خلیفہ صاحب کی زندگی میں تصوف سے ذوق بہت گہرا تھا۔ اگرچہ وہ علمی طور پر اس کے قائل تھے کہ اسلامی تصوف کی تعمیر میں قبل از اسلام تحریکوں کا بڑا اثر ہے پھر بھی وہ تصوف کی اسلامی روح سے بڑے متاثر تھے۔ میرا خیال ہے کہ ان کی زندگی کے اس رخ کی تعمیر میں وحید الدین سلیم مرحوم کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور تھا۔ سنایا کرتے تھے کہ وحید الدین کی بیوہ والدہ حضرت غوث علی شاہ قلندر پانی پتی کی خدمت کیا کرتی تھیں اور خود وحید الدین سلیم نے اپنی ابتدائی زندگی اس قلندرانہ ماحول میں گزاری۔ حضرت غوث علی شاہ قلندر کی زندگی کے بہت سے واقعات خلیفہ صاحب نے ان ہی کی زبان سے سنے تھے اور اس طرح کے چشم دید واقعات سے انکار ذرا مشکل ہوتا ہے۔ کئی غیر معمولی واقعات کے بیان کرنے کے بعد وہ اکثر تصوف اور روحانیت کی دنیا میں گم ہو جایا کرتے تھے اور پورے وثوق سے اس مادی دنیا سے ماوریٰ ایک روحانی نظام کائنات کے وجود کے متعلق اثباتی رنگ میں بے شمار دلائل اور واقعات و مشاہدات کا انبار لگا دیتے۔

حیدر آباد کی زندگی سے متعلق جس دوسرے شخص کی تعریف ان کی زبان سے سنی وہ بہادر یار جنگ مرحوم تھے۔ خلیفہ صاحب ان کے عزم و حوصلہ، خلوص و قلندرانہ صفات کے بہت مداح تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب بھی حیدر آباد کی زندگی کا ذکر ہوا ایک طرف وحید الدین سلیم اور دوسری طرف بہادر یار جنگ کا نام ان کی زبان پر ضرور آتا۔

نظام حیدر آباد کے متعلق ان کی زبان سے کبھی کوئی کلمہ خیر کم از کم میں نے نہیں سنا۔ وہ ہمیشہ ان کی خسیس عادات اور گندی طبیعت کا ذکر کرتے۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بہترین دور حیدر آباد میں بسر کیا لیکن وہ ہمیشہ سیاست اور دربار داری کی زندگی سے الگ تھلگ رہے۔ علمی زندگی ان کی طبیعت کو ایسی راس آئی کہ پاکستان آنے کے بعد انہیں کئی بار سفارت اور وزارت کے عہدے پیش ہوئے لیکن انہوں نے اس ظاہری شان و شوکت کے مقابلے پر علمی زندگی کی گوشہ نشینی اور عزلت گزینی کو ہمیشہ ترجیح دی۔ یہاں تک کہ جب سردار نشتر مرحوم پنجاب کے گورنر تھے تو انہوں نے خلیفہ صاحب کو کئی بار پنجاب یونیورسٹی کی وائس

چانسلر شپ پیش کی لیکن انہوں نے ہر بار اپنی نا اہلیت کا عذر پیش کیا اور اپنے آپ کو اس سیاسی کشمکش کی زندگی سے بچائے رکھا۔ اس برعظیم کے کئی مسلمان رہنما جو اپنی قوم کے لیے گوہر گرانمایہ ثابت ہو سکتے تھے سیاست میں شامل ہونے کے باعث ملت کی صحیح خدمت سے محروم رہے اور قوم ان کے علمی فیض اور تمدنی ثروت سے بے بہرہ رہی۔

خلیفہ صاحب کی معلمانہ زندگی کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ درس و تدریس کے مروجہ طریقے کے بالکل پابند نہیں تھے۔ انہوں نے ہمیشہ جماعت میں طلبا کے سامنے فلسفیانہ مسائل و مباحث کو اس طرح پیش کیا گویا ایک نجی محفل ہے جس میں تبادلہ خیالات ہو رہا ہے۔ وہ اپنے مضمون کے بیان کرنے میں مگن ہیں اور طلبا ان کے بیانات کو سننے میں گم، کسی کو پتہ نہیں کہ گھنٹہ ختم ہو گیا ہے یا ابھی جاری ہے۔ اگرچہ مجھے ان کی شاگردی کا فخر حاصل نہیں لیکن خلیفہ صاحب اکثر ان باتوں کا اشارے کنائے سے ذکر کیا کرتے تھے اور اس کی تصدیق ان کے شاگردوں کی زبان سے ہوئی۔ یہ طریقہ گفتگو ان کی امتیازی شان تھی۔

ہر محفل میں گرم گفتگو ہوتے اور ہر قسم کے مسائل پر اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے کہ سننے والوں پر ضرور اثر ہوتا۔ فارسی اور اُردو شاعری سے ذوق ان کو طالب علمی کے زمانے سے تھا۔ چنانچہ بھگوت گیتا کے منظوم اُردو ترجمے کے دیباچہ میں انہوں نے ذکر کیا ہے کہ اس دور میں انہوں نے شعر کہنا شروع کر دیا تھا اور فیضی کے فارسی ترجمے کا غور سے مطالعہ کیا تھا جس کے اکثر برجستہ اشعار ان کے لوح ذہن پر ثبت ہو گئے۔ اس ادبی ذوق کی جھلک ان کی گفتگو میں خالص طرح پر نمایاں تھی۔ فلسفہ ہو یا نفسیات، مذہبی مباحث ہوں یا معاشرتی مسائل، ہر جگہ ان کے بیان میں شعر و شاعری کے حوالے اور مشکل اشعار کی تشریح موجود ہوتی۔ مجھے پانچ چھ سال مسلسل ان کی صحبت میں بسر کرنے کا فخر حاصل ہے۔ وہ ہر روز کم از کم دو گھنٹے مجلس میں بیٹھتے جہاں ہر شخص کو بیٹھنے اور گفتگو میں حصہ لینے کی اجازت ہوتی۔ ہر روز نئے مباحث پر گفتگو ہوتی اور ہر بار بلا مبالغہ وہ نئے زاویوں سے مسائل پر بحث کرتے۔ سنجیدہ مسائل کے علاوہ وہ لطائف و ظرائف کا خزینہ تھے۔ میں نے ان کی زبان سے ہزاروں لطائف سنے ہوں گے لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی دن انہوں نے کوئی پرانا لطیفہ دہرایا ہو۔ شعر فہمی کا ملکہ رکھتے تھے اور ادق سے ادق فلسفیانہ بحث کو اشعار کی مدد سے حل کرنے میں بے مثال تھے۔ میں نے ان کی مجلس میں بڑے بڑے سیاسی رہنما، بلند مرتبہ سرکاری عہدہ دار اور

پیدا ہو چکے تھے جو انسانی زندگی کی اخلاقی اور روحانی اقدار کے منافی تھے اور جن کے باعث ہماری نئی نسل کی زندگی ایک خطرناک بحران سے دو چار تھی۔ دوسری طرف دین کی وہ قدیم تفسیر و تعبیر تھی جس کی بنیاد اگرچہ خلوص و دیانتداری پر مبنی تھی تاہم جدید حالات سے ناواقفیت کی بناء پر نہ صرف اپنی افادیت کافی حد تک کھو چکی تھی بلکہ اپنی غیر معقول ماضی پرستی کے باعث مادہ پرستانہ رجحانات کو بالواسطہ تقویت پہنچا رہی تھی۔ جدید حالات کے نئے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے دین کی ایسی تعبیر کی ضرورت تھی جو اسلام کے تمام اساسی تصورات پر ایمان رکھتے ہوئے زندگی کی بدلتی ہوئی ضروریات اور زمانی و مکانی تقاضوں کو پورا کر سکے۔ خلیفہ عبدالحکیم نے اس عظیم الشان اور اہم کام کی ذمہ داری قبول کر کے پاکستان کے مسلمانوں کی ایک بڑے نازک دور میں بڑی خدمت کی۔ غلطیوں سے کون انسان مبرا ہے؟ جن اسلاف کے کارناموں پر ہم آج فخر کرتے ہیں ان میں سے کسی کے متعلق بھی ہمارا یہ عقیدہ نہیں کہ انہوں نے حقیقت کو مکمل اور اکمل صورت میں پالیا اور پیش کیا۔ کہیں کسی وجہ سے انسان کے کام میں نقص رہ جاتا ہے۔ تمام خوبیوں اور سچائیوں کی جامع ذات تو خدائے تعالیٰ ہی ہے۔ انسان کی ذمہ داری خلوص اور جدوجہد سے سچائی کو سمجھنے اور اسے پیش کرنے کی ہے اور اس معاملے میں خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی طرف سے بڑی کامیاب کوشش کی ہے۔ ان کی کتاب ''اسلام کا نظریہ حیات'' جو ادارہ ثقافت اسلامیہ کی طرف سے شائع ہوئی اِس کا بین ثبوت ہے۔ اس میں انہوں نے اپنی روایتی سادہ بیانی سے اسلام کے عقائد کو واضح اور جدید شکل میں پیش کیا۔ اگرچہ ساری عمر انہوں نے فلسفہ کے مسائل پر غور و خوض کرنے اور اس کی تعلیم دینے میں صرف کی، لیکن ان کی تحریروں میں کبھی روایتی فلسفیانہ گنجلک کا گزر نہیں ہوتا۔ وہ مشکل سے مشکل مسئلے کو سادہ اور دلنشین انداز میں بیان کرنے پر پوری طرح قادر تھے۔ چنانچہ ان کی یہ کتاب افکار کی گہرائی کے ساتھ ساتھ سادہ بیانی کی بہترین مثال ہے۔

یوں تو ان کو فارسی اور اُردو شعراء کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے جو گفتگو کے دوران میں برمحل استعمال کیا کرتے تھے لیکن حافظ شیرازی سے ان کا لگاؤ ایک عجیب نوعیت کا تھا۔ اس برعظیم میں سے پہلے حالی اور پھر اقبال نے حافظ کے فلسفہ حیات پر بھرپور تنقید کی تھی۔ حالی کی تنقید تو شاید محض محدود حلقوں سے باہر راہ نہ پاسکی لیکن اقبال کی تنقید نے تو کافی شور و غوغا پیدا کیا۔ یہاں تک کہ حسن نظامی اور اکبرالہ آبادی جیسے بزرگ بھی اقبال سے نالاں

علماء و فضلا کو ان کی دلپذیر گفتگو، ان کے دلکش طرز بیان اور ان کی شگفتہ بذلہ سنجیوں سے بڑا متاثر پایا۔

حیدر آباد کی تعلیمی زندگی کے آخری دور میں آپ عارضی طور پر کشمیر چلے گئے اور وہاں کچھ عرصہ ڈائریکٹر تعلیمات بھی رہے۔ کشمیر ان کا آبائی وطن تھا، چنانچہ یہاں چند سالہ زندگی کی یاد ان کے ذہن سے کبھی محو نہیں ہوئی۔ وہ اکثر اس دور کے واقعات کا ذکر بڑی دلچسپی اور عقیدت، شیفتگی اور افسردگی سے کیا کرتے تھے۔ کشمیر کے قیام کے دنوں میں ان کے مراسم شیخ عبداللہ سے بہت گہرے ہو گئے تھے۔ چنانچہ ۱۹۴۷ء کے ہنگامہ خیز دور میں انہوں نے کچھ سیاسی قسم کی پیام رسانی بھی کی۔ کبھی کبھی نجی محفلوں میں ان سیاسی باتوں کی طرف اشارہ کیا کرتے تھے۔ ہم نے خواہش کی کہ وہ اس سیاسی پیام رسانی کے متعلق اپنی معلومات کو قلمبند کروا دیں تو بہت اچھا ہوگا۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ کام شروع نہ کیا جا سکا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کشمیر کی چند سالہ زندگی نے ان کے قلب و ذہن کو اتنا موہ لیا تھا کہ انہوں نے نسیم باغ میں ایک عمدہ مکان تعمیر کروایا اور اپنی تمام عمر کا سرمایہ کتابیں یہیں لے آئے۔ ان کا ارادہ تھا کہ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد کی خدمت سے سبکدوشی کے بعد یہاں اطمینان سے بیٹھ کر اپنی بقایا زندگی علم و حکمت کی خدمت میں خاموشی سے بسر کریں مگر خدا کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ ۱۹۴۷ء سے کشمیر کے حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ فسادات اور افراتفری سے خلیفہ صاحب کے علمی ذخیرہ کو بھی نقصان پہنچا۔ چناچہ وہاں کی سکونت کا ارادہ ترک کر کے ان کو لاہور آنا پڑا۔ کشمیر کے حالات اور اس جبری نقل مکانی کا انہیں بڑا قلق رہا۔ مگر جس چیز کا انہیں سب سے زیادہ صدمہ تھا وہ کتابوں کے اس ذخیرہ کا نقصان تھا جو انہوں نے ربع صدی کے دوران جمع کیا تھا۔ لیکن لاہور میں ان کا ورود کئی حیثیتوں سے فائدہ مند ثابت ہوا۔ لاہور اس برصغیر کا ایک اہم ثقافتی مرکز رہا ہے اور پاکستان بننے کے بعد اس کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ایسی مرکزی جگہ میں خلیفہ صاحب کو اپنے مقاصد کی تکمیل میں کہیں زیادہ سہولتیں میسر آ سکتی تھیں۔ چنانچہ چند سالوں کے بعد ۱۹۵۰ء میں خلیفہ صاحب نے حکومت پاکستان کی مدد سے ادارہ ثقافت اسلامیہ کی بنا ڈالی۔ اس ادارے کے قیام کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اسلام کی ابدی تعلیمات اور مسلمانوں کے ثقافتی اور علمی کارناموں کو جدید زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں اور علمی معیار کے مطابق پیش کیا جائے۔ ایک طرف مغرب کے غلط علمی نظریات سے مادہ پرستانہ رجحانات

اقبال کی عمت فکر کو تسلیم کرنے کے باوجود کافی لوگ ایسے موجود ہیں جو حافظ کی تنقیص کو غلط سمجھتے ہیں۔ ان میں خلیفہ صاحب بھی تھے۔ وہ حافظ کو صحیح معنوں میں لسان الغیب سمجھتے تھے۔ کہا کرتے تھے کہ ان کو حافظ کی روح سے ایک عجیب و غریب گہرا رشتہ ہے اور زندگی کے ہر نازک موقعے پر انہوں نے حافظ کی روح کی طرف رجوع کیا اور بقول ان کے حافظ نے انہیں کبھی مایوس نہیں کیا۔ وہ دو چار دس نہیں بلکہ سینکڑوں واقعات اپنی زندگی کے مختلف ادوار سے سنایا کرتے تھے جب وہ کوئی اہم فیصلہ کرنے سے پہلے دیوان حافظ کی طرف رجوع کیا کرتے اور جو کچھ فیصلہ وہاں پاتے اسی کے مطابق عمل کیا کرتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ انہیں کبھی اس طرح کی ہدایت سے مایوسی نہیں ہوئی اور ناکامی کا کبھی منہ دیکھنا نہیں پڑا۔ حافظ کا لسان الغیب ہونا ان کے خیال میں روحانی عالم کے وجود کا ایک ناقابل تردید ثبوت تھا۔ لیکن اس روحانی یگانگت کے باوجود خلیفہ صاحب کا فلسفہ حیات حافظ کے تصورات سے یقیناً مختلف تھا۔ خلیفہ صاحب کی تحریر، ان کی گفتگو اور خود ان کی زندگی رجائیت سے بھرپور تھی۔ اس میں حافظ جیسی قنوطیت کا کہیں گزر نہ تھا۔ وہ عمل کے قائل تھے اور حافظ کے پیش کردہ جبر کے سخت مخالف تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ہم عجیب دور میں پیدا ہوئے، ایک طرف مسلمانوں کا ماضی ہے جو نہایت شاندار علمی کارناموں سے لبریز ہے اور دوسری طرف مستقبل ہے جب مسلمان دوبارہ دنیا کی علمی امامت پر سرفراز ہونے والے ہیں۔ لیکن افسوس ہے تو یہ کہ ہم اس درمیانی دور میں پیدا ہوئے جب ہر جگہ تاریکی ہی تاریکی ہے۔ انہیں اسلام اور پیغمبر اسلامؐ سے گہرا جذباتی لگاؤ تھا۔ وہ پکے مسلمان تھے اور مسیحی مستشرقین کے اسلام کے خلاف حملوں پر کچھ اس طرح سیخ پا ہوتے کہ ان کا مقابلہ مشکل ہو جاتا۔ جب کوئی یورپین یا امریکی عیسائی ان سے گفتگو شروع کرتا تو بجائے اس کے کہ وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہوئے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات شروع کرتا، خلیفہ صاحب عیسائیت کے چند مشہور مسائل پر بحث شروع کر دیتے اور یورپ اور امریکہ میں عیسائیت کے بے شمار فرقوں کی باہمی کشمکش اور تصادم کا تفصیلی تذکرہ لے بیٹھتے۔ چونکہ یہ تمام باتیں ان کے اپنے ذاتی مشاہدات کا نتیجہ تھیں اس لئے مخالف کو سوائے خاموش رہنے کے اور کوئی چارہ کار نہ رہتا۔ ایک دفعہ ایک ترکی وفد ملاقات کے لیے آیا۔ باتوں باتوں میں انہوں نے سیکولرازم اور قرآن حکیم کے قانون وراثت کے خلاف لڑکوں اور لڑکیوں کے مساوی حقوق وراثت کی تائید شروع کر دی۔ بس پھر کیا تھا۔

خلیفہ صاحب کے لیے اسلام پر یہ حملہ اور وہ بھی ایک مسلمان کی زبان سے، ناقابل برداشت تھا۔ صوفے پر بیٹھے ہوئے انہوں نے رخ بدلا، سگریٹ کو خاکدان میں رکھ دیا اور گفتگو شروع کی۔ دلائل کا انبار لگا دیا۔ ان کے چہرے پر جلال تھا، زبان میں روانی اور کاٹ اور گفتگو تھی کہ ایک بہتے ہوئے دریا کی طرح رواں تھی۔ حریف تاب نہ لا سکے اور جلد ہی ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے۔

خلیفہ صاحب کی علمی زندگی کی ابتداء مولانا روم کے فلسفیانہ نظام کے مطالعے سے شروع ہوئی۔ انہوں نے جرمنی میں ڈاکٹریٹ کے لیے رومی کی مابعد الطبیعیات لکھی جو کئی سالوں کے بعد ۱۹۳۳ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کے بعد حکمت رومی ۱۹۵۵ء میں چھپی۔ رومی کی مثنوی مطالب کے لحاظ سے ایک سمندر ناپیدا کنار ہے۔ جس میں نایاب اور انمول موتیوں اور جواہرات کے خزانے چھپے ہوئے ہیں۔ ان کو جس خوبی سے خلیفہ صاحب نے اپنی کتاب میں پیش کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ ''تشبیہات رومی'' بھی اسی سلسلہ کی آخری کڑی تھی۔ جس میں انہوں نے رومی کے بنیادی تصورات کو تشبیہات کی روشنی میں بڑی خوبی سے واضح کیا۔ اقبال نے جاوید نامہ میں مسلمانوں کی نئی نسل کے لیے رومی کی اہمیت پر بڑا زور دیا تھا۔ ان کا مشورہ تھا کہ:

پیر رومی را رفیق راہ ساز
تا خدا بخشد ترا سوز و گداز
زانکہ رومی مغز را داند ز پوست
پائے او محکم فقد در کوئے دوست

خلیفہ عبدالحکیم کی ان کتابوں نے ہمارے لئے اس مردِ خبیر کی صحبت تک پہنچنا ممکن بنا دیا۔

خلیفہ صاحب سر سید کے کارناموں کے بڑے مداح تھے۔ وہ اکثر اپنی گفتگو میں سر سید کا ذکر بڑی عزت سے کیا کرتے۔ ان کا خیال تھا کہ اس شخص کی ہمہ جہت شخصیت کی صحیح عظمت کا اعتراف ابھی تک نہیں کیا گیا۔ سر سید نے مسلمانوں کی تاریخ کے ایک نازک دور میں ان کی رہنمائی کی اور متضاد تصورات اور دوائر عمل کی الجھن سے انہیں نجات دلوائی۔ اس نے اپنی بصیرت سے مسلمانوں کے لیے ایک ایسا واضح اور روشن راستہ متعین کیا کہ جس پر چل

ابھی اسی وقت سو روپیہ تار کے ذریعے منی آرڈر فلاں پتے پر بھیج دیا جائے۔ یہ درحقیقت اسی پوسٹ کارڈ بھیجنے والے کے سوال کا جواب تھا۔ اسی طرح کے بے شمار واقعات ہیں کہ جب کسی ضرورت مند نے آپ سے مدد کی درخواست کی آپ نے بلاکم وکاست اس کی توقع سے بڑھ کر اس کی مدد کی۔ اس معاملے میں وہ کسی دنیاوی احتیاط کے قائل نہ تھے۔ ادھار مانگنے والے اکثر آیا کرتے۔ انہوں نے کم ہی کسی کو انکار کیا ہوگا اور اس معاملے میں اکثر نقصان بھی اُٹھایا لیکن ان کا فلسفہ زندگی کچھ ایسا تھا جس میں روپے کی قدر و قیمت زیادہ نہ تھی۔ کہا کرتے تھے کہ انسان محض ایک Channel (وسیلہ) ہے، روپیہ ایک طرف سے آتا ہے اور دوسری طرف چلا جاتا ہے۔ بدقسمتی تو یہ ہے کہ بعض لوگ چاہتے ہیں کہ وہ ایک وسیع اور عریض Channel بن جائیں اگرچہ اس سے حقیقت بدل نہیں جاتی۔

اپنے ملنے والے لوگوں سے ہمیشہ ان کا سلوک انتہائی بلند ہوتا۔ انہیں اپنے بعض ملازمین سے نقصان پہنچا تو لوگوں نے کہا کہ آپ لوگوں کے انتخاب میں غلطی کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ بھئی مجھے انسان کی بنیادی نیکی پر پورا ایمان ہے۔ میں لوگوں سے اس عقیدے کی بنیاد پر معاملہ کرتا ہوں کہ وہ نیک فطرت اور دیانتدار ہیں۔ اس سے اگر کبھی نقصان ہو جاتا ہے تو بھی میں انسان سے متعلق اپنے بنیادی عقیدے سے منحرف نہیں ہوسکتا۔ میری نگاہ میں صرف یہی طریقہ کار ہے جو ایک نارمل انسان کو اختیار کرنا چاہئے۔ ان کی زندگی اس بلند اصول کی ایک بہترین مثال تھی۔ انہوں نے اپنی ساری زندگی ایک بلند مقصد کے لیے وقف کر رکھی تھی اور کبھی فروتر مقاصد انہیں اس مقصد عظیم سے منحرف نہ کر سکے۔ عمر کی آخری منزل تک انہوں نے جس جوش اور ولولے سے اس خدمت کو انجام دیا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ خدا ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

کر وہ اپنا دلی مقصد اور اپنی قومی خودی کو پا سکیں۔ اس برعظیم کی سیاسی زندگی میں مسلمانوں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں اور مایوسیوں سے دوچار ہوتے رہے لیکن جونہی قائداعظم کی سرکردگی میں وہ پھر اسی شاہراہ پر واپس ہوئے جس کی نشاندہی سرسید نے کی تھی تو انہیں بے مثال کامیابی حاصل ہوئی اور اس عظیم الشان شخص کی دانائی اور بصیرت کا بھرپور احساس ہوا۔

ایک دن سرسید کا ذکر ہو رہا تھا۔ ان کے مختلف کارناموں پر تبصرہ ہوتا رہا۔ بیان کرنے لگے کہ جب سرسید نے ولیم میور کی معاندانہ کتاب پڑھی تو آگ لگ گئی اور اسی وقت محسن الملک کو خط لکھا کہ جس طرح بھی ہو کچھ رقم جمع کر کے بھیجیں تاکہ اس کتاب کا مناسب جواب لکھا جا سکے اور اس کا انگلستان میں طبع کرانے کا انتظام ہو سکے۔ اس خط میں سرسید نے بڑے والہانہ انداز میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا تھا۔ جب خلیفہ صاحب صاحب اس جگہ پہنچے تو ایک دم رک گئے اور آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ خلیفہ صاحب کو آنحضرت ﷺ کی ذات سے جو گہری عقیدت تھی اس ایک واقعہ کے علاوہ ان کا کئی بار اظہار ہوتا رہا، تحریروں میں بھی اور گفتگو میں بھی۔

بے پناہ علم وفضیلت کے باوجود خلیفہ صاحب کی زندگی میں سادگی، عجز وانکسار اور انسانی ہمدردی کا جذبہ بہت نمایاں تھا۔ ایک دفعہ دفتر کے کچھ ملازم آپس میں کسی بات پر جھگڑ رہے تھے۔ اچانک خلیفہ صاحب آ گئے۔ ایک نے دوسرے کو کہا کہ میں خلیفہ صاحب سے اس کا ذکر کرتا ہوں۔ دوسرے نے بے پرواہی اور غصے میں کہہ دیا مجھے کیا پرواہ ہے۔ خلیفہ صاحب کو کسی بات کا علم نہ تھا۔ کچھ دیر بعد نوکر نے آ کر کہا کہ فلاں شخص نے آپ کے متعلق گستاخی کی ہے۔ فرمانے لگے کہ میں کیا اور میری بساط کیا! بلھے شاہ کا ایک پنجابی مصرع پڑھا کہ:

بُلھیا تو جیویں ککھ مسیتے

یعنی اے بھلے شاہ، تیری حیثیت تو ویسی ہے جیسے کہ چٹائی کا ایک تنکا جو مسجد میں بے شمار انسانوں کے پاؤں تلے روندا جاتا ہے۔ یہ کہہ کر تمام جھگڑا ختم کر ڈالا۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ ان کے دل میں اتنا بے پناہ تھا کہ انہوں نے کبھی کسی سائل کو نہ نہیں کہا۔ ایک دن دفتر میں آ کر بیٹھے تو ایک پوسٹ کارڈ جو ابھی ڈاک سے آیا تھا پڑھنا شروع کیا۔ پڑھتے ہی پھینک دیا اور دوسرے کام میں لگ گئے۔ کچھ دیر کے بعد گھنٹی بجائی۔ نوکر کو بلایا اور اسے حکم دیا کہ

مذہب کہلایا اور زرتشتیت، زرتشت کا دین ٹھہرا۔ مگر آں حضرت ﷺ نے اس کو روا نہیں رکھا کہ جس دین کی آپ نے تبلیغ فرمائی وہ آپ کے بعد آپ کے اسم گرامی سے موسوم ہو۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یہ صرف میرا ہی نہیں سب کا دین ہے۔ یہی دین عیسیٰ کا تھا اور یہی دین موسیٰ کا اور لاتعداد پیغمبروں کا جو مختلف قوموں میں مبعوث ہوئے۔ حضرت آدم سے اب تک جتنے سچے مذہبی معلم آئے وہ اسی دین کے ماننے والے تھے جس کے لیے عربی میں لفظ اسلام ہے۔ اسلام کے معنی امن اور خود کو مشیت الٰہی کے سپرد کر دینے کے ہیں۔

خلیفہ صاحب کا نظریہ ہے کہ امن و سپردگی کی زندگی کے لیے ''یہ ضروری ہے کہ پہلے ہم اپنے وجود میں ہم آہنگی پیدا کریں۔ انسان متعدد جذبات و عواطف سے سرفراز کیا گیا ہے۔ یہی اس کی زندگی کی تعمیری اور حرکی قوتیں ہیں۔ یہ بالذات شر نہیں کیونکہ ایک رحمت و شفقت والی ذات شر کو پیدا نہیں کرتی ...... اور نہ انسان کی تخلیق کسی ایسی فطری معصیت پر ہوئی ہے جو اس کو اپنے مورث اعلیٰ آدم سے ملی ہو ...... ہر قسم کا شر عقل کے مقرر کردہ حدود سے متجاوز ہونے سے پیدا ہوتا ہے کیونکہ عقل ایک امتیازی ملکہ ہے جو انسان کو اپنی جبلتوں کو تابع بنانے کے لیے عطا کیا گیا ہے۔ انسان میں عقل ایک مظہر ربانی ہے اور اس کی اطاعت گویا خدا کی اطاعت ہے۔ چنانچہ اندرونی سکون حاصل کرنے کی ایک ہی راہ ہے یعنی فرمانبرداری کا کوئی عمل۔'' [۱۰] یہ فرمانبرداری اپنی ابتدائی شکل میں عقل کی ہو سکتی ہے اور انتہائی ترقی یافتہ صورت میں خدا کی۔ ''جو چیز بھی مائل بہ آویزش ہو گی وہ عدو اللہ قرار پائے گی۔ جب تک کوئی اپنے ارادہ کو مشیت کلی کے سپرد نہ کر دے وہ خود اپنی ذات سے یا دوسروں سے یا اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔'' [۱۱]

رسول اکرم ﷺ نے اسلام کو ایک ایسی صداقت قرار نہیں دیا جس سے دنیا آپ سے پہلے لاعلم ہو اور نہ قرآن شریف نے یہ دعویٰ کیا۔ قرآن پاک اسلام کو ایک ایسا سچا مذہب قرار دیتا ہے جو اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ نوع انسان۔ کیونکہ یہی وہ صداقت ہے جس کا نزول حضرت آدم پر ہوا اور حضرت آدم کو بعض آیتوں میں کل بنی نوع انسان کے عین کہا گیا ہے۔ قرآن میں اسلام ایک عالمگیر مذہب کے طور پر پیش کیا گیا ہے...... ایک ایسے عالمگیر مذہب کے طور پر جس کا ایک لازمی اصول وحدت ادیان ہو۔ ''وحدت ادیان کے تحت وہی مذاہب آ سکتے ہیں جو خدا کی وحدانیت کے قائل ہوں۔'' [۱۲]

''کیونکہ اسلام صرف ایسے مذاہب کی سچائی کو تسلیم کرتا ہے جو توحیدی ہوں۔ دیگر تمام اس کے نزدیک وحشت و جہالت کی یادگار ہیں...... قرآن کہتا ہے کہ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے...... جہاں کہیں سچا دین ہوگا وہاں نجات کی اجارہ داری نہ ہوگی۔ قرآن کہتا ہے کہ نہ ابراہیم یہودی تھے اور نہ نصرانی تھے، ان کا مذہب وہی ازلی وابدی اسلام تھا۔ قرآن سچائی اور نجات کی اجارہ داری کے تمام تصورات کی بالکلیہ تردید کرتا ہے۔ نجات اور امن یہاں اور وہاں کی زندگی میں صرف اس کے لیے ہے جو خود کو خالق کائنات کے سپرد کردے اور نیک اعمال کرے۔'' [۱۳] **ان الذین آمنوا والذین ھادوا والنصریٰ والصابئین، من آمن باللہ والیوم الاخر و عمل صالحاً فلھم اجرھم عند ربھم ولا خوف علیھم ولا ھم یحزنون**۔ جو لوگ ایمان لائے (حضرت محمد ﷺ پر) اور وہ جو یہودی کہلاتے ہیں اور جو نصاریٰ یا صابی ہیں، جو بھی اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اس نے نیک عمل کیے تو وہ اپنے پروردگار سے اجر ضرور پائے گا اور ان کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ کوئی حزن و ملال۔ ایک خدا کی پرستش کی یہی اساس اسلام کو ایک عالمگیر مذہب بناتی ہے اور اسی کو اقبال نے روحانی جمہوریت کا نام دیا تھا۔ اسلام کا آخری نصب العین اسی روحانی جمہوریت کا قیام ہے۔'' [۱۴]

اسلام کا مطلب تمام حیات، تمام عالم کے ہمہ دان، ہمہ توان خالق اور رب پر ایمان ہے۔ اس کا حکم ہے کہ انسان اپنے ارادے کو قوانین فطرت اور وحی کے ذریعے ظاہر ہونے والے منشائے ربانی کا تابع بنائے۔ یہ اطاعت انفعالیت کی حالت نہیں ہے بلکہ ارادہ الٰہی میں ایک فعال اور بامقصد شرکت ہے۔ ارادہ الٰہی انسان کی فانی ہستی کو اس خیر اعلیٰ کے استعمال میں شرکت کے قابل بناتا ہے جو خدا کا منشا اور زندگی کا مقصد ہے۔ سچا مذہب اس محکم اور ناقابل تغیر اصل میں فانی کی طرف سے لافانی کی اطاعت کے علاوہ کچھ نہیں۔ جو کوئی بھی اس صداقت پر ایمان رکھتا ہے اور اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے وہ مسلمان ہے۔ اس نظریے سے جو دین بھی اختلاف رکھے گا وہ سچا مذہب نہیں ہوگا۔

انسان اس صداقت تک اپنے حسی تجربے یا منطقی استدلال کے ذریعے نہیں پہنچا بلکہ یہ صداقت خدا نے اپنے چند منتخب بندوں کو ایک نعمت کے طور پر مرحمت فرمائی۔ کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس میں خدا نے ایسے منتخب بندے پیدا نہ کیے ہوں جو انسان کو اس کے خالق

کی طرف واپس لانے کے لیے ایک عالمگیر اصول کی تبلیغ نہ کرتے ہوں۔ چنانچہ قرآن ہر ایک برگزیدہ اور منتخب قوم کے نظریے کی تردید کرتا ہے، جو صداقت اور نجات کی اجارہ دار ہو۔ روح اعلیٰ کی نعمتیں اتنی ہی عالمگیر ہیں جتنے کہ طبیعی فطرت کے فوائد۔ قرآن کے مطابق حضرت ابراہیمؑ، حضرت عیسیٰؑ سب مسلمان تھے کیونکہ رحمت اور عدل والے ایک خدا پر ایمان ان کی تعلیمات کا نچوڑ تھا۔ ان تمام عظیم پیغمبروں نے قوموں کو الٰہی صفات کو اپنانے اور اپنے انفرادی اور اجتماعی کردار کو ان کے مطابق بنانے کی تعلیم دی۔ قرآن میں جن پیغمبروں کا ذکر ہے وہ ان چند پیغمبروں میں سے ہیں جن سے اہل کتاب واقف ہیں ورنہ جن کا ذکر قرآن میں نہیں کیا گیا خود بقول قرآن ان کی تعداد بہت بڑی ہے کیونکہ نوع انسانی کی اس طویل تاریخ میں کوئی مدت ایسی نہیں گزری جس میں خدا کی طرف سے کوئی پیام بر نہ آیا ہو۔ یہی سبب ہے کہ عالمگیر مذہب یعنی صداقت مشترکہ کے اجزاء کم و بیش تمام اقوام میں ملیں گے۔ یہی اصلی اجزاء اسلام ہیں۔

مختلف قوموں نے اپنے روحانی قائدین کو خدا بنالیا ہے جو درحقیقت قبائلی انداز فکر ہے جس میں ہر قبیلے کا دیوتا مخصوص ہوتا تھا۔ قرآن شریف نے انسانوں کی اس کمزوری کی طرف توجہ دی ہے۔ اس کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کے برگزیدہ بندے یعنی انبیاء ایسے لوگ تھے جن کی سطح اپنی قوم کی عام سطح سے بہت بلند تھی مگر تھے وہ انسان ہی۔ ان عظیم افراد کی روحانی قوتوں نے ان کے پیروؤں کو گمراہ کر دیا چنانچہ وہ ان کو خدا سمجھ بیٹھے یا انہیں خدا کا اوتار بنا دیا۔ پیغمبر اسلام ﷺ کا سب سے بڑا کام یہ تھا کہ ان پیروؤں کو ان کی غلطی کا احساس دلائیں جو مبالغہ کی ہر حد کو توڑنے والی تکریم کی پیداوار تھی یا پھر ان کی اس خواہش کا اظہار تھی کہ اپنے رب کو گوشت پوست کے پیکر میں دیکھا جائے۔ قرآن شریف ان فوق الانسان ہستیوں کو خدا کا بندہ اور خادم قوم قرار دے کر اس امر کو واضح کرتا ہے کہ ایک مثالی انسان ہی انسانوں کے لیے نمونہ ہو سکتا ہے۔ اگر خود انسانوں کی رہنمائی کے لیے خداوند ذوالجلال والاکرام نزول فرماتا تو یہ منصب پورا نہ ہو سکتا تھا۔ ہر انسان اپنے دل میں یہی سوچتا کہ اتنے اچھے کام عاجز انسان نہیں کر سکتا صرف خدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اس سبب سے انسان کا رہنما انسان ہونا ضروری ہے۔

ایک ایسا انسان جو حق کو پانے سے پہلے اس کی تلاش میں سرگرداں رہ چکا ہو، جسے

زندگی کے اضدادات اور تنازعات کا خود تجربہ ہو چکا ہو اور جو مسلسل جدوجہد سے دنیا کے مصائب کا مقابلہ کر چکا ہو، جسے دروازہ کھولنے سے پہلے دستک دینی پڑی ہو، جو راستے کو پانے سے پہلے اس کی تلاش میں رہا ہو۔ وہی انسانوں کی قیادت کر سکتا ہے۔

اگر ایسا کوئی انسان ابتداء ہی سے بذات خود خدا رہا ہو تو اس کی زندگی ایک ایسے انسان کے لیے کیا مثال بن سکتی ہے جو رکاوٹوں اور دشواریوں پر قابو پانا چاہتا ہو؟ خدا کے لیے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔

قرآن اپنے قارئین کو بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہ کوئی نئی وحی نہیں ہے، یہ صرف ایک یاد داشت ہے۔ الہیاتی نقطہ نظر کے لوازم پیش کرتے ہوئے قرآن پاک اپنے قاری کو یاد دلاتا ہے کہ یہ ابراہیمؑ کا، موسیٰؑ کا، عیسیٰؑ کا اور ان سب پیغمبروں کا دین ہے جو محمد ﷺ سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اسی لئے صرف اسلام ہی میں وہ صلاحیت اور مثبت پہلو موجود ہیں جن پر سب انسان آکر متفق ہو سکتے ہیں۔

حوالہ جات:

[۱] خلیفہ عبدالحکیم، اسلام کا نظریہ حیات، ص ۱۲۱۔

[۲] ایضاً، ص ۱۳۴۔ [۳] ایضاً، ص ۱۳۵۔ [۴] ایضاً، ص ۱۵۰۔

[۵] Khalifa A. Hakim, "Is Universal Religion Possible?" (ایک غیر مطبوعہ مضمون)

[۶] ایضاً۔ [۷] ایضاً۔ [۸] ایضاً۔

[۹] اسلام کا نظریہ حیات، ص ۴۶۰۔

[۱۰] ایضاً، ص ۱۳۶-۱۳۷۔

[۱۱] ایضاً، ص ۳۔ [۱۲] ایضاً، ص ۴۔ [۱۳] ایضاً۔

[۱۴] Khalifa A. Hakim, "What is Islam?" (ایک غیر مطبوعہ مضمون)۔

Institute of Islamic Culture - An Introduction

The Institute of Islamic Culture was founded in 1950 with a view to presenting the ideology of Islam to the modern mind and bringing to Muslim youth a consciousness of their intellectual, cultural and spiritual heritage. Since the modern secular system of education started functioning in the Indo-Pakistan subcontinent and elsewhere in the Muslim world, it has brought about two notable consequences for Muslim youth. Firstly, a progressive decline in their self-consciousness as heirs to a great spiritual civilization with its own distinct intellectual and moral outlook, and secondly a growing scepticism and a questioning attitude towards the validity of religious truth. While a passive acceptance of prevalent beliefs, such as marked the era of our intellectual decline, has been naturally followed by a questioning spirit and is so far a welcome change introduced by the modern system of education. It also calls for proper guidance on the part of the intellectual leaders of Islam, because in the absence of healthy guidance the immature younger generation is likely to lose its way and stumble on subversive doctrines. It is one of the aims of the Institute of Islamic Culture to cater to the spirit of inquiry and questioning among the Muslim youth to make them fully conscious of their intellectual, cultural and moral heritage.

The modern scientific spirit does not accept ready made truths or proceed deductively from simple given propositions. It has brought a spirit of inductive inquiry. The result has been a clash with the religious mode of thought which takes certain propositions for granted and then proceeds deductively. To resolve this conflict between the scientific and the religious attitudes is another main objective of the Institute.

Again, the nature of human problems has changed completely since the birth of the present-day industrial civilization. People are not so much interested in the metaphysical foundation of religion or its doctrinal side now as in its attitude to social problems and the way to which it proposes to tackle them. It is one of the aims of the Institute of Islamic Culture to demonstrate that the Islamic outlook and the fundamental principles of Islam are still capable of giving a lead in the solution of human problems. Thus the Institute has taken upon itself the task of giving a progressive, rational view of Islam to explain its attitude to current problems, and to show how the political, social and economic life of Muslims can be remodeled in accordance with the basic principles and abiding values of Islam, without injury to material prosperity and technical efficiency.

With this object the Institute has published, in both the Urdu and English languages, a number of books, pamphlets and treatises written by distinguished scholars explaining the fundamental truths of Islam and their application to modern social, economic, political and intellectual problems. The Institute has also published books on the cultural and religious history of Muslims. It has further published a compendium of the Holy Prophet's (pbuh) traditions, selected from the vast Hadith literature in such a way as to give an idea of the broad, liberal and tolerant teachings of the Prophet. (pbuh) Besides, a few books have been published on the famous poets, mystics and thinkers of Islam like Rumi, Ghazali, Ibn Khaldun, Ibn Taimiyyah, [illegible] Abu Hanifah, Sayyid Ahmad Khan, A[illegible]a Shibli, Altaf Husain Hali, and Ma[illegible] Muhammad Ali Jauhar. The Institute includes within its sphere of work translations from Arabic and Persian classics and also modern Arabic and Persian literature on Islam in so far as they bear on our social and intellectual problems. The Institute also publishes a religious and literary monthly magazine in Urdu, Al-Ma'arif, in which contemporary problems are discussed from the Islamic viewpoint.

The Institute has no political or sectarian associations and eschews all controversies in these spheres. [illegible] the co-operation of all Muslim and [illegible] intellectuals who are interested in [illegible] desire to work for the intellectual [illegible] of Muslims from a broad non-sectarian viewpoint.